لَوحِ حیات

(خودنوشت سوانح عمری)

دیپک بُدکی

اسی کتاب سے

☆ میرے والد صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے مجھے بھیک مانگنا، قرض اٹھانا یا پھر چوری کرنا پڑے (Beg, Borrow or Steal)، میں کروں گا۔ انھیں تو ایسا کرنے کی نوبت نہیں آئی مگر ترپورا کے ایک دور دراز علاقے میں ایک ایسی مثال میرے سامنے آئی جس نے اپنے بیٹے کے ایڈمشن کے لیے سرکاری روپیہ عارضی طور پر غبن کیا۔ (ص ۲۷۳)

☆ اب جب بھی کبھی اپنی بدبختی پر سوچتا ہوں تو ان سب نوجوانوں پر ترس آتا ہے جن کے والدین لاعلمی، ناخواندگی، ناسمجھی یا پھر خود غرضی کے سبب اپنے بچوں کے پَر کترتے ہیں اور ان کو اپنے حساب سے اڑان بھرنے نہیں دیتے۔ (ص ۱۴۷)

☆ کاچرو صاحب نے کوئی منفی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا بلکہ ایک مثبت جواب بھیج دیا۔ لکھا تھا کہ ایک استاد ایسے سمندر کی طرح ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے دریا پناہ لیتے ہیں، کوئی متلاطم اور کوئی شانت، کوئی ہنگامہ خیز اور کوئی پُرسکون، کوئی گرج دار اور کوئی خاموش، کوئی جھاگ دار اور کوئی اطمینان بخش! ایک اچھا استاد سب کو گلے لگاتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر کسی کی زندگی کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔ مجھے تم سے کوئی ذاتی پَرخاش نہیں تھی البتہ چاہتا تھا کہ تم اچھے طالب علم بنو اور زندگی میں سرخ رو ہو جاؤ۔ کاچرو صاحب کا خط پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں اور دل کی ساری کدورت ہوا ہو گئی۔ (ص ۱۰۲)

☆ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس چھوٹے سے صحن کو صحنِ چمن میں تبدیل کر لوں۔ کچھ مزدور لگا کر زمین سے پتھر اور کنکر نکلوائے اور پھر کچھ درخت و موسمی پیڑ لگا دیے۔ پتاجی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ زمین بنجر ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں اُگ سکتا مگر میں نے ان کے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا۔ ایک دو برس ہی میں یہ قطعہ زمین ہرا بھرا ہو گیا اور اس میں مختلف اقسام کے پھول کھلنے لگے۔ ایک روز میں اپنی کھڑکی سے اس پھلواڑی کو نہار رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس بنجر زمین میں ہریالی ہو سکتی ہے تو میرا ذہن کمپیٹیشن امتحانات کے لیے تیار کیوں نہیں ہو سکتا؟ (ص ۱۶۰)

☆ (شام لال صراف): ”بیٹے، میرے سامنے ایسی بات آج کی سو معاف کرتا ہوں، دوبارہ کبھی نہ کرنا۔ تمھیں کیا معلوم کہ کشمیری مسلمان کے لیے ہندوستان صرف اوڑی سے لے کر قاضی گنڈ تک محدود ہے جبکہ تمھارے لیے ہندوستان کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر کشمیری مسلمانوں کو ہم اس محدود بوتل میں بند کر لیں تو ایک وقت آئے گا کہ وہ یہی بوتل ہمارے سر پر پھوڑ دیں گے۔ سمجھے!“ (ص ۸۰)

☆ ایک دفعہ لکھنؤ میں ان (شمس الرحمن فاروقی) کی رہائش پر یوں ہی حاضری دی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ کی یہ جدید شاعری میرے پلے نہیں پڑتی، سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کے شعرا کیا لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ ”پیچھے الماری سے کوئی بھی شاعری کی کتاب نکالو“۔ مجھے جو کتاب سامنے نظر آئی، اٹھا لی۔ کہنے لگے۔ ”اس میں سے کوئی سی نظم پڑھ لو۔“ جب نظم پڑھ لی، پھر کہنے لگے ”کچھ محسوس ہوا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔“ میں نے کہا ”ہاں، یہ تو سمجھ میں آیا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔“ انھوں نے کہا۔ ”تو پھر کیا سمجھ میں نہیں آتا ہے؟ شاعری سمجھنے کی چیز نہیں ہے بس محسوس کرنے کی چیز ہے۔“ (ص ۲۳۹)

برادرم جناب سلیم سالک صاحب
کی خدمت میں ہدیۂ خلوص

دیپک بدکی
10.01.19

دیپک بُدکی

لوحِ حیات

(خودنوشت سوانح عمری)

مصنف کی تصانیف

☆افسانے اور افسانچے:

۱۔ ادھورے چہرے (اردو [تیسرا ایڈیشن] ۲۰۱۴ء؛ ہندی ۲۰۰۵ء)

۲۔ چنار کے پنجے (اردو [دوسرا ایڈیشن] ۲۰۱۴ء؛ ہندی ۲۰۱۰ء)

۳۔ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (اردو [دوسرا ایڈیشن] ۲۰۱۸ء)

۴۔ ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۰ء)

۵۔ روح کا کرب (۲۰۱۵ء)

۶۔ اب میں وہاں نہیں رہتا (۲۰۱۷ء)

۷۔ مُٹھی بھر ریت (افسانچوں کا مجموعہ) (۲۰۱۵ء)

☆ تنقیدی مضامین و تبصرے

۶۔ عصری تحریریں (۲۰۰۶ء)

۷۔ عصری شعور (۲۰۰۹ء)

۸۔ عصری تقاضے (۲۰۱۳ء)

۹۔ عصری تناظر (۲۰۱۸ء)

۱۰۔ عصری نقوش (زیرِطبع)

۱۱۔ ادبی مباحث (زیرِطبع)

☆تحقیق

۱۰۔ اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار (۲۰۱۷ء)

مصنف پر لکھی گئی کتابیں

۱۔ دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری
(جاوید اقبال شاہ)

۲۔ ورق ورق آئینہ۔
(پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی
دیپک بدکی: شخصیت اور فن
اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری)

ملنے کا پتہ: (۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل سٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶
(۲) میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس بٹہ مالو، سرینگر کشمیر-۹

لوحِ حیات (خودنوشت سوانح عمری)

لَوحِ حیات

(خود نوشت سوانح عمری)

دیپک بُدکی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

©جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

(اس کتاب کو یا اس کتاب کے کسی بہی حصے کو مصنف کی اجازت کے بغیر، ماسوائے تحقیقی و تنقیدی کاموں کے لیے شائع کرنا قانوناً جرم ھے - خلاف ورزی کرنے والوں پر قانونی کارروائی کی جائے گی -)

Lauhe Hayat
(Autobiography)
Author: **Deepak Budki**
Year of Edition 2018
ISBN 978-93-88356-99-2
₹ Inland Rs 400/- Foreign $ 10/-

نام کتاب: : لوحِ حیات (خودنوشت سوانح عمری)
مصنف : : دیپک بدکی
اشاعت: : پہلا ایڈیشن ۲۰۱۸ء
قیمت: : ۴۰۰ روپے — غیر ممالک: دس ڈالر
مطبع: : روشان پرنٹرس، دہلی-۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

زندگی کی تلخ و شیریں
یادوں کے نام

سپاس نامہ

میں ان مدیر حضرات کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے میری شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے اپنے رسالوں میں وقتاً فوقتاً گوشے وخصوصی شمارے شائع کیے۔ ان میں جناب افتخار امام صدیقی، مدیر ماہنامہ ‘شاعر’ ممبئی سرفہرست ہیں جنھوں نے بڑی محنت اور لگن سے ماہنامہ شاعر کے ستمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے کو میری شخصیت کا آئینہ بنا دیا۔ انھوں نے بصیرت افروز سوالنامہ تیار کر کے میرے جوابات حاصل کیے اور انھیں جوں کا توں چھاپ دیا جس کی وجہ سے انھیں کئی مشکلوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میرے فن پر مختلف مشاہیر کے تاثرات شائع کرنے کے علاوہ انھوں نے میرے دو بہترین افسانے اس گوشے میں شائع کیے۔ اس گوشے پر ادیبوں اور قارئین کا ریسپانس بہت ہی حوصلہ افزا رہا۔

اس کے بعد سہ ماہی ‘انتساب’ سرونج (مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی) اور سہ ماہی ‘اسباق’ پونے (مدیر نذیر فتح پوری) کے ضخیم گوشے بالترتیب ۲۰۰۶ء اور جولائی ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آ گئے۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے سہ ماہی انتساب عالمی کا ایک خصوصی شمارہ (دیپک بُدکی نمبر) بھی جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ یہ خصوصی شمارہ اور گوشے میرے فکر وفن پر بھرپور روشنی ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں میری افسانہ نگاری اور تبصرہ نگاری پر کئی قلمکاروں کے مضامین، مشاہیر کے تاثرات، چند افسانوں کے تجزیے اور کچھ چنندہ افسانے اور تنقیدی مضامین وتبصرے شامل ہیں۔

اِدھر جموں یونیورسٹی میں ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ نے ایم فل کے لیے ‘دیپک بدکی کی افسانہ نگاری’ کے عنوان سے مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں میزان پبلشرز سرینگر نے شائع کیا۔ اس کے بعد محمد امین نجار نے ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ‘دیپک بُدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار’ کے عنوان سے حیدرآباد یونیورسٹی کو اپنا مقالہ پیش کیا۔ حیدرآباد یونیورسٹی کے ایک اور ایم فِل کے طالب

علم، ریاض احمد نے 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری - روح کا کرب اور ریزہ ریزہ حیات کے حوالے سے' پر اپنا مقالہ قلمبند کیا۔ حال ہی میں شیخ صفیہ بانو اختر حسین نے ''دیپک بُدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ' پر اپنا مقالہ لکھ کر ایم ایس یونیورسٹی، بروڈہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ نیز پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) اور پروفیسر انور ظہیر انصاری نے 'ورق ورق آئینہ - دیپک بدکی: شخصیت اور فن' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر لی جس میں میرے فن پر اس وقت تک تحریر کیے گئے سبھی مضامین، مشاہیر کی آرا اور ادیبوں کے مکتوبات شامل ہیں۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے مجھے انتہائی خوشی اس لیے ہوئی کیونکہ میرے گھر میں نہ کوئی اردو پڑھتا ہے اور نہ لکھتا ہے، اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ یہ سرمایۂ حیات ضائع نہ ہو جائے۔

مذکورہ بالا مقالات اور کتابوں میں میری شخصیت اور فن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مگر یہ برف کے اس تودے کے مترادف ہے جس کا بیشتر حصہ آنکھوں سے چھپا رہتا ہے۔ اس لیے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اپنی حیات کے بارے میں وہ سب کچھ لکھوں جو ابھی تک دنیا سے مخفی ہے۔ ان مقالات کے بارے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ جن نگرانوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری حیات وفن پر یہ مقالے لکھوائے اور جن طالب علموں نے یہ مقالے قلم بند کیے ان سب کا تہ دل سے شکریہ کرنا میرا فرض بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام مدیران کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے گراں قدر رسالوں اور اخبارات میں میرے تحریر کیے ہوئے افسانے، تبصرے اور مضامین شائع کیے۔

زندگی میں بہت کم دوست بنائے۔ شبن کول، اشوک مصری، وجے واتل، نثار حسین، پریمی رومانی، انور ظہیر انصاری اور فرید پربتی (مرحوم)۔ ان سب کی دوستی پر مجھے ناز ہے البتہ دوستی میں تشکر کا اظہار کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

اس خودنوشت سوانح عمری کی تزئین وترتیب اور کمپوزنگ خاکسار نے خود ہی کر لی ہے البتہ پراپرائٹر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے تعاون کے بغیر اس کتاب کو اہتمام کے ساتھ منظر عام پر لانا ناممکن تھا۔ اس لیے ان کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض بنتا ہے۔

غازی آباد، ۲۸ رنومبر ۲۰۱۸

دیپک بدکی

شجرۂ نسب بُدکی خاندان

پنڈت چندرہ جو بُدکی

!

پنڈت حلمت جو بُدکی

!

! ! ! !

لکھمن جو بدکی   نراین داس بدکی   سندر داس بدکی   مانہ جو بدکی

(لاولد)   !   !   (لاولد)

!   !

! ! ! !

رام چند بدکی   دختر   مکند رام   واسدیو

!   (زوجہ پنڈت اوگرہ)   !   (غیر شادی شدہ)

! ! ! ! ! ! ! ! !

دختر تاراشوری دختر لبودھری نیلہ کنٹھ دختر مندودھری دختر دلاری جیالال چونی لال بنسی لال دختر راج دلاری

(عرف گنوتی) ! (عرف رادھا کرشن) (عرف پراناشوری) (عرف رانی)   ! ! ! !

زوجہ زوجہ ! زوجہ زوجہ ! ! ! زوجہ

شام لال شمبھوناتھ ! پران ناتھ بنسی لال ! ! ! مکھن لال

صراف کوٹھدار ! چودھری دلال ! ! ! چودھری

! ! ! ! ! !

سودیش زتشی ! ! اوتار کرشن روی ! دختر آشا مدان دختر منجو جسوجا

! ! ! !

! ! دختر کملیش دختر نیلم ترسل دختر مینا اجے بُدکی دختر نشا بٹ

! ! (پہلی شادی) کاچرو

! دختر ڈالی انل دلال دختر کرن زتشی !

! دختر کرن امبادار دختر ایلین کاچرو دختر ڈیزی راوت دختر شچل آنند سنجیو بدکی

گیان جی حالی دیپک کمار بُدکی ریتا دھر رینو بُدکی

(دوسری شادی)

فہرست

1. جستجو کیا ہے! 11
2. کشمیر- کچھ کھٹی میٹھی یادیں 21
3. مٹھی بھر لوگ 32
4. بچپن جو کہیں کھو گیا 48
5. میرے محسن، میرے رہنما 73
6. عہد جوانی رورو کاٹا! 86
7. سیاہی کی ایک بوند 106
8. جہد زیست 125
9. شادی، خانہ بربادی 168
10. نیا پیشہ، نئی چنوتیاں 176
11. فوج کے ساتھ چند سال 200
12. زندگی کا ایک تاریک باب 216
13. نیشنل ڈیفنس کالج کی چند یادیں 240
14. ڈاک جیون بیمہ- ایک یادگار دور 245
15. ذِکرخوباں کا 253
16. تدریسی تجربہ- ایک دیرینہ خواب 263

17. نارتھ ایسٹ - خستہ حال و زبوں زار 267
18. طوافِ لالہ زار 281
19. ادب - ایک نئی شروعات 288
20. جب گجرات دہک اٹھا 300
21. پُرتگالیوں کی آخری گڑھی 310
22. مراجعت ارضِ چمن سے 313
23. اوجِ سفرِ حیات 317
24. سفر ابھی جاری ہے 320

* * *

جستجو کیا ہے؟

کچھ اپنا غم کچھ غمِ جہاں ہے
یہاں سے آغازِ داستاں ہے

(آنند نرائن ملاؔ)

آدمی کا اثاثہ جل کر راکھ ہو جائے تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ بس کریدنی لے کر راکھ کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور بغیر کسی مقصد کے راکھ کو کریدتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کی یہ ایک بنیادی سچائی ہے کہ آخرش ہم اس راکھ کو کریدنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال میرا بھی ہے۔ زندگی جوں توں بسر ہو گئی۔ بڑے بڑے خواب سجا رکھے تھے لیکن اب آنکھ کھول کر جو دیکھتا ہوں راکھ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ میرے پاس کریدنی تو ہے نہیں البتہ قلم سے اس راکھ کو کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ ایک معمولی سی زندگی کو بے شمار اوراق پر بکھیرنا ریگستان میں قدموں کے نشان چھوڑنے کے مترادف ہے۔ ایک ادنیٰ سی زندگی میں جھانکنے کی کس کو پڑی ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرا سارا وجود قلم کی روشنائی کی صورت میں بہہ جانے کے لیے بے قرار ہے۔

زندگی چاہے کیسی بھی ہو اس میں اپنی ایک لے ہوتی ہے، ایک مخصوص ترنم ہوتا ہے اور ایک عجیب زیر و بم ہوتا ہے۔ پریم چند نے اپنی زندگی کے بارے میں دعویٰ کیا تھا کہ ان کی زندگی میں نہ تو کہیں اونچے ٹیلے ملیں گے اور نہ ہی کہیں کوئی کھائی مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی زندگی میں کئی اتار چڑھاو آئے جیسے سوتیلی ماں کے ساتھ نباہ کرنا پڑا، پہلی شادی زندگی کا ناسور بن گئی، پھر مالی مشکلات، نوکری کے بکھیڑے، ماحول کی پراگندگی، ملک پر فرنگیوں کا تسلط، پہلی تصنیف پر حکومت کا عتاب اور آخرش قنات ہاظمہ کا عارضہ۔ تحریک پیدا کرنے کے لیے ایک حساس ذہن میں کیا یہ سب محرکات کافی نہیں ہیں؟ سچ تو یہ

ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں اونچے ٹیلے اور گہری کھائیاں ملتی ہیں گو ظاہراً اس کی زندگی ایک چٹیل میدان کی مانند ہی کیوں نہ دکھائی دے۔ گاندھی جی نے اپنی سوانح حیات ’سچائی کے ساتھ میرے تجربات‘ (My Experiments with Truth) میں زندگی کے انہی نشیب و فراز کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح حادثات آتے گئے اور ان کی زندگی سنوارتے چلے گئے۔

ہر ایک رائٹر کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کردے اور قارئین پر یہ ظاہر کرے کہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح گناہ اور ثواب کا مرکب ہے۔ کملا داس نے اپنی سوانح حیات ’میری کہانی‘ (My Story) میں لکھا ہے کہ میرا تو من کرتا ہے کہ میں اپنے بدن کے ہر عضو کو کاٹ کر کینواس پر ٹانک دوں اور ان کا ایک کولاج بنادوں تا کہ ہر دیکھنے والا حقیقت سے روشناس ہو جائے۔ البتہ ’میری کہانی‘ لکھ کر اسے افسوس ناک مرحلے سے گزرنا پڑا کہ لوگ اس کی صاف گوئی کا غلط مطلب نکالنے لگے اور اس کو بُری نظر سے دیکھنے لگے۔ دراصل ہمارے مشرقی معاشرے کی بہت بڑی پرابلم یہ ہے کہ ہم ایسے انسان کو، جو ہماری نظروں میں معتبر ہو جاتا ہے، بقول عصمت چغتائی ’مہاتما‘ بنا دیتے ہیں اور پھر اس کے اردگرد ایک ایسا ہالہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ اس کے خلاف ہم کچھ سننا نہیں چاہتے اور اگر کوئی سچائی سامنے آ بھی جائے تو اس کے خلاف احتجاج کر کے اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال آل احمد سرور کے مضمون ’اقبال کے خطوط‘ (تنقید کیا ہے؟) میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ”پبلشرز پر یہ زور ڈالا جا رہا ہے کہ ایسے نامناسب خطوط نکال دیے جائیں تا کہ اقبال کی عظمت میں فرق نہ آئے۔ حالانکہ اقبال کی عظمت دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرنے سے بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں اور نہ جاوید کے لیے پنشن کی درخواست سے یہ خیال باطل ہو سکتا ہے۔ کہ اقبال ذاتی طور پر درویش صفت اور قناعت پسند آدمی تھے۔ اقبال کی ایک ایک سطر کو شائع کرنا چاہیے، یہ قوم کی میراث ہے، کسی کا مال تجارت نہیں۔“

میری زندگی میں بھی بہت سارے اتار چڑھاو آئے۔ کچھ کو میں نے زیر کیا اور کچھ ایک نے مجھے زیر کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر مجھے ہمیشہ زندگی میں سکون، ٹھہراو اور جمود سے جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی رہی۔ جو ہے اس سے میں خوش نہیں ہوتا اور جو نہیں ہے اس کی جستجو کرتا رہتا ہوں۔ میں نے اپنے ذاتی تجربات کو اکثر افسانوں میں پیش کیا ہے مگر جوں کا توں نہیں بلکہ ان کو افسانوی روپ دے کر

تا کہ ان میں حقیقت کا آبھاس تو ہو مگر میری ڈائری نہ بن جائیں۔ یہاں پر علی احمد جلیلی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

؎ کناروں سے مجھے اے ناخدا دور ہی رکھنا
وہاں لے کر چلو طوفاں جہاں سے اٹھنے والا ہے

شاید یہی رویہ میرے قلم کو تحریک بخشنے کا سبب رہا ہے۔ قلم تو خیر میں نے پہلی بار نہیں اٹھایا ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں مگر وہ تحریریں ماحول کی افراتفری میں گم ہو کر رہ گئیں۔ اس کے لیے میں اپنے ماحول کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ قصوروار میں خود ہی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی مستقل نصب العین مقرر نہیں کیا نہ ہی کسی مقصد پر فوکس کیا۔ اب تک زندگی کا سفر جتنا بھی طے ہو چکا ہے اس میں اگر کہیں کوئی کمی رہ گئی، وہ اسی غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے رہ گئی۔ میں جب بھی کسی میدان میں اترا جو محنت طلب اور صبر طلب تھا، دیر سویر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ آنے والے طوفان کی خبر پاتے ہی یا پھر اس کا اندازہ لگاتے ہی میں نے اپنی کشتی کا رخ بدل لیا اور جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا۔ اس بات کا احساس مجھے بہت آگے جا کر ہوا۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت بھی یہ کمزوری غالب آتی تھی۔ کتاب ہاتھ میں اٹھا لیتا، بڑے انہماک اور جذباتی انداز میں اس کا مطالعہ شروع کر دیتا اور تقریباً دو تہائی ختم کرتے ہی کچھ بے دلی سی عود کر آجاتی اور میں کتاب کو مکمل کرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیتا۔ اس بُری عادت کا احساس جب ہوا میں نے شعوری طور پر اس طرف توجہ دینا شروع کیا اور اس کے بعد ہر کتاب کو پورا پڑھ کر ہی دم لیتا تھا۔ اس کمزوری نے مجھے زندگی کے مختلف شعبوں میں ناکامی سے ہم کنار کیا۔ مصور بننے کا خواب، ڈاکٹر بننے کی آرزو، علم نباتات میں ڈاکٹریٹ کرنے کی امید اور پھر استاد بننے کی چاہت، سب کی سب خواہشیں وقت کے ساتھ ساتھ بجھ گئیں۔ تاہم نہ چاہتے ہوئے بھی افسر شاہی کا رُکن بن گیا جس کا میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں افسر شاہی کا ہم مشرب نہ بن سکا اور ہمیشہ جل بن مچھلی کی طرح چھٹپٹاتا رہا۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھے زندگی میں کامیابی نہیں ملی۔ کامیابی تو ملی مگر کامرانی نہیں۔ جس ڈگر پر میں گامزن ہوا وہاں عیش و آرام تھا، عزت تھی، ثروت تھی، مگر جاودانی نہیں تھی۔ نہ زندگی کی کسک تھی،

نہ کشمکش اور نہ ہی کوئی چیلنج۔ صحرا کا کبھی نہ ختم ہونے والا سفر لگ رہا تھا جہاں افق تا افق نہ کسی منزل کا سراغ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کہیں کوئی نخلستان دکھائی دے رہا تھا۔

وادیِ کشمیر میں پہلی بار ایک غریب متوسط خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس جنت بے نظیر میں جنم لینا میرے لیے فخر کی بات ہے۔ البتہ جنم ایسے موسم میں ہوا جب یہ وادی اپنے اوپر دوزخ کی سفید ردا اوڑھے رہتی ہے۔ برف گھٹنوں تک زمین کو ڈھک لیتی ہے، فریادیوں کی مانند قطار در قطار کھڑے، سرد آہیں بھرتے ہوئے بے برگ سفیدے آسمان کو تکتے رہتے ہیں، چارسو فضا میں تند و تیز ہوائیں خوف و ہراس پھیلاتی ہیں اور غریب کشمیری اپنے گھروں کے اندر لاحول پڑھتے ہیں۔

ہمارے سکول میں تاریخ کے استاد کہا کرتے تھے کہ کشمیر کے دو حصے ہیں۔ ایک نہرو کا کشمیر اور دوسرا عام رعایا کا کشمیر۔ نہرو کا کشمیر ائیر پورٹ سے لے کر ڈل جھیل کے کنارے واقع نہرو گیسٹ ہاؤس تک محدود ہے جہاں کی ہوا خوشبودار، سڑکیں بلوریں، ماحول فرحت بخش، بجلی رات دن، آبِ چشمہ شاہی اور سامانِ دل بستگی ہمیشہ میسر رہتے ہیں۔ جہلم کے اُس پار دور دور تک پھیلی ہوئی عام لوگوں کی حبس زدہ، بدبودار، کثیف اور متعفن بستیاں ہیں جہاں بوسیدہ عمارتیں ہیں، ٹپکتے چھت ہیں، اوبڑ کھابڑ سڑکیں ہیں، تنگ و تاریک گلی کوچے ہیں، پانی، بجلی اور زندگی کی دیگر بنیادی ضرورتیں نایاب ہیں، موسم سرما میں اشیائے خوردنی غائب ہو جاتی ہیں اور ایندھن کے لیے لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ میں جہلم کے اُس پار کا باشندہ ہوں۔ میرے کشمیر میں موسم سرما میں ہفتوں بجلی کا نام و نشان بھی نہ ملتا تھا، اگر اتفاقاً بجلی آ بھی جاتی وولٹیج اتنی کمزور ہوتی کہ پڑھائی کرنے کے لیے ساتھ میں مٹی کے تیل کا لالٹین یا گلوب لیمپ روشن کرنا پڑتا تھا۔ دسمبر اور جنوری کی جان لیوا سردی میں میری بہنیں اور میں ٹین کے کنستر ہاتھ میں لیے دور دور سے پانی بھر لاتے کیونکہ پانی کی سپلائی اندرون شہر میں بند ہو جاتی۔ بقول ارمان اکبر آبادی:

؎ مرتب کیجیے تاریخ مجھ سے
میں اپنے دور کا اک آئینہ ہوں

میرا جنم ۱۵ر فروری ۱۹۵۰ کو سرینگر کے پائیں علاقے وازہ پورہ، کرالہ ٹینگ، مہاراج گنج میں ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں ہوا تھا۔ ولادت گھر ہی میں ہوئی تھی۔ محلہ وازہ پورہ فن طباخی اور سیاست

کے سبب مشہور بھی ہے اور بدنام بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کی ہمارے اسلاف اپنا پتا وازہ پورہ کے بدلے کرالہ ٹینگ لکھنا پسند کرتے تھے۔ بکرمی کلینڈر کے مطابق میں ماگھ مہینے کی ‘بھیم سین دشمی’ کو پیدا ہوا تھا جس کو کشمیری میں ‘بُم سَن داہم’ کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ اس دن کینچوے نے ‘چلۂ کلاں’ کی شدید سردی کی تاب نہ لا کر ایک ایسی چنگاری پیدا کی جسے ساری فضا میں آگ پھیل گئی اور موسم خوشگوار ہونے لگا۔ شاید یہی چنگاری میرے وجود کا حصہ بن کر رہ گئی ہے جس کے باعث میں ہمیشہ طرز کہن کے خلاف انگاروں کو ہوا دیتا رہا۔ کبھی کبھی یہ چنگاری مجھے اپنے وجود کا احساس بھی کراتی ہے۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟ یہ سب سوالات بنی نوع انسان کو سالہا سال سے کچوکتے رہے ہیں۔ انھی سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے گوتم بُدھ نے راج محل چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لی۔ حضرت عیسیٰ نے اپنے لہو سے صلیب تر کر لی۔ سقراط نے اپنے ہونٹوں سے جام شہادت لگایا۔ وویکانند نے الحاد چھوڑ کر رام کرشن پرم ہنس کے آشرم میں پناہ لی۔ کس کو کیا حاصل ہوا کوئی نہیں کہہ سکتا.....! البتہ ان سوالوں کے جوابات تلاشنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ وقف کر لیا۔ ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالی اور نتیجے میں ایک نیا نسخہ پیش کیا۔ پیغمبر آتے رہے مگر لوگ ان کے پیغامات سے بے فکر ہو کر ہمیشہ اپنی دھن میں چلتے رہے۔ ان کے شب و روز پیٹ پالنے، روزی کمانے، شادی رچانے، بچے پیدا کرنے، کھیلنے کودنے، رنگ رلیاں منانے اور بالآخر قبرستان بسانے میں صرف ہوتے رہے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ معلوم ہے کیوں؟ کیونکہ یہ راستے غیر فطری تھے۔ جن لوگوں نے حق کو پانے کا دعوی کیا انھوں نے کوئی بھی ایسا ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا جس سے معقول آدمی کسی شک وشبہ کے بغیر ایشور کی ذات پر یقین کرتا۔ پیغامبروں نے کرامات اور معجزے دکھا کر سادہ لوح انسان کو مسحور کیا اور اپنی حصولیابیوں کی تواتر سے تشہیر کی۔ انھوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اشرف المخلوقات ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو۔ لیکن زیرک انسان سوال پر سوال اٹھاتے رہے کیونکہ ان کے پاس سوچنے کے لیے دماغ تھا۔ تاہم اکثر وبیشتر لوگ ان بکھیڑوں میں نہیں پڑتے، وہ ہوا کا رخ دیکھ کر بغیر کسی تشکیک کے کسی بھی گروہ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو ان کو انفرادی اور اجتماعی تحفظ مہیا کر سکتا ہے۔ انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کس مقصد سے جا رہے ہیں۔ شاید موت کا ڈر یا بیماری کا خوف انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا

ہے اس لیے وہ کسی نہ کسی ریوڑ کی بھیڑ بننے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ابراہیم کووُر نے اپنی کتاب 'سپرٹس، ڈیمنز اینڈ گوڈ مین' میں اعتقادی نظام کی جو قلعی کھول دی ہے اسے میں خاصہ متاثر ہو چکا ہوں۔ میری نظر میں انسانی وجود محض ایک اتفاق ہے، ایک حادثہ ہے۔ مرد اور عورت کی مہینوں کی ہم بستری اور پھر ایک بیضہ خلیے کی کھوج میں نکلے کروڑوں منوی خلیوں کا آپسی ٹکراو، کب کون کس میں جذب ہو جائے گا کسے معلوم؟ یہ محض اتفاق ہے جو حقیقت کو جنم دیتا ہے۔ پھر ایسے اتفاقیہ وجود کے ساتھ اتنے سارے فلسفے منسلک کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ہزاروں سالوں سے چلے آرہے اس بحث کا محور یہی لایعنی وجود ہے۔ کتنے سارے ممکنات اس اتفاق کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ خلیوں کے اس انضمام کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بچہ ذہین، فاتر العقل، اندھا، لنگڑا، لولا، گورا، کالا، صحت مند یا مریض ہو سکتا ہے۔ کوئی پیدائش کے وقت مر جاتا ہے، کوئی چند سال جی کر دم توڑ دیتا ہے۔ کوئی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ کوئی شدید ضرب سے فالج زدہ ہو جاتا ہے اور کوئی ذہنی صدمے سے دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ غرض یہ کہ لاتعداد ممکنات اس ایک اتفاق کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں لایعنی وجود میں معنی ڈھونڈنے سے کیا حاصل؟

اس وقت میرا لاشعور مجھ سے سوال کر بیٹھا ہے۔ ’’اگر مجھے اس ہنگامۂ زندگی پر یقین نہیں ہے تو پھر میں یہ سوانح حیات کیوں لکھنے بیٹھا ہوں؟ بے ثبات زندگی کو ثبات بخشنے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں؟‘‘ لو میرا شعور کہیں سے جواب ڈھونڈ کر لایا ہے۔ ’’میں یہ روداد صرف اپنی دلجوئی اور بسر اوقات کے لیے رقم کر رہا ہوں۔ میں نہ روزنامچہ لکھنے کا عادی ہوں اور نہ ہی سوانح کے لیے نوٹس بناتا ہوں، بس یادداشتوں کے سہارے یہ کام انجام تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ایک حادثے کی پیداوار ہوں۔ میں اپنے والدین کی ہیجانی شہوت اور لمحاتی مسرت کا نتیجہ ہوں جس میں میری رضامندی کا کوئی دخل نہیں۔ دنیا میں کسی بھی فرد بشر سے پوچھیے کہ کیا وہ اس زندگی سے خوش ہے جو وہ جی رہا ہے، اکثر و بیشتر اپنی ناخوشی کا اظہار کریں گے۔ پھر ان سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ زندگی اگر اتنی بے مایہ ہے تو وہ کیوں بچوں کو ایسی زندگی جینے کے لیے اس دنیا میں لاتے ہیں؟ اکثر یہ بات قبول کرنے کو تیار نہ ہوں گے کہ انھیں اپنے بچوں کو دیکھ کر مستقبل محفوظ لگتا ہے۔ غرض یہ کہ ہم سب مستی کے چند لمحوں کی خاطر

ان ننھی منی جانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اس دکھوں بھری دنیا میں بلا سبب گھسیٹ کر لاتے ہیں اور اپنی اس بھول کو حق بجانب قرار دینے کے لیے ایشور کی مرضی جتلاتے ہیں۔ شاید آپ نے ذہین بچوں کو اپنے ماں باپ سے یہ پوچھتے ہوئے سنا ہوگا کہ ''اگر تم لوگوں کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ تم ہمیں زندگی کی بنیادی ضروریات مہیا کر سکو تو ہمیں اس دنیا میں لانے کا حق تمھیں کس نے دیا تھا؟'' یہ سوال اکثر حساس بچوں کے ذہنوں میں کسی نہ کسی مرحلے پر پیدا ہو جاتا ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر کیونکہ غریبوں کی پوری زندگی عسرت میں بسر ہوتی ہے اور امیروں کے لیے ہر نئی چیز کی آرزو انھیں آتش زیر پا رکھتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس جہنم میں لا کر بھی ہمارے والدین ہم سے اظہار تشکر کی امید رکھتے ہیں گویا کہ انھوں نے ہمیں اس دنیا میں لا کر ہم پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔

بات کو تھوڑا اور آگے بڑھائیں تو ایک اہم قیاسِ فرضیہ میرے ذہن میں ابھرتا ہے۔ فرض کرو کہ دنیا کے سبھی لوگ یہ فیصلہ کر لیں کہ کل سے افزائش نسل بند کر دی جائے تو یہ دنیا نیست و نابود ہوگی اور دنیا کے تمام ذی روح مصیبتوں سے نجات پائیں گے۔ جواب ہاں بھی ہو سکتا ہے اور ناں بھی۔ 'ہاں' اس لیے کہ اگر سچ مچ سب لوگ یہ فیصلہ کر لیں کہ اب کے بعد کوئی بچہ پیدا نہیں کرے گا تو اس دنیا کی آدم ذات کا صفایا ہوگا اور آدم خلد سے اپنی بے آبروئی کا بدلہ لے سکے گا۔ 'ناں' اس لیے کہ آدم ذات ایک ایسی ذات ہے جو کسی کے روکے نہیں رکتی۔ ہم میں سے کئی لوگ بہت سی باتیں صحیح سمجھ کر بھی ان پر عمل کرنے سے کتراتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کون سا پیغمبر ہے جس نے انسان کو سچ بولنے کی تاکید نہیں کی، پھر بھی سچ بولنے والا آپ کو خال خال ہی ملے گا۔ میں خود بھی ان لوگوں کی صف میں کھڑا ہوں جو جان کر بھی کسی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ میں نے کئی بار خواب میں خود کو گھڑی کی دونوں سوئیوں کے ساتھ لٹک کر وقت کو اگر دنیا کی خاطر نہیں کم سے کم اپنی خاطر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے محسوس کیا ہے۔

کشمیری پنڈتوں میں ہر خاندان کا ایک مخصوص موروثی نام ہوتا ہے جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ عام طور پر یہ نام گوتر سے تعلق رکھتا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بہت ساری تبدیلیاں آئیں۔ خاندانوں کو ان کے پیشے یا نِک نیم سے پہچانا جانے لگا۔ مثلاً بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا 'خوشو' کہلایا، بڈگام میں رہنے والا بڈگامی کہلایا، جیوتش جاننے والا 'جیوتشی' کہلایا، پٹواری کا کام کرنے والا

’پٹواری‘ کہلایا اور سونے کا کام کرنے والا ’صراف‘ کہلایا۔ جہاں تک میرے خاندانی نام کا تعلق ہے اس کے بارے میں بیٹس کے کشمیر گزٹ ۱۸۷۳ء میں کچھ سراغ ملتا ہے۔ یہ انفارمیشن مجھے ایک دوست ایس این پنڈتا نے مہیا کر لی جس کے لیے میں اس کا شکر گزار ہوں۔

"The coins in use in Kashmir are of Silver and Copper. Originally the rupee of the country was the Hari Singhia, of the value of 8 annas but soon after the accession of Gulab Singh he introduced the Chilki Rupee, valued at 10 annas as the current coin of the realm.

There is a third rupee , the Nanak Shahi, which is worth 16 annas , but it is now rarely met with as are also gold coins, of which that called the **BUDKI** is said to be worth 7 Hari Singhia rupees, and the Gold Mohur 20.

The copper coins are pice and they are of two kinds,the larger are equal in value to the British pice, but the smaller are only equal to about 2/3rds of that coin.

A great variety of copper coins is to be met within the Bazars." (1873, Bates' Kashmir Gazette pp 102)

اس سرنیم کے بارے میں روایت ہے کہ ہمارے کسی جدِّ امجد نے اپنے مکان کی از سر نو تعمیر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ نئی عمارت کی بنیاد رکھنے کے لیے زمین کھودی گئی۔ اس کارروائی کے دوران کسی نے ایک ہانڈی دیکھ لی جس میں بہت ساری ’بُد کیاں‘ رکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں بنک تو ہوتے نہیں تھے اس لیے چوروں سے بچنے کے لیے سونے کے سکّے (اشرفیاں) کسی برتن میں رکھ کر زمین میں مخصوص جگہ پر گاڑ دیے جاتے تھے جس کا علم صرف گاڑنے والے کو ہوتا تھا۔ لوگوں کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ ہمارے

مکان میں بدکیوں کا خزانہ ملا ہے تو وہ ہمارے اسلاف کو 'بدکی والے' کہنے لگے جو دھیرے دھیرے صرف 'بدکی' ہو کر رہ گیا۔ خیال رہے کہ بُدکی ۷ر ہری سنگھیا روپیوں کے برابر تھا جب کہ سونے کی اشرفی ۲۰ر روپیوں کے برابر تھی۔

میرے پتاجی کا نام آنجہانی رادھا کرشن بُدکی عرف نیلہ کنٹھ تھا اور ماں کا نام سورگیہ سوماوتی بُدکی عرف کملاوتی تھا۔ بچپن میں ماں کو کملاوتی نہرو کے نام سے جانتے تھے۔ نانا جی پنڈت نیلہ کنٹھ نہرو ہاری پربت کی ماتا شارکا دیوی کے بھگت تھے۔ گو وہ گورنری میں ملازم تھے لیکن انھوں نے ساری عمر ماتا کی بھگتی میں صرف کر دی۔ چکریشور، ہاری پربت کے انتظام میں ان کا اہم رول رہا اور کئی سال وہ انتظامیہ کے پریذیڈنٹ بھی رہے۔ نانی لیلاوتی کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے کیونکہ جب وہ تیسری منزل کی کھڑکی سے گر کر لقمۂ اجل ہو گئی تھیں، اس وقت میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ ان کے بطن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی، جو میری ماں تھی، پیدا ہوئے تھے۔ جیوتش کا گیان ہونے کی وجہ سے نانا جی نے اپنے دوسرے بیٹے جانکی ناتھ کو خود سے الگ کر دیا اور اپنے ایک قریبی لاولد دوست کو پالنے کے لیے دے دیا۔ وہی لڑکا بعد میں ممبئی جا کر فلموں میں ایکٹر جواہر کول کے نام سے مشہور ہو گیا اور وہاں پر ایک مراٹھی لڑکی کلارا سے شادی کر لی جس کے نام سے ورسووا ممبئی میں ایک سڑک بھی ہے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام شمبھو ناتھ تھا جو دہلی جا کر بس گئے اور وہاں سررشتۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ بے جوڑ شادی کی وجہ سے وہ جوان مرگ ہو گئے۔ تیسرے بیٹے کا نام مکھن لال تھا جو ممبئی اور دہلی میں پاپڑ بیل کر واپس کشمیر آنے پر مجبور ہو گئے اور محکمہ جنگلات میں عمر بھر ملازمت کرتے رہے۔ ان کی بیوی ہائی سکول میں استانی تھیں۔ میری ماں نے ابھی چالیس برس بھی پورے نہیں کیے تھے کہ ۱۹۶۲ء میں بھگوان کو پیاری ہو گئیں۔

پتاجی کے حسب نسب کے بارے میں مجھے جو جانکاری ملی ہے وہ یہ ہے۔ ان کا اصلی نام پنڈت نیلہ کنٹھ تھا اور ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے تھے مگر بعد میں انھوں نے پنڈت رادھا کرشن نام اختیار کیا تھا جو ان کے دفتری کاغذات میں درج تھا۔ ان کو میرے دادا کے ناکتخدا چچیرے بھائی پنڈت واسدیو نے گود لیا تھا۔ راشن کارڈ پر ان کے والد کا نام واسدیو ہی لکھا ہوا تھا۔ یہ ماننا کہ وہ لے پالک تھے صحیح نہیں ہوگا کیونکہ پنڈت واسدیو نے انھیں کبھی پالا ہی نہیں اور وہ اپنے بھائی پنڈت مکند رام کے ہمراہ جموں جا کر

استقامت پذیر ہو گئے تھے۔ دراصل وہ پنڈت رام چند اور رادھا مالی کے بیٹے تھے اور انھوں نے ہی پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ پتا جی کی چار بہنیں تھیں، تارا شوری عرف گنوتی صراف زوجہ شام لال صراف، مسز کوٹھدار زوجہ شمبھو ناتھ کوٹھدار، مندودھری عرف پرانا شوری چودھری زوجہ پران ناتھ چودھری اور دلاری عرف رانی دلال زوجہ بنسی لال دلال۔ ان میں سے مسز کوٹھدار اور پران ناتھ چودھری جوانی ہی میں سورگباش ہو گئے تھے۔ بنسی لال دلال لیبر ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ پنڈت شام لال صراف ابتدا میں کشمیری دستکاریوں (اخروٹ کی لکڑی کا سامان اور پیپر ماشی) کی تجارت کرتے تھے، پھر 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور ریذیڈنسی روڈ اور نمائش گاہ کی دونوں دکانیں اپنے سالے یعنی میرے پتا جی کے حوالے کر دیں۔ آزادی کے بعد وہ پندرہ سال تک ریاستی کابینہ میں وزیر رہے اور مزید پانچ برس لوک سبھا کے ممبر رہے۔ اس کے بعد آخری دم تک سماجی کاموں میں جٹے رہے۔ میرے پتا جی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے بہنوئی کی رہنمائی میں تجارت کا پیشہ اپنایا اور پھر ان ہی کی دی ہوئی دکانیں سنبھال لیں۔ ۱۹۶۱ء میں میری ماں کے لگاتار اصرار پر پتا جی نے کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں نوکری کر لی جہاں ان کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ خود میری ماں، جو اپنے شوہر کو بحیثیت افسر دیکھنے کی متمنی تھی، ان کے ملازم ہونے کے بعد صرف ایک سال زندہ رہی۔ آگے جا کر دونوں دکانیں بک گئیں اور ان میں رکھا ہوا سامان کوڑیوں کے دام فروخت ہو گیا۔ ایمپوریم سے ریٹائر ہونے کے بعد پتا جی نے لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے ایجنٹ کے طور پر آخری دم تک کام کیا۔ پتا جی ۷ر مئی ۱۹۸۶ کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

* * *

کشمیر۔ کچھ کھٹی میٹھی یادیں

؎ گر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است و ہمیں است

یہ شعر شالیمار باغ کی بالائی مہتابی پر کندہ ہے اور اس کے بارے میں عام خیال ہے کہ اسے امیر خسروؒ نے کہا ہے۔ انھوں نے یہ شعر اس کشمیر کے بارے میں کہا ہے جہاں میں نے جنم لیا ہے۔ البتہ کئی لوگ اسے شہنشاہ جہانگیر سے منسوب کرتے ہیں۔ افسوس کہ جغرافیائی لحاظ سے کلیدی مقام ہونے کے سبب یہ ریاست ہمیشہ ہی بنائے فساد رہی ہے۔ چنانچہ ریاستِ جموں وکشمیر کثیر النسل، کثیر التہذیب، کثیر المذہب اور کثیر الذبان ہے اس لیے لارڈ برڈوڈ نے اس کا موازنہ 'جغرافیائی عفریت' سے کیا ہے۔ کشمیر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں یہاں ہندو، بدھ، مسلم، سکھ اور ڈوگرہ حکمرانوں نے حکومت کی جن میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کی عظمتوں کو آج تک یاد کیا جاتا ہے مثلاً اشوکا، للتادتیہ، اونتی ورمن، زین العابدین، اکبر وغیرہ۔ اس کے برعکس کچھ ایسے بھی تھے جن کی حرص وہوس اور مذہبی جنونیت کی کہانیاں سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مثلاً مہر کولا، سکندر بت شکن اور جبار خان۔ بدقسمتی سے فطرت اور حکمران دونوں کشمیری رعایا کی نسبت ہمیشہ ایذا رساں اور جفا کیش رہے ہیں۔ ماضی میں عقوبت، بھاری ٹیکس، کم مزدوری اور گلگت وبونجی جیسے علاقوں میں بے گار کرنا کشمیریوں کا للاٹ بن چکا تھا۔

کشمیر میں اسلام تیغ وتلوار کے ساتھ ساتھ تبلیغ وترغیب سے پھیل گیا جس کے باعث مخلوط اور گنگا جمنی تہذیب نے نمو پائی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے 'ریش وار' (ریشیوں اور صوفیوں کی آماج گاہ) کہا جاتا ہے۔ یہاں صدہا سال سے مختلف مذہبوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے حالانکہ کئی حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے اس مخلوط کلچر کو شمشیر وسناں کے ذریعے تہس نہس کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال

تقسیم ہند نے اس ریاست کی تقدیر میں ایسے کانٹے بوئے جو اس کے وجود کو تب سے خوں چکاں کر رہے ہیں۔ بقول رزمیؔ مظفر نگری:

؎ یہ وقت بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

بیسویں صدی کی شروعات ہی سے ساری دنیا میں قومی جذبے نے سر اٹھالیا، اس لیے ہر حساس قوم آزادی کی کوشاں رہی۔ جموں وکشمیر کے عوام بھی اسی جذبے کے تحت ڈوگرہ حکومت کے خلاف کمربستہ ہوگئے اور ۱۹۳۱ء میں اس کی سمت کا تعین باضابطہ طور پر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔ بدقسمتی سے تقسیم ہند کے وقت جموں وکشمیر کے مہاراجہ نے مصلحتاً فیصلہ کرنے میں تاخیر کی اور بعد میں جب فیصلہ لیا اس وقت بہت دیر ہوچکی تھی۔ پاکستانی قبائلی ۲۲؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر کی وادی میں گھس کر بارہمولہ پر قابض ہوگئے اور پھر سرینگر کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔ پاکستانی فوج ان قبائیلیوں کی کھلے عام مدد کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں مہاراجہ ہری سنگھ کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ہندوستان سے فوراً الحاق کرے اور ہندوستانی فوج سے مدد مانگے۔ نتیجتاً ۲۶؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دستاویز الحاق پر دستخط ہوئے۔ دوسرے ہی روز ہندوستان کی فوج نے دنیا کی سب سے تیز لام بندی کا مظاہرہ کر کے اپنی فوجیں بذریعہ طیارہ سرینگر بھیج دیں اور برق رفتاری سے حالات پر قابو پالیا۔ پاکستانی فوج کو کھدیڑ تو دیا گیا مگر ابھی کشمیر کا ایک بہت بڑا حصہ (پاکستانی مقبوضہ کشمیر اور گلگت وبلتستان) ان کے پاس ہی تھا کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، چونکہ امن پسند رہنما تھے، اقوام متحدہ میں گوہار لگانے چلے گئے۔ وہاں پر پاکستان نے الحاق اور لشکرکشی پر سوال اٹھائے اور ان کی پشت پناہی مغربی ممالک نے کی کیونکہ بطور حکمت عملی انھیں جموں وکشمیر میں خاصی دلچسپی تھی تاکہ وہ کمیونسٹ بلاک کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روک سکیں۔ سرد جنگ کا زمانہ تھا، اس لیے سرمایہ دار بلاک کا مدعا یہ تھا کہ وہ اس علاقے سے سوویت یونین اور چین کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکیں۔ اُدھر پاکستان امریکی بلاک خاص کر 'ناٹو' کا رکن بن گیا اور اِدھر ہندوستان سوویت روس کے قریب آتا چلا گیا۔ جواہر لال نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کو نظر انداز کر کے شیخ محمد عبداللہ کو جموں وکشمیر کا سربراہ تسلیم کرلیا۔ دونوں کے بیچ کچھ غیر رسمی وعدے ہوئے اور

بعد میں شیخ عبداللہ کی سربراہی میں عوامی حکومت برسر اقتدار آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان کھٹاس پیدا ہوئی اور آپسی رشتے بگڑ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں سیاست نے ایسی کروٹ لی کہ کشمیر کا مسئلہ ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے جواہر لال نہرو کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور جموں و کشمیر میں رائے شماری کرانے کا مطالبہ کیا حالانکہ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ ریاست کا ایک بہت بڑا حصہ پاکستان کے قبضے میں ہے اور اس کے بغیر یہ کارروائی ناممکن ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کو قید کیا گیا اور عنان حکومت بخشی غلام محمد کو سونپ دی گئی۔ گذشتہ اے ر برس سے اقوام متحدہ نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یہ معاملہ تب سے یوں ہی سلگ رہا ہے۔

چنانچہ 'شیر' پارٹی کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ کے حریف میر واعظ مولوی یوسف شاہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر جا کر بس گئے، اس لیے ان کی جگہ میر واعظ مولوی محمد فاروق مسند نشین ہو گئے اور 'بکرا' پارٹی کے رہنما بن گئے۔ ان کی پشت پناہی بخشی غلام محمد کرتے رہے تاکہ کشمیری عوام میں شیخ محمد عبداللہ کے اثر و رسوخ کو کم کیا جا سکے۔ 'شیروں' اور 'بکروں' کا جھگڑا کشمیر کی تاریخ میں تلخ مخاصمت کا ایک خونیں باب ہے۔ دونوں رہنما ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے مکمل الحاق کے خلاف تھے۔ مولوی یوسف شاہ پاکستان کے ساتھ ادغام کے حق میں تھے جبکہ شیخ محمد عبداللہ کشمیر کو آزاد خود مختار ریاست کے طور پر دیکھنے کے تمنائی تھے اور خود سلطان بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

جس علاقے میں میرا گھر تھا وہاں 'بکروں' کی اکثریت تھی اور ہندوؤں کے صرف بیس گھر تھے۔ چونکہ بکرے پاکستان نواز تھے اس لیے میں بچپن ہی سے مسلمان بچوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں، سر پر سبز حریری کاغذ میں لپٹے گتے کی ٹوپیاں پہنے جن پر ہلال بنے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں بندوقوں کے بدلے ڈنڈے یا پھر پاکستانی جھنڈے تھامے، مارچ کرتے ہوئے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ بارہا مارچ کرنے والے اپنی توتلی آواز میں حب الوطنی کا گیت 'کریو منز جگرس جایہ چھم نو مایہ مشے نی' گاتے۔ پاس سے گزرنے والے بزرگ اور نوجوان یہ مناظر دیکھ کر من ہی من میں خوش ہو جاتے اور ان بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ سکول جاتے وقت مجھے اکثر دکانوں پر محمد علی جناح اور جنرل ایوب خان کی جہازی تصویریں دیواروں پر لٹکتی ہوئی نظر آتیں البتہ بکروں کا علاقہ ختم ہوتے ہی یہ منظر بدل جاتا اور ان کی بجائے

شیخ محمد عبداللہ اور علامہ اقبال کی بڑی بڑی تصویریں دکھائی دیتیں جن پر اکثر ہار لٹک رہے ہوتے۔ ہم ہندو لڑکوں کو یہ کچھ عجیب سا لگتا تھا مگر اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مہر بر لب سر نہوڑھائے چلے جاتے۔ مقبول بٹ اور امان اللہ خان کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا اور نہ ہی عام رعایا ان سے واقف تھی۔

۱۹۶۲ء میں ہندوستان کو چین کے ہاتھوں بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ چین کی فوجیں ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو چشول، لداخ کے 'رزانگ لا' اور شمال مشرق کے 'توانگ' علاقے میں گھس کر 'سے لا' اور 'بوم ڈی لا' کے درّے عبور کر کے تیج پور تک پہنچ گئیں۔ اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد ۲۰ر نومبر کو چین نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ بعد میں کچھ علاقے اپنے پاس رکھ کر چینیوں نے ہندوستان کے باقی ماندہ علاقے خالی کر دیے۔ لداخ میں اَکسائی چن کا علاقہ ابھی بھی چین کے قبضے میں ہے۔ شمال مشرق میں اُرناچل پردیش پر وہ اب بھی اپنا حق جتا رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء کی ہند چین جنگ سے یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان اس جنگ کے لیے بالکل تیار نہ تھا کیونکہ ہمارے رہنما دفاعی ضروریات کو نظر انداز کر کے پر امن بقائے باہمی اور پنچ شیل کی رٹ لگائے ہوئے تھے، نہ فوج کے پاس پہننے کو گرم کپڑے تھے، نہ لڑنے کے لیے اَسلحہ اور گولی بارود تھا اور نہ ہی پہاڑی علاقے میں لڑنے کی صحیح تربیت تھی۔ اس ضمن میں کئی کتابیں ان فوجی افسروں نے قلمبند کی ہیں جنھوں نے اس جنگ میں شرکت کی تھی جیسے جنرل بی ایم کول کی 'دی ان ٹولڈ سٹوری'، برگیڈیر جون دلوی کی کتاب 'ہمالین بلنڈر' اور لیفٹننٹ کرنل جے آر سائیگل کی کتاب 'دی اَن فاٹ وار آف ۱۹۶۲ء' وغیرہ۔ اتفاق سے جب میں ۱۹۷۹ء میں فوج میں ڈیپوٹیشن پر چلا گیا تو میری دوسری پوسٹنگ اسی علاقے میں ہوئی اور مجھے یہاں کی مشکل ترین ٹوپوگرافی سے آشنا ہونے کا موقع فراہم ہوا۔ ہندوستان پر چین کی اس جارحانہ کارروائی کا فائدہ اٹھا کر پاکستان نے چین کے ساتھ دوستی اور مضبوط کر لی یہاں تک کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے علاقے سے انھوں نے 'ٹرانس قراقرم ٹریکٹ' چین کو تحفتاً پیش کیا۔

نہرو کے دورِ حکومت میں رشوت خوری اور اقربا پروری کو بہت بڑھاوا مل گیا اور ہندوستان کی رعایا کو کانگریس پر سے بھروسہ اٹھنے لگا۔ ۱۹۶۲ء کے چینی حملے نے آگ پر تیل ڈالنے کا کام کیا۔ کانگریس کے بزرگ رہنما اور تمل ناڈو کے چیف منسٹر، کے کامراج، نے کانگریس کو دوبارہ بحال کرنے اور طاقتور بنانے کا منصوبہ بنایا جس کی رو سے تنظیم کو مضبوط کرنے کے لیے وہ خود بھی ۲ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مستعفی ہو گئے

اور کئی مرکزی وزیروں اور چیف منسٹروں کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اس منصوبے کو 'کامراج پلان' کا نام دیا گیا۔ اسی پلان کے تحت جموں و کشمیر کے چیف منسٹر (اس وقت اس کو پرائم منسٹر کہا جاتا تھا) بخشی غلام محمد کو حکومت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ہر طرف ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کا دبدبہ تھا اور اسی کے لیڈر خواجہ غلام محمد صادق کے چیف منسٹر بننے پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں مگر بخشی غلام محمد نے حکومت پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ایک آخری داؤ کھیلا اور اپنے ایک کٹھ پتلی ممبر، خواجہ شمس الدین، کو چیف منسٹر بنا لیا۔ شمس الدین کے دورِ حکومت میں ۲۷/دسمبر ۱۹۶۳ء کو حضرت بل درگاہ سے پیغمبر اسلام کا موئے مبارک چوری ہوا جس کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے سارے کشمیر میں آگ بھڑک اٹھی اور ہر طرف ماتم پسر گیا۔ سرینگر میں لوگ ہر روز سڑکوں پر اتر آتے اور احتجاج کرتے، حضرت بل کے باہر لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا، سردی کے سبب جگہ جگہ الاؤ جلائے جاتے، باہر سے آئے لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا جاتا اور موئے مقدس کی خاطر ہر طرف واویلا مچ گیا۔ اس سانحہ کی نزاکت کو سمجھ کر نہرو نے سی بی آئی کے بی این ملک کو سرینگر بھیج دیا۔ ۴/جنوری ۱۹۶۴ کو موئے مقدس ڈھونڈ لیا گیا جس کے بعد لال بہادر شاستری نے اس کو واپس اپنی جگہ پر رکھوا دیا۔ موئے مبارک کے اس سانحے کے ساتھ ہی شمس الدین کا ستارہ ڈوب گیا اور اس کی جگہ خواجہ غلام محمد صادق چیف منسٹر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ آزادی کے بعد جتنے بھی چیف منسٹر آئے، میری فہم کے مطابق ان میں سے بہترین، مخلص، قوم پرست اور فلاح و بہبود پسند چیف منسٹر غلام محمد صادق تھے۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان سے قریب تر لایا بلکہ شیخ محمد عبداللہ کو کھلا چھوڑ کر ان کی مقبولیت میں سیندھ لگا دی۔ بدقسمتی سے ان کے جانشین راہ سے بے راہ ہو گئے ادر انھوں نے ریاست کو طوائف الملوکی اور نراجیت کی طرف دھکیل دیا۔

یہاں پر پس آزادی جموں و کشمیر کے سیاسی تناظر پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی کشمیر میں جمہوریت کی بیخ کنی کی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ سے لے کر عہد حاضر تک سبھی چیف منسٹروں نے ریاست میں جمہوریت بحال کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شیخ عبداللہ کی سربراہی میں پہلی اسمبلی کے سبھی اراکین بغیر کسی مخالفت کے چناؤ میں کامیاب قرار دئے گئے اور پھر یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ عام رعایا ہمیشہ تماشائی بنے رہے اور خود کو الیکشن کا حصہ ماننے سے کتراتے رہے۔ اس کے بعد

جتنی بھی حکومتیں آئیں سب کی سب اوپر سے ٹھونسی گئیں۔ عوام کی بے تعلقی اور شرکت نہ کرنے سے انتظامیہ میں بہت ساری بدعنوانیاں پیدا ہوئیں جیسے رشوت خوری، کنبہ پروری، سیاسی لوٹ کھسوٹ اور غنڈہ گردی۔ بخشی غلام محمد کے زمانے میں تو یہ کارستانیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ بدعنوانیوں کا تو یہ حال تھا کہ امیدوار ہی سلیکشن بورڈ کا ممبر بھی تھا اور اس نے خود کو چیف کنزرویٹر منتخب کر لیا (Kraipak vs Union of India AIR 1970 SCA)۔ مرکزی حکومت نے بھی کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ ریاست میں جمہوریت بحال ہو جاتی۔ صرف مرارجی ڈیسائی کے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ الیکشن صاف ستھرے ہوئے اور لوگوں نے چناؤ میں بھرپور حصہ لیا یہاں تک کہ پاکستان نواز مولوی فاروق نے جنتا پارٹی کی داغ بیل ڈالی اور الیکشنوں میں بھی حصہ لیا۔ ایک الیکشن میں مجھے بطور ریلیونگ ایجنٹ کا کام سونپا گیا جب کہ میری عمر بارہ سال کے آس پاس تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے الیکشن میں ہو رہی دھاندلیوں کو دیکھ لیا اور کئی ایسے اشخاص کو ووٹ ڈالتے دیکھا جو جعلی تھے یا پھر کم عمر تھے۔ کئی جگہوں پر تو پورے کے پورے ووٹوں کے ڈبے ہی بدل دئے گئے جن میں پہلے ہی سے حکمران پارٹی کے امیدوار کے نام ووٹ ڈالے گئے تھے۔ اس وجہ سے مجھے الیکشنوں پر سے بھروسہ ہی اٹھ گیا اور میں نے قصد کیا کہ میں کبھی بھی اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کروں گا۔ تاہم ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے یہ فیصلہ بدل دیا اور اپنی مرضی سے ووٹ ڈالنے لگا۔ کشمیریوں کی کراہت، بے زاری اور نفرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں نہ کبھی جمہوریت دستیاب ہوئی اور نہ ہی ان کو اس جمہوریت میں شریک ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔

چین کے حملے کے دوران ہندوستان کی شکست کے پیش نظر پاکستان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ اس نے ۵/اگست ۱۹۶۵ء کو 'آپریشن جبرالٹر' کے تحت میجر جنرل اختر حسین کی قیادت میں دس ہزار فوجی بھیس بدل کر سرحد کے اِس پار خفیہ طور پر بھیج دیے جس کے نتیجے میں دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں۔ دونوں ممالک کو بہت نقصان اٹھانا پڑا البتہ جنگ میں ہندوستان کا پلڑا بھاری رہا۔ ۲۳/ستمبر کو جنگ بندی ہوئی اور سوویت روس کی ثالثی کے باعث جنرل ایوب خان اور لال بہادر شاستری کے درمیان تاشقند میں سمجھوتا ہوا مگر اس کے باوجود کشمیر کا مسئلہ لٹکا ہی رہ گیا۔ اس جنگ کی خصوصی بات یہ تھی کہ جس خطۂ کشمیر کے لیے جنگ لڑی جا رہی تھی وہاں کسی کے چہرے پر کوئی خوف، ملال یا مایوسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان دنوں میں

ایس پی کالج میں فرسٹ ایئر ٹی ڈی سی کا طالب علم تھا۔ آسمان میں پاکستانی سابر جیٹ اڑتے پھرتے تھے اور کشمیری خندقوں میں چھپنے کی بجائے چھتوں پر چڑھ کر ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ جنگ کے دوران سرحد کے پار ریڈیو 'صدائے کشمیر' شروع ہوا جس کا ترکی بہ ترکی جواب ریڈیو کشمیر دیتا رہا۔ اس زمانے میں ریڈیو کشمیر سے نشر ہونے والا مزاحیہ پروگرام 'وُتل بُجہ' بہت ہی مقبول ہوا۔

پاکستان میں رفتہ رفتہ فوجی اور غیر فوجی طاقتوں کے درمیان کشاکشی زور پکڑتی گئی اور جب وہاں جمہوریت کی بحالی اور پاکستانیوں کو شہری حقوق پانے کا سنہرا موقع مل گیا اسی وقت مغربی اور مشرقی حصوں کی آپسی تناتنی نے یہ خوبصورت موقع ہاتھ سے گنوایا۔ اس کشمکش کا براہ راست انجام یہ ہوا کہ مشرقی حصے کو اپنی آزادی کی جنگ لڑنا پڑی اور ہندوستانی فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ یہ جنگ ۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک لڑی گئی اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان آزاد ہو کر 'بنگلہ دیش' بن گیا۔ اس جنگ میں قریب نوے ہزار پاکستانی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے جو بعد میں بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان ہوئے شملہ سمجھوتے کے تحت رہا ہو گئے۔ پاکستانی فوج کے بنا شرط ہتھیار ڈالنے کے باوجود فریقین مسئلہ کشمیر کا حل نہیں ڈھونڈ پائے۔ اس کے برعکس پاکستانی فوج ہندوستان سے بدلہ لینے کی تاک میں رہی۔ پہلے پنجاب میں خالصتانیوں کی حمایت کرتی رہی اور پھر کشمیر میں حریت اور عسکریت پسندوں کے لشکر تیار کر کے انھیں سرحد پار ٹریننگ دیتی رہی۔ آگے جا کر ۱۹۸۴ء میں ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں سیاچن گلیشر پر دوبارہ آپس میں بھڑ گئیں اور ہندوستان نے اس گلیشر کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا۔ ۱۹۹۹ء میں پاکستانی فوج کی دراندازی کے سبب کرگل سیکٹر میں دونوں فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ہندوستانی فوج نے نہ صرف پاکستانیوں کی دراندازی روک لی بلکہ مقبوضہ علاقوں کو خالی کرانے میں کامیاب ہوئی۔ اس وقت میں فوج چھوڑ کر سِول میں واپس آ چکا تھا اور جموں و کشمیر میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھا۔ جنگ کا سماں دیکھنے کی بے تابی مجھے دورانِ جنگ کرگل تک لے گئی۔ مولبیکھ (کرگل) گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں آسمان سے برستے گولوں کے سائے میں رات بتائی۔ کرگل میں جنگ کے دوران اپنے ڈاک ملازموں کا حوصلہ اور ان کی کارگزاری دیکھ کر مجھے بڑا فخر محسوس ہوا۔

اِدھر پاکستان کی شکست دیکھ کر شیخ محمد عبداللہ بہت مایوس ہوئے۔ ان کی مزاحمت میں اب کوئی

دم نہیں رہا تھا۔ اس لیے بائیس برس کے بعد ۱۹۷۵ء میں وہ صلح کرنے کی غرض سے بات چیت کے لیے تیار ہو گئے۔ انجام کار بیگ پارتھا سارتھی معاہدہ ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ نے دوبارہ جموں وکشمیر ریاست کی باگ ڈور پرائم منسٹر کے بجائے بطور چیف منسٹر کے سنبھالی۔ بعد میں فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین قرار دینے کی غرض سے انھوں نے اپنے دیرینہ رفقائے کار مرزا افضل بیگ اور جی ایم شاہ کو درکنار کر دیا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اپنے باپ کے بعد گدّی نشین ہوئے مگر پارٹی میں اندرونی نزاع کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کے بہنوئی جی ایم شاہ نے گورنر کی شہ پا کر چیف منسٹری کی کرسی چھین لی مگر اس پر زیادہ دیر نہیں ٹک پائے۔ اس کے بعد فاروق عبداللہ نے پھر حکومت سنبھالی لیکن ۸ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی بیٹی روبیہ سعید کو جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ نے یرغمال بنایا۔ بہت بڑا ہنگامہ ہوا، فاروق عبداللہ دہشت گردوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے خلاف تھے مگر مرکزی حکومت کے سامنے ان کی کچھ نہ چلی اور ایک لڑکی کے بدلے پانچ خونخوار دہشت گردوں کو رہا کر دیا گیا۔ یہ حادثہ تاریخ ساز سانحہ ثابت ہوا جس نے ریاست میں دہشت گردی کی طرح ڈال دی۔ بقول شوقؔ بہرائچی:

برباد گلستاں کرنے کو ایک ہی الّو کافی تھا
ہر شاخ پہ الّو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا

جماعت اسلامی اور تبلیغیوں نے پہلے ہی سے زمین تیار کر لی تھی۔ بگڑتے حالات کے مدنظر فاروق عبداللہ کی حکومت برخاست ہوئی اور اس کی جگہ گورنر راج نافذ ہوا۔ گورنر جگ موہن نے کرسی سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ ''میں کشمیریوں کے لیے 'نرسنگ آرڈرلی' کا کام کروں گا'' مگر اس کے برعکس کرفیو، جامہ تلاشیوں اور دھر پکڑ کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ کشمیر کا ماحول دیکھتے ہی دیکھتے مکدّر ہو گیا۔ کشمیری نوجوان تلقین عقیدہ (Indoctrination) کی زد میں آ کر اور پولیس کی زیادتیوں کی تاب نہ لا کر جوق در جوق سرحد پار کرنے لگے جہاں ان کو عسکری تربیت دینے کے لیے پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے ٹریننگ کیمپ پہلے ہی سے تیار تھے۔ کچھ نوجوانوں کو تربیت کے بعد مزید کڑا کرنے کے لیے طالبان کے ہمراہ افغانستان بھیجا گیا تا کہ وہ زمینی حقیقت سے مانوس ہو سکیں۔ میرے آفس کا ایک کلرک اپنے بھائی کے ہمراہ اس تحریک میں شامل ہو کر افغانستان پہنچ گیا مگر واپس آ کر

اس کا بھائی مارا گیا اور وہ خود عسکریت سے تائب ہوا۔ بازآبادکاری کے لیے اس کو کشمیر سے باہر تعینات کرنا پڑا۔ ایک اور عسکریت پسند پوسٹ مین پولیس سے مڈبھیڑ کے دوران ہلاک ہو گیا۔ کشمیر میں آئے دن بم پھٹنے، گولی باری اور راکٹ داغنے کی وارداتیں پیش آنے لگیں۔ سرینگر شہر کی سڑکوں پر ہر روز لاکھوں لوگ جلوس کی صورت میں اقوام متحدہ کے دفتر تک جاتے اور آزادی کا مطالبہ کرتے۔ سارا سرکاری انتظامیہ ٹھپ پڑ گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب آزادی کسی بھی موڑ پر مل جائے گی۔ بہر حال یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ بند طریقے سے زیر عمل لایا جا رہا تھا تاکہ سقوط پاکستان (آزادیِ بنگلہ دیش) کا بدلہ لیا جا سکے۔ اس کا خاکہ 'آپریشن ٹوپاک' کے تحت پاکستان کے صدر جنرل ضیا الحق نے بنایا تھا۔ اس آپریشن کو تین مرحلوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا البتہ اس دوران پاکستان کو ہندوستان سے کسی بھی براہ راست فوجی کارروائی سے گریز کرنا تھا۔ کشمیری پنڈتوں کا جبری انخلا بھی اسی منصوبے کا حصہ تھا۔ آخری مرحلے میں مسلح کشمیریوں کو پاکستانی فوج کی مدد لے کر ہندوستانی نظام، ذرائع ابلاغ اور فوج کو مفلوج کرنا اور کشمیر پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔

اس تناظر میں جو کچھ گورنر جگ موہن سے ہو سکا، اس نے کیا مگر سچ تو یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو سیاست دان تھا اور نہ ہی ایسی کسی بھی صورت حال سے نپٹنے کا اس کو کوئی تجربہ تھا۔ یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کشمیر میں اسلحہ کی جو ذخیرہ اندوزی ہوئی تھی کیا وہ چند دنوں میں ممکن تھی؟ دراصل ذوالفقار علی بھٹو کے پھانسی کے فوراً بعد نیشنل کانفرنس نے وادی میں جماعت اسلامی پر عتاب نازل کیا تھا۔ انجام کار جماعت اسلامی نے وادی اور اس کے گرد و نواح میں ایک منظم تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح کمٹڈ نوجوانوں کا ایک جال بچھا دیا۔ یہی لوگ آگے جا کر عسکری کارروائیوں کے لیے سامنے آتے رہے۔ جن دنوں جگ موہن پہلی بار بموں و کشمیر میں گورنر تعینات ہوا ان ہی دنوں وادی میں باضابطہ طور پر بڑی مشاقی اور رازداری کے ساتھ گولہ بارود اور اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی ہوتی رہی اور عسکری نظام کا ایک نیٹ ورک بچھایا گیا۔ جگ موہن اپنی کتاب 'مائی فروزن ٹربیولنس ان کشمیر' (My Frozen Turbulence in Kashmir) میں رقم طراز ہیں کہ اس ناجائز عسکری پھیلاو کے بارے میں میں نے وقتاً فوقتاً وزیر اعظم ہندوستان، راجیو گاندھی کو 'انتباہی اشارے' (The Warning Signals) بھیج دیے۔ میں جگ

موہن کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیا ایک ذمہ دار گورنر کا فرض صرف وارننگ سگنل بھیجنے کے ساتھ ختم ہوتا ہے؟ اگر اس کی آنکھوں کے سامنے ملک کی سالمیت کے خلاف کوئی مشکوک کام ہو رہا تھا اور ملک کا وزیر اعظم اس پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا تھا تو اسے فوراً استعفیٰ دینا چاہیے تھا تاکہ سارے پارلیمنٹ میں اس بات پر بحث چھڑ جاتی کہ ریاستِ جموں و کشمیر کے گورنر نے استعفیٰ کیوں دیا؟ اس طرح مرکزی حکومت جلد از جلد اس مسئلے پر کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی اور شاید گربہ کشتن روز اول کے مصداق ملی ٹینسی کو ختم کرنے میں کامیاب ہوتی۔ جگ موہن کوئی بیوروکریٹ تو تھے نہیں کہ ان کو اپنے پنشن اور ترقی کی فکر لاحق تھی۔

میری فہم میں پاکستان کا یہ ردِ عمل بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے پیدا ہوا اور جستہ جستہ شدید تر ہوتا گیا۔ پاکستانی فوج ۱۹۷۱ء میں ملی شکست کے ساتھ آج تک سمجھوتا نہیں کر پائی اور کسی بھی طریقے سے ہندوستان سے انتقام لینے کی در پے رہی۔ پہلے انھوں نے پنجاب میں خالصتانیوں کو بھڑکانے کی کوشش کی مگر بعد میں جب ہم مذہب کشمیریوں کو جہاد کے لیے تیار پایا تو اپنی پوری قوت کشمیر کی طرف مرتکز کر لی۔ میرا یہ بھی ماننا ہے کہ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کو الگ کرنا بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ مشرقی حصہ مغربی حصے سے کافی بڑا تھا، مشرقی پاکستان کو کسی بھی حکومت میں ساجھے داری نہیں ملتی تھی، مشرقی پاکستان کی رعایا پر مغربی حکمرانوں کو کبھی اعتماد نہ تھا، انتظامیہ اور لا اینڈ آرڈر کا دار و مدار مغربی افسروں اور فوج پر تھا، بنگال میں ہمیشہ مغربی پاکستان کی فوجیں تعینات رہتی تھیں جس کے سبب پاکستان کی فوجی طاقت بٹ جاتی تھی اور پھر اتنی دور سے ان کے لیے ہتھیار اور رسد مہیا کرنا پاکستان کو مسلسل کھوکھلا کر رہی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اندرا گاندھی نے پاکستان کے بطن میں پل رہے سرطان کو آپریشن کر کے باہر نکال دیا اور اس طرح پاکستان کی اقتصادی اور دفاعی صحت کو پھر سے بحال کر دیا۔ وہ اب اپنی ساری قوت کشمیر پر مرتکز کر رہا ہے۔ دیکھا جائے تو آزادی کے بعد پاکستان میں زیادہ تر فوجی حکومتیں رہی ہیں اور جب کبھی مختصر المدتی غیر فوجی حکومت آئی وہ فوجی بیساکھیوں کے سہارے ہی چلتی رہی۔ اس لیے مذکورہ ردِ عمل پاکستانی فوج کی نفسیات کو منعکس کرتا ہے جبکہ وہاں کی رعایا امن اور سکون کی متلاشی ہے۔ کشمیر میں ہو رہی پاکستان کی طرف سے نیابتی جنگ ابھی تک جاری ہے اور ہندوستان کی لاکھ کوششوں کے باوجود کوئی حل

نہیں نکل پا رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں پاکستان نے اس جنگ میں ملوث ہو کر اپنی دھرتی کو بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا ہے اور اپنے شہروں، گاؤں اور قصبوں کو دہشت گردی کی فیکٹریاں بنا دیا ہے۔

گلزارِ کشمیر پر آج جو نظر پڑتی ہے ہر سو ویرانی چھائی ہوئی ملتی ہے۔ چنار زرد، در و دیوار زرد اور چہرۂ کاشتکار زرد۔ آسیؔ کا مندرجہ ذیل شعر اس صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے:

؎ خزاں کے دن جو دیکھا، کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتا تا باغباں رو رو یہاں غنچہ، یہاں گُل تھا

☆☆☆

مٹھی بھر لوگ

؎ انجانے میں دل کا قصہ چھیڑ دیا معلوم نہ تھا
ہم یہ فسانہ کہتے کہتے افسانہ بن جائیں گے

(اختر سعید خاں)

مجھے اپنے آپ کو کشمیری کہلانے میں بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔ کشمیری عام طور پر نیک سیرت اور امن پسند ہوتے ہیں۔ کشمیری سے میرا مطلب وہ لوگ ہیں جو وادی کشمیر میں رہتے ہیں یا رہتے تھے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ بدقسمتی سے دہشت گردی کے سبب قریباً چار لاکھ کشمیری پنڈتوں کو ۱۹۹۰ء میں کشمیر کی وادی کو جبراً خیر باد کہنا پڑا جبکہ وادی میں مقیم لوگ تب سے تشدّد کے سائے میں جی رہے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر بقول لارڈ برڈوڈ ''ایک جغرافیائی عفریت ہے'' کیونکہ اس میں تین ایسے خطے۔ کشمیر، جموں اور لداخ۔ شامل ہیں جو بود و باش، ثقافت اور زبان کے تعلق سے ایک دوسرے سے کُلی طور پر مختلف ہیں۔ جموں میں ڈوگرہ رہتے ہیں جو ڈوگری زبان بولتے ہیں اور ان کا رہن سہن ہماچل اور پنجاب کے باشندوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ راجپوت ہونے کی وجہ سے اپنی آن بان پر مرمٹتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فوج میں ڈوگرہ راجپوتوں کی کافی تعداد ہے۔ سرحدی علاقوں میں گوجر رہتے ہیں جو گوجری یا پہاڑی زبان بولتے ہیں۔ یہ زبان کشمیری یا ڈوگری سے مختلف ہے۔ گوجر لوگ زیادہ تر مویشی پال کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُدھر لداخ میں منگول نسل کے لوگ رہتے ہیں جو تبت کے باشندوں سے مشابہ ہیں۔ یہاں بھی دو طرح کے مسلک نظر آتے ہیں، لداخ کے گرد و نواح میں زیادہ تر بودھ رہتے ہیں جو بودھی یا لداخی زبان بولتے ہیں جبکہ کرگل کے گرد و نواح میں شیعہ مسلمانوں کی اکثریت ہے جو پورِک،

شینا اور بالتی زبانیں بولتے ہیں۔ یہ لوگ جن اونچائیوں پر رہتے ہیں وہاں زندگی بسر کرنا جوکھم کا کام ہے۔ کشمیر میں آریائی نسل کے لوگ رہتے ہیں جن کی زبان کشمیری یا کاشُر درد گروپ سے تعلق رکھتی ہے جو دوسری آریائی زبانوں سے کچھ ہٹ کر ہے۔ اس زبان میں کچھ ایسی آوازیں ہیں جو ہندی، اردو اور انگریزی میں نہیں ملتیں۔ جملوں کی بناوٹ انگریزی سے کچھ ملتی جلتی ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد وادیِ کشمیر میں آہستہ آہستہ مسلمانوں کی آبادی بڑھتی چلی گئی جب کہ ۱۹۹۰ء میں آخری ہجرت کے وقت کشمیری پنڈتوں کی کل آبادی چار لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے علاوہ سکھوں کی آبادی بھی ہے جو آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تجارتی مراکز میں کہیں کہیں پنجابی کھتری رہتے تھے جو بیوپار کرتے تھے۔ ان لوگوں کے طور طریقے پنجابی ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ کشمیری ہندوؤں کی آبادی گھٹنے کے کئی اسباب ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کشمیری ہندوؤں کی آبادی کچھ بدھ مت کے پھیلاؤ سے، کچھ اسلام کی تیغ و تبر اور تبلیغ سے اور کچھ ہندوؤں کی اپنی قدامت پسندی سے کم ہوتی چلی گئی۔ ذولچو اور سکندر بت شکن جیسے تاناشاہوں نے لاکھوں کشمیری پنڈتوں کو تہ تیغ کیا یا پھر مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک زمانے میں کشمیری پنڈت اس قدر حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہوگئے تھے کہ وہ خود کو پنڈت کہلانے سے گریز کرتے تھے اور چلا چلا کر کہتے تھے 'نا بھٹہ ہوم، نا بھٹہ ہوم (میں کشمیری پنڈت نہیں ہوں)۔'' بقول جیالال کلم آزادی سے قبل کشمیری پنڈتوں کو وادی سے تقریباً ۳۹ر بار ہجرت کرنا پڑی تھی۔ وادی میں اکثر لوگوں نے عتاب سے بچنے کے لیے حکمران کا مذہب اختیار کرلیا۔ مذہب بدلنے کے اس عمل میں صحیح یا غلط کی تفریق کرنا مشکل ہے۔ سکندر بت شکن کے زمانے میں سہہ بٹ عرف سیف الدین نے اپنے ہی ہم وطنوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ کئی ٹن جنیو (زنار) کو انبار لگا کر جلایا گیا اور پہننے والوں نے خوف کے باعث اسلام قبول کیا۔ مگر کچھ ہی وقفے کے بعد انسانی سرشت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت میں شری بٹ کی درخواست پر ایک تو کشمیر سے باہر چلے گئے پنڈتوں کو واپس بلا کر بسایا گیا اور دوسرے جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور واپس اپنا مذہب اختیار کرنے کے خواہاں تھے، انھیں ہندو بننے دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری عوام آج تک زین العابدین کو 'بڈشاہ' (بڑا بادشاہ) کے نام سے یاد کرتی ہے۔

مذہب کے ارتقا اور پھیلاو کے بارے میں کچھ باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ عہد حجری ہی سے انسان قدرت کے قہر سے جوجھتا رہا اور اپنی حفاظت کے لیے نئے نئے معبود ڈھونڈنے میں غلطاں و پیچاں رہا۔ مذہب مظاہر پرستی (Animism)، حیات پرستی (Animatism)، اجداد پرستی (Ancestor Worship)، قبر یا مزار پرستی (Grave/Shrine Worship)، اور بُت پرستی (Idol Worship) کے منازل سے ہوتا ہوا کثرت پرستی (Polytheism) اور وحدانیت (Monotheism) کی جانب بڑھتا گیا۔ اس سفر میں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو خدا کے وجود سے منکر تھے۔ ہندوؤں کے نیایہ سکول (Nyaya School) میں الحاد کا عنصر پایا جاتا ہے۔ سانکھیہ (Samkhya)، مماسا (Mimamsa) اور چاروک (Charvakas) اس سکول کی چند مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بُدھ مت (Buddhism) اور جین مت (Jainism) بھی کچھ حد تک الحاد کے قریب ہیں۔ چند مذاہب معاشرے کی اجتماعی سوچ و فکر کا نتیجہ ہیں جس میں وقتاً فوقتاً مذہبی علما اپنا یوگدان دیتے رہے۔ اس کے برعکس کچھ مذہبی رہنماؤں نے نئے مذاہب کی بنیاد ڈالی اور ایک نئی فکر و سوچ کو جنم دیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ مذاہب دنیا میں چند ایک ثقافتی مراکز سے ابھرے اس لیے نہ صرف ایک زنجیر سے جکڑے رہے بلکہ علاقائی خصوصیات سے بھی مسلح رہے جیسے ہندو، جین، بودھ اور سکھ دھرم میں ہندوستانی کلچر ملتا ہے، کنفیوشی اور تاؤ مذاہب میں چینی سوچ ملتی ہے اور یہودی، عیسائی اور مسلم مذاہب میں فونیشیائی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔

عام طور پر وہ مذہب جو ایک شخص سے شروع ہوتا ہے، دوسرے مذہب کے لوگوں کو اپنے ورطۂ عقیدہ میں شامل کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے ورنہ ایسا مذہب اپنے بانی کی آخری سانس کے ساتھ ہی دم توڑ دیتا۔ ایسے مذہب میں عموماً نو واردوں کو طرح طرح کے رنگین سپنے دکھائے جاتے ہیں اور ان افراد کو مختلف ترغیبات دی جاتی ہیں جو بقول ان کے گمراہ لوگوں کو اپنے دائرۂ اثر میں لا کر اپنے مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ انہی موعودہ ترغیبات کو پانے کے لیے ایک طرف حکمران جوش و جنون میں تلوار کی دھار تیز سے تیز تر کر لیتے ہیں اور دوسری طرف مذہبی خطیب اپنی چرب زبانی سے غریب اور لاچار رعایا کو مسحور کر لیتے ہیں۔ مدعا دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ان دونوں کی آپس میں سانٹھ گانٹھ بھی رہتی ہے۔

ایک جانب غیر مذہبی لوگوں پر حکمران جسمانی اور معاشی طور پر ظلم ڈھاتا ہے اور دوسری جانب مذہبی واعظ ان کے زخموں پر پھاہے لگا کر ان کو حالات سے سمجھوتا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ غریب لاچار لوگ جن کا مقصد صرف جینا ہوتا ہے چاہے وہ کیسے بھی ہو، یا تو ظالم حکمران کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں یا پھر پارسائی کا مکھوٹا پہنے خود ساختہ مذہبی رہنما کی اطاعت قبول کرتے ہیں ۔ تاریخ گواہ ہے کہ مذہبوں کی اس کبھی نہ ختم ہونے والی آپسی رقابت میں صدیوں سے کروڑوں لوگ موت سے ہم کنار ہوتے رہے ہیں۔ کبھی ائیر یا راکھشس کا لیبل لگا کر، کبھی ریفارمیشن کے نام پر، کبھی جہاد کی آڑ میں، اور کبھی سماجی تطہیر کی خاطر۔ اسی جنون میں آکر سونے کی لنکا نیست و نابود ہوگئی۔ محمود غزنوی نے مذہبی بالادستی قائم کرنے کی خاطر سارناتھ مندر پر سترہ بار چڑھائی کی، اسے تہس نہس کر ڈالا اور بھگوان شو کی مورتی کو غزنی کی مسجد کا پائیدان بنا دیا۔ جہادوں کی خونی داستان کا سب سے بڑا شاہد قسطنطنیہ یا استنبول ہے جہاں لاکھوں لوگ موت کے گھاٹ اتارے گئے ۔ یہ شہر دہلی اور یروشلم کی مانند کئی بار اجڑا اور کئی بار آباد ہوا۔ سپین کے کئی شہر بھی اس مذہبی ریس کا شکار ہو گئے ۔ ۱۲۳۳ء میں کرسچن چرچ نے ایک مذہبی عدالت قائم کر کے لوگوں کے مذہبی اعتقاد کو پرکھنے کا نیا طریقہ ایجاد کیا اور جو لوگ ان کے بنائے میزان پر کھرے نہیں اترے انھیں زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ کلیسائی احتساب (Inquisition) کے تحت ہزاروں عورتوں پر بدروحوں کا الزام لگا کر ان کو آگ کے سپرد کیا جاتا تھا۔ جواہر لال نہرو اپنی کتاب 'گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری' (Glimpses of World History) میں رقم طراز ہیں:

> ''خدا کے نام پر انھوں نے قتل و غارت کی۔ اور کہتے رہے کہ وہ خدا کی نعمت 'انسانی روح' کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں. اس لافانی روح کو بچاتے ہوئے انھوں نے فانی جسموں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ مذہبوں کی داستاں بہت بُری ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ 'انکیوزیشن' سے بڑھ کر انسانی درندگی کی مثال تواریخ میں ملتی ہے۔''

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ بُدھ مذہب نے بھی، جو ہر دم اہنسا کا پرچار کرتا ہے، تیغ و تلوار کے بل بوتے پر وسطی ایشیا، چین اور ہند چینی الجزائر میں اپنا سکہ جمایا یہاں تک کہ حال ہی میں برما میں روہنگیا

مسلمانوں پر ظلم وتشدد برپا کیا۔ اس لیے کسی ایک مذہب کو توسیع پسند یا بربریت کو شہ دینے والا مذہب قرار دینا جائز نہ ہوگا۔ مذہب یوں ہی بنتے اور بگڑتے رہے ہیں اور پھر ان کی جگہ نئے مذاہب ابھرتے رہے ہیں۔

کشمیری پنڈتوں کی آبادی گو بہت ہی قلیل ہے تاہم ان مٹھی بھر لوگوں نے سارے ہندوستان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اس میں نہ صرف ان کی ذہانت بلکہ ان کی سوجھ بوجھ کا بھی دخل ہے۔ کشمیر کے مورخ محی الدین حاجنی نے ایک مضمون میں کشمیری پنڈتوں کو دروں بین (Introvert) کہا تھا مگر میں نے اس پر اعتراض جتایا تھا۔ میرے خیال میں کشمیری پنڈت نہ تو دروں بین ہیں اور نہ بیروں بین (Extrovert) بلکہ وہ ان کے درمیان کی ایک کڑی ہیں جسے نفسیات میں دوبین (Ambivert) کہا جاتا ہے۔ کشمیری پنڈت کسی بھی صورت میں انتہا پسند واقع نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی طبیعت میں غضب کا اعتدال اور صبر ہوتا ہے۔ وہ جہاں ذہین ہیں وہیں دنیاوی رکھ رکھاو کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ جنونیت اور وجدان سے ہمیشہ فاصلہ رکھتے ہیں۔ قناعت پسند ہونے کے باوجود کشمیری پنڈتوں میں ایسی کم مثالیں ملتی ہیں جہاں کسی فرد واحد نے اپنا نصب العین پانے کے لیے یا فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کے دیگر پہلوؤں اور سماجی ذمے داریوں کو نظر انداز کیا ہو۔ عام طور پر وہ اپنے سماج میں آنکھیں کھول کر جینا پسند کرتے ہیں۔ سماج کے رسوم وقوائد کے بے حد پابند ہوتے ہیں چاہے وہ کتنے ہی فرسودہ کیوں نہ ہوں اور عموماً بغاوت کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ کشمیری پنڈت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سبھی برہمن ذات سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ پیشے کے حساب سے ان کے یہاں کئی ذیلی طبقے معرض وجود میں آچکے ہیں جن میں سے چند ایک کو اکثریت کی برأت کا شکار بھی ہونا پڑا ہے۔ زمانۂ قدیم میں برہمنوں کے علاوہ کشمیر میں کئی اور ذاتیں ہوا کرتی تھیں مثلاً راجپوت، ڈامر وغیرہ مگر بیشتر لوگوں نے ماسوائے کچھ برہمنوں کے بودھ مت اور پھر اسلام قبول کرلیا۔ کئی برہمن جیسے تیسے ظلم وجبر سے اپنا دامن بچاتے ہوئے پانچ ہزار سال کا سفر طے کرکے دورِ حاضر تک آپہنچے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں میں تاجر لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ ایسے پیشے جہاں جوکھم اٹھانا مطلوب ہو انھیں راس نہیں آتا۔ اس مہم جوئی کی کمی کی وجہ سے اس برادری میں اکا دکا لوگ ہی اپنی بزنس شروع کرتے ہیں حالانکہ ہجرت کے بعد اب یہ رویہ بدل رہا ہے۔

کہتے ہیں ذہین آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو اپنی ذہنی قابلیت کو استعمال کر کے اپنے لیے دولت کماتے ہیں اور دوسرے وہ جو کسی آجر کی نوکری کر کے اپنی ذہانت کا استعمال کرتے ہیں اور اس کی تجوریاں بھرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت میں اسے خود رِسک یا جوکھم اٹھانا پڑتا ہے جبکہ دوسری حالت میں بندوق دوسرے کے کاندھے پر رکھی جاتی ہے۔ کشمیری پنڈت دوسرے زمرے میں آجاتے ہیں۔ بایں ہمہ چند ایک پنڈت جو بزنس کے ساتھ اتفاقاً جڑ گئے انھوں نے خاصا نام کمایا جیسے روی تکو جو آبی جہازوں کی ایک کمپنی کے مالک تھے یا پھر نیکو کمپنی کے راجیو کول، آئی ٹی سی کے اے این ہاکسر اور جے این سپرو وغیرہ۔ مگر یہ خواص ہیں عام نہیں کیونکہ عام لوگ بیوپار کے جھمیلوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ اس کی وجہ نہ صرف یہ کہ وہ برہمن ہیں اور پوتھی لے کر ہی گھومنا پسند کرتے ہیں بلکہ یہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کشمیری پنڈت، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے، جوکھم نہیں اٹھانا چاہتے ہیں اور کسی بھی مسئلے پر بنا غور و خوض کیے فیصلہ صادر نہیں کرتے۔ جب تک وہ مسئلے کی بال کی کھال نہیں اتارتے، اپنی رائے دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی یہ عادت جہاں ان کو اچھا بزنس مین بننے سے قاصر رکھتی ہے، وہیں اس خصوصیت کے سبب وہ اچھے بیوروکریٹ اور منتظمین ثابت ہوئے ہیں اور اسی باعث ایڈمنسٹریشن میں ان کی بھرمار ہے۔ عام طور پر آپ کشمیری پنڈت کو بغل میں دفتری مسل دبائے پائیں گے چاہے وہ بڑے سے بڑا منتظم ہو یا پھر ادنیٰ سے ادنیٰ بابو۔ عجیب بات ہے کہ غیر ہندو سلطانوں کے دورِ حکومت میں بھی کشمیری پنڈت انتظامیہ کے اہم رکن بنے رہے اور اپنی صلاحیت کے سبب ان کی خوشنودی حاصل کرتے رہے۔ ہجرت کے بعد یہ منظرنامہ کافی حد تک بدل چکا ہے۔

علم حاصل کرنا (گیان مارگ) اکثر و بیشتر کشمیری پنڈتوں کا نصب العین رہا ہے گو کچھ افراد لل دید اور پرمانند کی طرح بھکتی مارگ پر گامزن ہوئے۔ گیان مارگ کے حوالے سے کئی نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے کشمیری شیوازم کے ارتقا میں اپنا یوگدان دیا جیسے ابھینو گپت (۱۰۱۶–۹۵۰ء؛ تنتر لوک)، واسو گپت (۸۵۰–۸۰۰ء؛ شیوسوتر)، آنند وردھن، اُتپل دیو، بلہن وغیرہ۔ اسی طرح ویشنومت کے کھمیندر (۱۰۱۷–۹۹۰ء) نے برہت کتھا منجری، دش اوتار چرت وغیرہ کئی تصانیف رقم کیں جبکہ کہانیوں کا ساگر 'کتھا سرت ساگر' شیومت کے کہانی کار سوم دیو نے گیارہویں صدی عیسوی میں قلم بند کیا۔ ہندوستان کی

سب سے پہلی تاریخ کشمیری مورخ کلہن نے رقم کی ہے جس کا نام 'راج ترنگنی' ہے۔

گذشتہ سات دہائیوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو مرکزی حکومت میں کئی ایسے کشمیری پنڈت ملیں گے جنھوں نے حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا ہے جیسے پی این ہاکسر، پی این کول، ٹی این کول، آر این کاو، وجے لکشمی پنڈت، بی کے نہرو، ایم ایل فوطیدار، شیام لال شکھدر، کیلاش ناتھ کاٹجو، مارکنڈے کاٹجو وغیرہ۔ آرمی چیف جنرل ٹی این رینا اور ائیر چیف مارشل ایس کے کول فوج سے وابستہ رہے جبکہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، تیج بہادر سپرو، کشپ بندھو، شام لال صراف اور ڈی پی دھر سیاست سے منسلک رہے۔ جواہر کول، راج کمار، منی کول، انوپم کھیر، جیون، اے کے ہنگل، ایم کے رینا اور اوتار کرشن کول بالی وُڈ؛ سریش رینا اور سدھارتھ کول کرکٹ؛ رتن ناتھ سرشار، پنڈت سدرشن، آنند نرائن ملا، پریم ناتھ در، پریم ناتھ پردیسی، برج پریمی، ویریندر پٹواری، پشکر ناتھ، اشوک پٹواری اور راقم التحریر اردو ادب، برج کاچرو اور اومکار کول لسانیات، پران کشور اور پشکر بھان ریڈیو ڈرامہ، کیلاش ناتھ کول اور ٹی این خوشو ماحولیات، ترلوک گرٹو اور بھجن سوپوری موسیقی اور بنسی پارمو مصوری کے ساتھ وابستہ رہے۔

انتظامیہ اور کچھ حد تک سر رشتہ تعلیم میں کشمیری پنڈتوں کی کامیابی کا راز ان کی ذہانت، طبیعت کی نرمی و اعتدال، خوش خلقی، خوش گفتاری، امن پسندی، اور صبر و تحمل ہے۔ ان لوگوں میں گہرائی و گیرائی اور اتھاہ سہن شکتی پائی جاتی ہے اور آپ کتنی بھی کوشش کر لو یہ لوگ جلدی مشتعل نہیں ہوتے۔ ان میدانوں میں انھیں ذہنی سکون اور دلی تسکین ملتی ہے۔ ان کی یہ سرخروئی کشمیری مسلمانوں ہی کیا ہندوستان کے کئی اور ہندو فرقوں کی جلن کا باعث بن چکی ہے۔ باوجود اس کے کہ آزادی کے بعد اس فرقے کو وہ سب سہولتیں میسر نہیں رہیں جو آزادی سے پہلے دستیاب تھیں، پھر بھی مرکزی و ریاستی سطح پر آج بھی انتظامیہ میں ان کا دبدبہ برقرار ہے۔ آزادی کے بعد کشمیری مسلمانوں میں تعلیم و تربیت کی فراوانی کے سبب ریاستی انتظامیہ پر پنڈتوں کی پکڑ وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی گئی جو ان کے ذہنی انتشار کا سبب بن گئی۔ ان کی برتری کو ختم کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی ریاستی حکومتوں نے سازشیں کیں۔ انھوں نے ایسے کئی اقدامات کیے جن سے مسلم اکثریت کو تعلیم اور نوکریاں حاصل کرنے میں اس فرقے کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔

ایک جانب ریاست میں دیہی اصلاحات کے تحت پنڈتوں سے ان کی زمینیں چھین لی گئیں اور دوسری جانب قابلیت کے باوجود انتظامیہ میں ان کو نوکریوں سے محروم رکھا گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس فرقے کو متبادل وسیلے بھی فراہم نہیں ہوئے جن کی طرف وہ رجوع کر سکتے تھے۔ نتیجتاً آزادی کے بعد اس فرقے میں گھٹن کا احساس ہونے لگا جس کا اظہار بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں 'کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن' کی صورت میں ہوا۔ گو یہ ایجی ٹیشن کسی اور غرض سے شروع ہو چکی تھی مگر آخر کار اس گھٹن کا اظہار یہ بن گئی۔ پنڈتوں کے لیے ایک ہی راستہ بچ گیا تھا اور وہ تھا نوکری کی تلاش میں بڑے بڑے شہروں کی طرف رجوع کرنا۔ یہ اقتصادی انخلا آہستہ روی کے ساتھ بدستور چل رہا تھا اور کشمیر کی وادی تعلیم یافتہ کشمیری پنڈتوں سے خالی ہوتی جا رہی تھی لیکن نویں دہے میں پوری برادری کو دہشت گردی کے سائے میں یک مشت وادی چھوڑ کر نقل مکانی کرنا پڑی۔ بقول اشتیاق طالبؔ:

رکھی گئی جو بزورِ سناں سرِ مقتل
وہ خون میں ڈوبی ہوئی داستاں ہماری ہے

کشمیر کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ عیاں ہوتا ہے کہ ذولچو کے حملے اور پھر کوٹہ رانی کے عہد میں رینچن شاہ اور شہ میر کی سیاسی سازشوں کے بعد کشمیری پنڈتوں کو کئی بار اس دھرتی سے ہجرت کرنا پڑی لیکن وطن کی محبت ان کو ہر بار واپس کھینچ لاتی تھی۔ کشمیری پنڈتوں کی بستیاں اجڑتی گئیں مگر پھر بستی گئیں۔ سکندر بُت شکن اور افغان دورِ حکومت میں اس فرقے کو بے شمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ روایت یہ ہے کہ سکندر کے دورِ حکومت میں کئی ٹن زنار جلا کر پنڈتوں کو مذہب بدلنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق افغان صوبیدار جبار خان نے کشمیری برہمنوں کے اس عقیدے کو چلینج کیا کہ شوراتری سے پہلے وادیِ کشمیر میں برف ضرور گرتی ہے کیونکہ برفانی بابا بھگوان شو کیلاش پربت پر براجمان ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ امسال شوراتری جون میں منائی جائے تاکہ وہ دیکھ لے کہ جون میں برف کیسے گرتی ہے؟ کہتے ہیں کہ کشمیری پنڈت خوف و ڈر کے عالم میں شوراتری کی تیاریاں جون میں کرنے لگے۔ تبھی ایک معجزہ ہوا، ٹھیک شوراتری کے چند دن پہلے وادی میں شدت سے برف باری ہوگئی۔ اس بات کو لے کر پنڈتوں میں ایک طنزیہ کشمیری شعر عام ہوا۔ ''وُچھتون یہ جبار جندٔ، ہارس تہ کرُن وندٔ'' (دیکھو یہ جبار ظالم،

گرمی میں برف کا عالم)۔ گو میں ایسی مذہبی حکایتوں پر بہت کم یقین کرتا ہوں مگر کہیں کچھ ظلم و جبر کی بُو باس اس کہانی سے ضرور آتی ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی ہجرت اور باز آبادکاری کی گواہی کچھ حد تک اس بات سے بھی ملتی ہے کہ کشمیر میں پنڈتوں کے دو گروہ ہیں، مَل ماس اور بَان ماس۔ کبھی کبھی یہ گروہ شوراتری الگ الگ موقعوں پر مناتے ہیں۔ دو شوراتریوں میں ایک مہینے کا فرق ہوتا ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں سے جو گروہ کشمیر میں رہ رہا تھا اور قمری سال کے حساب سے تقویم (جنتری) بناتا تھا ان کی شوراتری ایک مہینے پہلے آتی ہے اور دوسرا گروہ، جو کشمیر سے باہر جا کر لوٹ آیا تھا اور شمسی سال کے حساب سے جنتری بناتا تھا، وہ ایک مہینے بعد شوراتری مناتا ہے۔ سکھوں اور ڈوگرہ حکومتوں کے دور میں کشمیری پنڈتوں کی آب و تاب کچھ حد تک بحال ہوگئی مگر اس کا ایک بُرا نتیجہ بھی سامنے آیا۔ سکھوں اور ڈوگرہ حکمرانوں نے کشمیری مسلمانوں پر جو ظلم و ستم روا رکھا اس میں پنڈتوں کو آلۂ کار بنایا گیا کیونکہ زمینی سطح پر انتظامیہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ظلم و بربریت کے جتنے بھی کام ان حکمرانوں نے کروایے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کشمیری پنڈتوں کو استعمال کیا گیا کیونکہ افسر شاہی میں ان کی کثرت تھی۔ نتیجتاً کشمیری مسلمان پنڈتوں سے بدظن ہوگئے۔ دراصل بورژوائی ذہنیت کا مالک کشمیری پنڈت محض حالات کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ آگے کھائی اور پیچھے گڑھا والا معاملہ تھا۔ اس لیے مجبوراً اس کو سکھ اور ڈوگرہ حکومتوں کی تاناشاہی میں ساجھے دار بننا پڑتا تھا۔

کشمیری پنڈتوں کے رسم و رواج اور تیوہار منانے کا طریقہ دوسرے ہندوؤں سے قدرے ہٹ کر ہے۔ مثلاً یگنوپویت (جنیؤ ڈالنے کی رسم) اور شادی کے روز پورے دن پوجا اور ہون کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے موسم کے مدنظر شادیاں دن ہی میں ہوتی ہیں اور دولہے کو آتے وجاتے وقت ایک مخصوص رنگولی (ویوُگ) پر کھڑا کیا جاتا ہے اور اس کی آرتی اتاری جاتی ہے۔ جہیز کی بدعت عام ہے اور کئی لڑکیاں جہیز نہ دے پانے کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتی ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کا سب سے بڑا تیوہار شوراتری ہے جس میں شیو اور پاروتی کی شادی کی رسمیں نبھائی جاتی ہیں۔ یہ تیوہار تقریباً پندرہ دن منایا جاتا ہے، گھر کی صفائی اور لیپا پوتی کی جاتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی موسم سرما کا خاتمہ ہوتا ہے اور بہار کی آمد ہوتی ہے۔ ان دنوں کوڑیوں کا ایک نرالا کھیل کھیلا جاتا ہے جس کا رواج غالباً کشمیر سے باہر کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ بہار کا موسم

آتے ہی 'نیا سال' (نورَہ) منایا جاتا ہے۔ اس روز ہاری پربت کے دامن میں واقع 'بادام واری' میں میلا لگ جاتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شرکت کرتے ہیں۔ باداموں کے پیڑوں پر شگوفے لگے ہوتے ہیں اور ان کے نیچے لوگ ٹولیوں میں بیٹھ کر نمکین چائے اور سنگھاڑوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رکشا بندھن پر راکھی باندھنے کا رواج نہیں ہے البتہ اس روز امرناتھ گپھا میں بھگوان شیو جی کے درشن کرنے لوگ جوق در جوق چلے جاتے ہیں۔ کرشن کا جنم دن جہاں کشمیر سے باہر 'جنم اشٹمی' کے دن منایا جاتا ہے وہیں کشمیر میں ایک روز پہلے 'زرم ستم' کو منایا جاتا ہے اور رات کے بارہ بجے تک پوجا پاٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک اور تیوہار کھیر بھوانی کا میلہ ہے جس دن کشمیری پنڈت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاندربل کے نزدیک تولہ مولہ میں راگنیا بھگوتی (کھیر بھوانی) کی پوجا کرنے چلے جاتے ہیں۔ وہاں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ ہاری پربت پر واقع چکریشوری مندر میں بھی لوگ علی الصباح ہر روز نہیں تو کم از کم ہفتے کے دن پہنچ جاتے ہیں۔ دیوالی اور دسہرہ کو اتنی دھوم دھام سے نہیں منایا جاتا ہے جتنا کہ کشمیر سے باہر۔ البتہ ڈوگرہ حکمرانوں نے حضوری باغ، جس کا نام اب اقبال پارک رکھا گیا ہے، میں دسہرہ کے روز راون اور اس کے بھائیوں کے پتلے نذر آتش کرنے کی رسم کا آغاز کیا۔ موسم سرما میں ایک تیوہار گھر دیوتا سے منسوب ہے۔ جس روز صرف مچھلی پکائی جاتی ہے اور بالائی منزل پر پکی ہوئی اور ایک بنا پکائی ہوئی ثابوت مچھلی چاول سے بھری تھالی میں رکھ کر گھر دیوتا کو پیش کی جاتی ہے جو عام یقین کے مطابق اس میں سے چند لقمے کھاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور تیوہار 'کھِژ ماوَس' (کھچڑی اماوسیہ) پوس کے مہینے میں منایا جاتا ہے جس میں رات کو 'یکشوں' کے لیے کھچڑی پکا کر باہر رکھی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس روز کبیر دیوتا پرسن ہو کر دھن دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ ماگھ مہینے میں ایک اور اہم تیوہار 'کاگ پورنماشی' (کاو پونم) منایا جاتا ہے۔ اس مہینے میں سائبیریا اور دیگر ٹھنڈے علاقوں سے خاص قسم کے کوّے جو سر سے پاؤں تک کالے ہوتے ہیں، اڑان بھر کر چلے آتے ہیں۔ انہی کوؤں کا خیر مقدم کرنے کے لیے کشمیری پنڈت ان کو کھانا کھلاتے ہیں۔ پرندوں اور جانوروں کا خیال اس فرقے کو ہمیشہ رہا ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر کچھ لوگ پرندوں کے لیے دیوار کی منڈیر پر یا کسی اونچی جگہ پر کچے چاول کے دانے ڈال دیتے ہیں اور پرندے آ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اسی طرح کھانا شروع کرنے سے پہلے ہر کسی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی تھالی میں سے ایک

نوالہ پکے چاولوں کا چھوٹے کباب کی صورت میں تھالی کے باہر کتوں کے لیے رکھ دے جسے 'ہوٗن مٹ' کہا جاتا ہے۔

چاول، ساگ، اور کمل ککڑی (ندرو) کشمیری پنڈتوں کی دل پسند خوراک ہے۔ دالوں کا بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ برہمن ہونے کے باوجود وہ گوشت سے پرہیز نہیں کرتے، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جہاں کشمیر سے باہر بکرے کا گوشت کھانے کا رواج ہے وہیں کشمیر میں چربی دار بھیڑ کا گوشت پسند کیا جاتا ہے۔ میٹھے پانی کی مچھلی خاص طور پر ڈل جھیل کی مچھلی بھی اچھی لگتی ہے۔ چائے کی ایک مخصوص قسم کا رواج عام ہے۔ اس چائے کو 'سماوار' میں تیار کیا جاتا ہے جس کے دو چیمبر ہوتے ہیں، مرکزی چیمبر میں کوئلہ جلتا رہتا ہے جبکہ باہری چیمبر میں کئی گھنٹے چائے ابلتی رہتی ہے جس میں شکر کے بدلے نمک اور دودھ ڈالا جاتا ہے۔ ساتھ میں تل سے مزین چھوٹا کلچا 'ژوچ وور' کھایا جاتا ہے۔ صاحب استطاعت اس چائے میں مکھن بھی ڈالتے ہیں اور ساتھ میں 'شریمال' کھاتے ہیں۔ ایک اور طرح کی چائے بھی کشمیر میں پی جاتی ہے جس کو قہوہ کہا جاتا ہے۔ اس میں مخصوص چائے کی پتی، شکر، بادام، دارچینی اور چھوٹی علاچی ڈالی جاتی ہے۔ خاص موقعوں پر یہ چائے زعفران ڈال کر بنائی جاتی ہے۔ جہاں تک لباس کا سوال ہے پرانے زمانے میں کشمیری پنڈت سر پر پگڑی باندھتے اور فرن کا استعمال کرتے تھے۔ عورتیں بھی لمبے فرن پہنتی تھیں جس کو کمر کے پاس کمربند (لونگی) سے باندھا جاتا تھا اور سر پر مخصوص ٹوپی نما 'ترنگا' پہنتی تھیں۔ انگریزوں کے زیر اثر اس میں تبدیلیاں آئیں اور یورپی لباس کا چلن ہوا۔ آزادی سے قبل فرن کے بدلے ساری استعمال کرنے کے لیے ایک مہم چلائی گئی تاکہ عورتوں کو ساری پہننے کے لیے منوایا جائے۔

مذکورہ بالا تیوہاروں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے موٹے تیوہار ہیں جب کشمیری پنڈت دن بھر فاقہ کرتے ہیں اور دوپہر کے بعد صرف ایک ٹائم کھانا کھاتے ہیں۔ جنم دن پر ہر سال پوجا کی جاتی ہے اور اگر آدمی جنیؤ دھاری ہے تو اس روز نیا جنیؤ پہنا جاتا ہے۔ ایک رسم ایسی بھی ہے کہ پنڈت لوگ اس روز نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ نئے کپڑے پہننے کا رواج 'نورہ' اور شوراتری کو بھی ہے۔ موت کے بعد گھر میں سال بھر سوگ منایا جاتا ہے، ہر روز بچھڑی ہوئی آتما کو دریا کنارے پانی دیا جاتا ہے اور ہر مہینے شرادھ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سال بھر کے بعد یہ شرادھ سالانہ سرانجام دیا جاتا ہے۔ اب تو یہ ساری باتیں قدیم دور کی

داستانیں لگتی ہی۔

۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مولوی یوسف شاہ کو پچھاڑ کر کشمیری مسلمانوں کی رہنمائی کی باگ ڈور سنبھالی۔ آہستہ آہستہ اسے یہ احساس ہوا کہ جموں و کشمیر کی آزادی دوسرے فرقوں کی شمولیت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لیے اس نے پنڈتوں، ڈوگروں اور لداخیوں کو اپنے قریب لانے کی کوشش کی حتی کہ اپنی سیاسی پارٹی 'مسلم لیگ' کو 'نیشنل کانفرنس' میں تبدیل کر دیا۔ دل سے وہ اس نئی سیکولر سوچ کو قبول کر پائے یا نہیں اس کا پتہ اس کی کارروائیوں سے چلتا ہے۔ میں نے کئی بزرگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کہا کرتے تھے کہ میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب کشمیری پنڈتانیاں مسلم اشرافیہ کے گھروں میں نوکرانیوں کا کام کرنے لگیں گی جس طرح آج کل غریب مسلم عورتیں پنڈتوں کے گھروں میں خادماؤں کا کام کرتی ہیں۔ گو میں ایسے کلمات کو مبالغہ آرائی سمجھتا ہوں اور ان پر کان نہیں دھرتا تاہم اس فقرے میں شیخ صاحب کے وتیرے کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ ان کی سوانح عمری 'آتشِ چنار' کا، جو ہم زاد مصنف کی رقم کردہ ہے، بغور جائزہ لینے سے ان کی یہ کج ذہنی کسی حد تک سامنے آتی ہے۔ ظالم کو ظالم کہنا میں برا نہیں سمجھتا مگر ایسے برگزیدہ رہنما سے امید کی جاتی ہے کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت ساری ریاست کی بھلائی کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہے اور انسانوں کے بیچ کوئی فرق نہ کرے۔ ایک معتدل رہنما کے لیے یہ پرکھنا ضروری ہے کہ کسی قوم یا فرقے کو قلم زد کرنے سے پہلے تاریخ کے سبھی اوراق پلٹ کر دیکھ لے کہ کہیں وہ قوم یا فرقہ بھی کبھی ایسی ہی تاناشاہی کا شکار تو نہیں ہوا تھا۔ تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جب بھی کسی گروہ کے ہاتھ عنانِ حکومت آئی ہے، اس نے دوسرے فرقوں پر جبر و تشدد روا رکھا ہے۔ طاقت انسان کو اندھا بناتی ہے۔ بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جب حکمرانوں نے عدل و انصاف کا پرچم لہرایا اور اپنا نام تاریخ میں سنہری الفاظ میں نقش کیا۔

شیخ محمد عبداللہ کی غیر مستحکم سیاست سے نہ صرف جموں و کشمیر کے ہندو بلکہ کشمیری مسلمان بھی بدظن ہو گئے۔ سیاسی انتشار کے باعث کشمیر میں کوئی صنعت کار سرمایہ لگانے کو تیار نہ ہوا۔ پبلک سیکٹر انڈسٹریز کرپشن کے سبب یا تو دم توڑ گئیں یا پھر خزانہ عامرہ پر بوجھ بن گئیں۔ اس لیے کشمیریوں کے روزگار کا واحد وسیلہ گورنمنٹ نوکریاں بن گئیں۔ کشمیری پنڈت چنانچہ علم حاصل کرنے اور ڈگریاں لینے کو ہمیشہ

ترجیح دیتے رہے اس لیے انتظامیہ میں ان کا پلڑا بھاری رہا جو پس آزادی دوسرے فرقوں کی آنکھ کا کانٹا بن گیا اور اس حوالے سے کشمیری پنڈتوں پر الزامات لگائے گئے۔ مگر کسی نے اس بات کو کبھی اجاگر نہیں کیا کہ سرکار نے سرمایہ کاری کے لیے جو امداد فراہم کی، جو قرضے مہیا کیے اور ڈیولپمنٹ کے نام پر جو کچھ صرف ہوا، کشمیری پنڈتوں کی جھولی میں اس کا برائے نام حصہ آ گیا۔ کشمیری پنڈت اگر سرمایہ کاری کرنا بھی چاہتا تو ریاستی فیتہ شاہی اور عدم استحکام اس کو روک لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری پنڈت ہندوستان کی دیگر ریاستوں کا رخ کرتے رہے اور اس طرح ایک خاموش ہجرت وقوع پذیر ہوئی۔

کشمیری پنڈتوں کی ہجرت پس آزادی کی ہی دین نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی کئی بار ان کے قافلوں نے گنگا جمنی دوآب کی طرف رخ کر لیا تھا۔ کشمیری پنڈتوں میں ایک قصہ بڑا عام ہے کہ ایک مرتبہ کسی ظالم حکمران نے اس فرقے پر اتنا ظلم ڈھایا کہ بہت سارے لوگ مذہب تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے جبکہ کچھ اور وادی چھوڑ کر بھاگ گئے یہاں تک کہ کشمیر میں صرف گیارہ کنبے بچ گئے جو ظلم سہتے رہے اور جزیہ و بھاری ٹیکس ادا کرتے رہے۔ جب حالات سدھر گئے ان گیارہ کنبوں نے دوبارہ نئی بستیاں آباد کر لیں۔ اردو کے معروف ادیب، انور شیخ نے اپنے شعری و افسانوی مجموعے ’آگ اور پانی‘ میں ’گورو تیغ بہادر کی شہادت‘ کے عنوان سے ایک طویل نظم قلم بند کی ہے جس میں اورنگ زیب کے زمانے میں پندرہ برہمنوں کی قیادت کرتے ہوئے پنڈت کرپا رام دت گورو تیغ بہادر کے حضور میں کشمیری پنڈتوں کی ہجرت اور صعوبتیں بیان کرتا ہے:

گرو جی! میں بیاں کیسے کروں کشمیر کی حالت   ازل سے جو رہا ہے اک درخشاں مہد روحانی
یہی وہ سرزمیں رشیوں کی ہے اے مردِ فرزانہ   ہیں جن کی کاوشوں پر منحصر اقدار انسانی
مگر فرماں روائے ہند نے اب دے دیا فتویٰ   کہ یہ ہندی مذاہب ہیں سراسر فعل شیطانی
کرو سب ترک دیں اپنا یہ فرمانِ شہنشاہی   سزا ہے سرکشی کی موت، بربادی و رسوائی

(انور شیخ، شعری و افسانوی مجموعہ ’آگ اور پانی‘، ناشر دی پرنسپلٹی پبلشرز، کارڈف، یوکے)

آزادی کی جدوجہد اور فرقہ وارانہ فسادات کے دوران مہاتما گاندھی کو صرف کشمیر ہی ایک ایسی ریاست ملی جہاں اس کو مذہبی رواداری کی کرن نظر آئی۔ المیہ یہ ہے کہ اس نے اس کرن کو بہت قریب سے

دیکھنے اور پرکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ حقیقت ہے کہ کشمیر میں بٹوارے کے وقت فرقہ وارانہ فسادات بہت کم ہوئے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہاں کے لوگ مذہبی جنون سے عاجز تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشمیری بذاتہ امن پسند ہیں اور قتل و غارت سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس زمانے میں دیگر میدانی علاقوں کی نسبت کشمیر کی اکثریت نے سچ مچ صبر و تحمل کی ایک اعلیٰ مثال قائم کر لی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہاں کی لیڈر شپ نے جناح اور مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کو مسترد کر کے گاندھی اور کانگریس کے سیکولر نظریے پر لبیک کہا تھا جس میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اپنے بزرگوں سے ہم نے قبائلی حملے کے دوران بارہ مولہ اور گرد و نواح میں ہوئی لوٹ مار اور بہیمیت کی دلسوز کہانیاں سنی ہیں مگر یہ سب ان لوگوں کی دین تھیں جو وادی سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور پاکستانی صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) سے داخل ہوئے تھے۔ اس کے برعکس کشمیری نوجوان متحد ہو کر اپنی دھرتی کی حفاظت کے لیے سینہ بہ سپر ہوئے تھے۔ اس دور میں کشمیری جانباز مقبول شیروانی کی شہادت کسی مصلوبی عمل یا گلوٹین سے کم نہ تھی کہ قبائلیوں نے اس کے بدن میں آہنی میخیں ٹھوک کر درخت کے ساتھ لٹکا دیا تھا۔

بدقسمتی سے آزادی کے بعد جموں و کشمیر کے ماحول پر اتنی سیاسی گلٹ چڑھی کہ اس کی اصلیت مسخ ہو کر رہ گئی۔ کشمیر ایک مستقل تنازعہ ابھر کر سامنے آگیا۔ دوسری جانب ملک کی دیگر ریاستوں میں فرقہ وارانہ جھڑپوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو یہاں کی سیاست پر کافی اثر انداز ہوا۔ مختلف سیاسی جماعتوں نے اپنا الو سیدھا کرنے کی غرض سے مذہبی تعصب کو ہتھیار بنا لیا اور کشمیری مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو تحفظ حاصل نہیں، اس لیے کشمیر کو ہندوستان سے الگ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے ریاست کے الحاق پر سوالات اٹھائے اور دھیرے دھیرے اس آگ کو سلگانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان شراروں کو شعلے بننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ نتیجے میں ان سیاسی پینترے بازوں نے ہندوؤں کو اپنی نفرت کا نشانہ بنا لیا اور ریاست میں ان کے خلاف نفرت کی آگ پھیلا دی۔ اُدھر عرب اسرائیل جنگ ہوتی، اِدھر کشمیر میں جلوس نکلتے، بستیاں جلتیں اور عورتوں کی بے حرمتی ہوتی؛ اُدھر یورپ میں کفر کا ارتکاب ہوتا، اِدھر کشمیر میں دھنگے بھڑک اٹھتے اور گرجا گھروں کو نذرِ آتش کیا جاتا؛ اُدھر جنرل ضیاالحق کے دورِ حکومت میں ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستانی سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق پھانسی دی جاتی، اِدھر کشمیر

میں جنرل ضیا کے خلاف جلسے جلوس نکلتے، اس کے پُتلے جلائے جاتے اور آگ زنی کی وارداتیں ہوتیں اور پھر جب طیارے کے گرنے کے سبب اسی جنرل ضیاالحق کی موت واقع ہوئی تو کشمیر میں اس وقت بھی نعرے بازی، لوٹ پاٹ اور ہڑتالیں ہوئیں۔ غرض یہ کہ کشمیریوں کو ہڑتال کرنے یا جلوس نکالنے کے لیے محض بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تو خیر معاملہ اور بھی سنگین ہو چلا ہے۔

کشمیری پنڈتوں کی ہجرتیں ان کو پنجاب، ہماچل، دہلی، اتر پردیش، مدھیہ پردیش یہاں تک کہ کرناٹک تک لے گئیں۔ لکھنؤ اور الہ آباد کے کئی معزز گھرانے جیسے نہرو، کاٹجو، سپرو، مُلّا وغیرہ آزادی کی جدوجہد کے دوران کافی مشہور ہو گئے۔ کشمیری پنڈتوں نے بڑے بڑے شاعر اور نثر نگار پیدا کیے ہیں جنھوں نے دہلی، اودھ، بھوپال اور دوسرے سلاطین کے درباروں میں اعلیٰ مرتبے حاصل کیے۔ اکثر کشمیری پنڈت مجرد زندگی کے پرستار ہیں، انفرادیت کو اجتماعیت پر فوقیت دیتے ہیں اور کھل کر سماجی میل جول سے کتراتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے آپ کو انٹلکچول اور جگت استاد سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں باہمی ربط (Cohesion)، لگاؤ، وابستگی اور برادری برائے نام بھی نہیں ملتی۔ بڑے بڑے شہروں میں انھوں نے آپس میں میل جول رکھنے کی کوشش تو کی مگر کئی جگہوں پر دو فرقے صاف طور پر دکھائی دینے لگے۔ ایک وہ جن کی دو چار پیڑھیاں ان شہروں میں رہ چکی تھیں اور 'پرانے کشمیری' کہلائے اور دوسرے 'نئے کشمیری' جو بٹوارے کے بعد نوکریوں کی تلاش میں ان شہروں میں آ کر بس گئے۔ پرانے کشمیری نہ تو کشمیری زبان بول پاتے ہیں اور نہ ہی ان کو کشمیر اور کشمیری رسم و رواج کے بارے میں زیادہ آگہی ہے۔ اس کے برعکس نئے کشمیری ابھی بھی کشمیری رہن سہن اور طور طریق کو حتی الامکان اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے ایک دو گھر ہندوستان کے ہر شہر میں ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء کی آخری ہجرت کے بعد وہ ہندوستان کے باہر امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل چکے ہیں اور وہاں اپنے لیے اچھا مقام بنا چکے ہیں۔ اپنے ماحول سے دور، اپنے ورثے سے کٹے ہوئے، اپنی دھرتی سے اکھڑے ہوئے یہ لوگ غیر یقینیت اور غیر محفوظیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ دربدر بھٹکتے ہوئے ان لوگوں کی جڑیں اپنی دھرتی سے کٹ چکی ہیں۔ کچھ بے سرمایہ لوگ اب بھی اپنی دھرتی میں جمے ہوئے وقت کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر رہے ہیں حالانکہ تیز و تند ہواؤں کے جھونکے ان کو آہستہ آہستہ اُکھاڑ

پھینک دیں گی۔ بقول پروین شاکر:

بے وطن کہلائے اپنے دیس میں
اپنے گھر میں رہ کے بے گھر ہو گئے

کئی لوگ کشمیری پنڈتوں کا تقابل یہودیوں سے کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے کیونکہ یہودیوں نے جس باہمی رواداری، لچک اور ابھرنے کی قوت کا مظاہرہ کیا ہے وہ پنڈتوں میں مفقود ہے۔ پنڈتوں اور یہودیوں میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ پنڈت برہمن ہیں، پوتھی پڑھ پڑھ کر گیانی بنے ہیں، جسمانی محنت اور لڑائی جھگڑے سے گھبراتے ہیں، آپسی رغبت اور انس دیکھنے کو بھی نہیں ملتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک کشمیری پنڈت کو دوسرا کشمیری پنڈت ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ دوسرے پنڈت کو اپنا بھائی نہیں اپنا حریف سمجھتا ہے۔ ہر شخص خود کو دوسرے سے کہیں زیادہ عقل مند گردانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم کبھی منظم نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس یہودیوں نے دنیا میں سائنس، تجارت، سرمایہ کاری اور دیگر میدانوں میں عالمی سطح پر نام کمایا ہے اور صدیوں سے زمانے کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ قوم پوری دنیا میں بکھر کر منتشر ہو چکی تھی۔ ہٹلر نے ان کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، پھر بھی وہ ڈٹے رہے اور اپنی قومیت اور اپنی شناخت کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے یہودی کہلائے اور ان کی انہی کاوشوں کے سبب اسرائیل وجود میں آ گیا اور دنیا بھر کے یہودی ایک ہی جگہ پھر یکجا ہو گئے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ سارے عالم میں یہودیوں کا طوطی بول رہا ہے۔ اس تناظر میں جگن ناتھ آزاد کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اپنے وطن سے ایک نکلنے کی دیر تھی
پھر جس جگہ بھی پاؤں تھکے وہ وطن ہوا

☆☆☆

بچپن جو کہیں کھو گیا

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور سرینگر، کشمیر کے ایک گنجان آبادی والے محلے 'وازہ پور' کی تنگ و تاریک گلیوں میں پل بڑھ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ البتہ اس ماحول میں جو اپنائیت تھی، جو خلوص تھا وہ دہلی کے ائیر کنڈیشنڈ فلیٹوں میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ محلّہ کشمیری مسلم طباخوں کا محلّہ ہے جسے دنیا بھر میں 'وازہ وان' (Wazawan) کی وجہ سے شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ کشمیر کا سب سے بڑا تھوک بازار مہاراج گنج اس محلے سے تھوڑی دوری پر ہے۔ اس بازار کے کھنڈر آج بھی اپنی پرانی عظمتوں اور رعنائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جن دنوں ہاری پربت قلعے میں لشکروں کی گہما گہمی ہوا کرتی تھی، مہاراج گنج (سری رنبیر گنج) کی رونق دیکھتے ہی بنتی تھی یہاں تک کہ عورتیں سر بازار چلنے سے کتراتی تھیں۔ زین العابدین 'بڈ شاہ' اور اس کی ماں کا شہرت یافتہ گنبدوں والا مقبرہ اسی علاقے میں واقع ہے جبکہ کچھ دوری پر عالی کدل اور بلبل لنکر ہے جہاں بلبل شاہ کا مزار ہے۔

وازہ پور کی اپنی ایک انفرادی شناخت ہے۔ کشمیری میں 'وازہ' طباخ کو کہتے ہیں اور یہاں پر مسلم طباخوں کی اکثریت ہے۔ ہندوؤں کے صرف بیس گھر تھے۔ چونکہ طباخوں کے پیشے کو ہندو سماج میں بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے شاید اسی لیے ہمارے بزرگوں نے اپنی سکونت وازہ پور کی بجائے ملحق محلّہ 'کرالہ ٹینگ' لکھ دی تھی اور اس طرح دستاویزوں پر میرے ایڈریس میں وازہ پور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مکان کے ارد گرد دور دور تک طباخوں کے بغیر اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ سامنے کی طرف محلّہ کرالہ ٹینگ تھا اور اس سے آگے شیخ محلّہ۔

کشمیر میں فن طباخی مخصوص مسلم گھرانوں تک محدود ہے اور اکثر باورچی اسی علاقے میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کو 'وازہ پور' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شادی، شادمانی، نذر و نیاز اور

عشائیوں کے موقعوں پر کشمیری مسلمان لذیذ ضیافتوں یعنی ’وازہ وان‘ (وازہ: طباخ؛ وان: دُکان) کا اہتمام کرتے ہیں جس کے لیے انہی ماہرین طعام کی خدمت لی جاتی ہے۔ ہوٹلوں کا جال بچھ جانے کے بعد اور بیرونی ممالک میں ’وازہ وان‘ کی تشہیر ہونے کے بعد ان ماہرین کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ اب تو خیر وازہ وان دنیا بھر میں مقبول ہو چکا ہے جس کے باعث یہ ہنر آج بھی قائم ودائم ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ وازہ وان میں گوشت خوروں کے لیے پکوانوں کا ایک لمبا سلسلہ دستیاب رہتا ہے جبکہ سبزی خور تماشائی بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کشمیر میں روٹی کی جگہ چاول کا چلن عام ہے۔ اتنا ہی نہیں یہاں بکری کے بدلے بھیڑ کا گوشت استعمال ہوتا ہے۔ پکوان بنانے کے لیے بہت محنت درکار ہوتی ہے۔ گوشت کو کوٹنے میں دو تین گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ شادیوں کے موسم میں ان باہنر باورچیوں کی بڑی مانگ رہتی ہے۔ مسلمانوں میں چار آدمی اکٹھے ایک ہی جہازی پلیٹ (ترام) میں کھانا کھاتے ہیں۔ دستر خوان بچھانے کی دیر ہوتی ہے کہ رِستہ، طبخ ماز، روغن جوش، کباب، مرغ مسلم، اور گشتابہ جہازی پلیٹ میں ترتیب وار پروسا جاتا ہے۔ مسلمان باورچی زیادہ لال مرچیں اور سرسوں کا تیل استعمال نہیں کرتے۔ لال مرچ کے بدلے وہ سوکھے تاج خروس (Cockscomb) استعمال کرتے ہیں جو آب گوشت میں اپنا لال رنگ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو پکوان گوشت خوروں اور سبزی خوروں کے لیے یکساں ہوتے ہیں مگر ان میں تیل، مرچ اور دیگر مصالحوں کی بہتات ہوتی ہے۔ سبزی خوروں کے لیے پنیر، کڑم/ساگ، ندرو (کمل ککڑی)، دم آلو، کھٹے بینگن، آچار اور چٹنیاں وغیرہ تھالی کی زینت بن جاتے ہیں جبکہ گوشت خوروں کے لیے روغن جوش، قلیہ، طبخ ماز، کوفتہ، کھٹا جگر اور یخنی وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ہندو الگ الگ تھالیوں میں کھانا کھاتے ہیں اور ان کی شادیوں میں بہت سارا کھانا ضائع ہو جاتا ہے۔ ہندو باورچی زیادہ تر جبہ کدل کے آس پاس رہتے تھے۔

وازہ پور کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ یہ ’بکروں‘ کا اینکلیو ہے۔ جتنے بھی طباخ یہاں رہتے ہیں سب کے سب ’بکرا‘ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگ جو مولوی صاحب کے مرید ہیں بکرے کہلاتے ہیں۔ ’شیر‘ اور ’بکرا‘ کی تفریق تقسیم ملک سے بہت پہلے کا قصہ ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں کشمیری مسلمانوں کو مولوی یوسف شاہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد کرنے کی کوشش

کر رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ جب علی گڑھ سے پڑھائی کر کے لوٹے تو من موافق نوکری نہ ملنے کے سبب مہاراجہ کے خلاف بغاوت پر اتر آئے اور مسلم لیگ کے ممبر بن گئے۔ آہستہ آہستہ انھیں اپنی تنظیمی صلاحیتوں کا احساس ہوا، اس لیے مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف آواز بلند کی اور اس طرح کشمیر کی جنگِ آزادی کا بگل بجا دیا۔ ایک تو خوش الحانی اور اس پر قرائتِ قرآن پر مکمل قدرت........! لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا، 'شیر کشمیر' کے لقب سے نوازا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان پر مر مٹنے کو تیار ہو گئے۔ اس شور و غل میں مولوی یوسف شاہ کی آواز دب کر رہ گئی۔ ان کو اپنا سنگھاسن ڈولتا نظر آیا۔ نتیجتاً دونوں کے درمیان ایسی ٹھن گئی کہ تلواریں میان سے کھینچی گئیں۔ وہ لوگ جو مولوی یوسف شاہ کے ساتھ جڑے رہے، مولوی کی ڈاڑھی کی مناسبت سے 'بکرے' کہلائے اور جو لوگ شیر کشمیر کے پیرو کار بن گئے وہ 'شیر' کہلائے۔ شیر بکرے کی یہ تفریق کشمیریوں کے لیے ایک مستقل ناسور بن گیا۔

میں نے اپنی بنیادی تعلیم گھر کے پاس ہی ایک جبری سکول میں حاصل کی جس کا نام گانی آٹ منز پرائمری سکول تھا۔ محلے کا ایک لڑکا شبن کرشن کول عرف کتال اس سکول میں پڑھنے کے لیے جاتا تھا۔ ایک روز اس نے میرے گھر والوں سے کہا کہ مجھ کو بھی سکول بھیج دیا کریں۔ سو انھوں نے مہورت نکال کر میرا داخلہ سکول میں کروایا۔ ہم دونوں پانچویں جماعت تک اس سکول میں جاتے رہے۔ شبن کے ساتھ میری دوستی قریباً تیس سال تک رہی پھر ملازمت کے سبب دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ آج بھی جب وہ ملتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

سکول کیا تھا ایک جھر جھر بھوت بنگلہ تھا جو باہر سے ایسا لگتا تھا کہ اگر زوردار زلزلے کا جھٹکا آجائے تو دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔ پرانی لکھوری اینٹوں کا بنا ہوا مکان، گھاس پھوس کی چھت جس پر مٹی بچھی ہوئی تھی اور سبزہ اُگا ہوا تھا، ٹوٹی پھوٹی کھڑکیاں و دروازے اور دیواروں سے مٹی کا پلستر جگہ جگہ سے اترا ہوا جس کو بچے مزید کھرچ کر کھا لیتے تھے۔ اینٹیں بھی کہیں کہیں اکھڑی ہوئی تھیں جن میں چڑیوں، میناؤں اور کبوتروں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ دائیں بائیں کہیں کوئی سبزہ نظر نہیں آتا تھا۔ سکول بلڈنگ کے سامنے ایک بڑا سا صحن تھا جس میں ہم بچے ریسس کے وقت کھیلا کرتے تھے۔ کھیلتے کم اور دھول زیادہ اڑایا کرتے تھے۔ سکول میں میز تھی نہ کرسیاں۔ ہم لوگ گلی سڑی ٹاٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ہیڈ ماسٹر کا نام محمد یٰسین صاحب تھا۔ بہت ہی نیک انسان تھے۔ مجھے خاص طور پر ان کا دست شفقت حاصل تھا۔ انھوں نے میری تعلیم میں خاصی دلچسپی لی اور میرے رسم الخط کو سنوارنے میں کافی یوگدان دیا۔ سکول میں ہمیں اردو، انگریزی اور حساب پڑھایا جاتا تھا جس کے باعث میں نے اردو اور انگریزی کے حروف تہجی، کتاب سے سبق پڑھنا اور تختیوں پر اردو اور انگریزی کے فقرے لکھنا سیکھ لیا۔ چونکہ پتاجی کی اخروٹ کی لکڑی کے سامان اور پیپر ماشی کی دکانیں تھی اس لیے وہ میرے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رنگین تختیاں بنوا دیتے۔ کشمیر میں تختیوں پر لکھنے کے لیے مخصوص کھریا مٹی (سیف) اور نرکل کے قلم، جنھیں تراشنا بھی ایک ہنر تھا، ملتے تھے۔

لوگ ان سکولوں کو حقارتاً ‘جبری زٹ’ کہتے تھے یعنی جبری تعلیم کے بوسیدہ سکول۔ دراصل یہ سکول ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کشمیری مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے قائم کیے تھے کیونکہ ان میں تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح بہت کم تھی اور وہ اپنی مرضی سے سکول جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ان کو جبراً سکول لے جانے کی سکیم تیار کی گئی تھی تاکہ ریاست میں ناخواندگی کی شرح کم ہو جائے۔ یہ سکول خیراتی تھے اور ان میں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے تعلیم مقبول خاص و عام ہو گئی مگر ایسے سکول پھر بھی ‘جبری سکول’ کے لیبل کے تحت ہی چلتے رہے۔

نومبر ۱۹۵۵ء میں سوویت یونین کے دو اہم لیڈر، نکولائی بلگانن اور نکیتا کرسچوف کشمیر آئے اور ہم سب بچوں نے، ہاتھوں میں حریری ترنگے لیے، جہلم دریا کے کنارے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ خیر مقدم کرنے کا وہ منظر میری آنکھوں میں آج بھی تازہ ہے۔ جہلم کے دونوں کنارے لوگوں کی بھیڑ سے اٹے پڑے تھے۔ جس کسی نے وہ منظر دیکھا ہوگا وہ آج کی ویران بستی پر تعجب کرتا ہوگا۔

بدقسمتی سے اس سکول کا ماحول اتنا کثیف تھا کہ ہم سبق سیکھنے سے زیادہ گالیاں سیکھ کر آتے تھے۔ اس لیے میرے والدین مجھے کسی پرائیویٹ سکول میں داخل کرانے کے کوشاں تھے لیکن اچھے پرائیویٹ سکول بہت دور تھے اور آنے جانے کا کوئی سادھن نہیں تھا۔ گالیوں کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی میں بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتا اور وہ میری گالیاں سنتے ہی کانوں میں انگلیاں دیتے۔ چند اور کجرویاں جو سکول اور اڑوس پڑوس میں رائج تھیں، وہ تھیں اغلام بازی، مشت زنی اور ڈاکٹر نرس کا کھیل کھیلنے کی۔ دوستی

کا دائرہ بھی کچھ ایسا ہی میسر تھا کہ وہ ان کجرویوں اور سگریٹ نوشی میں فرحت محسوس کرتے تھے۔ کئی بار مجھے ان حماقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن میرے پتاجی کی رہنمائی میرے آڑے آئی۔ انھوں نے مجھے چھوٹی عمر ہی میں ایسی ممکنات سے آگاہ کیا تھا جس کے باعث میں ہمیشہ چوکنا رہتا تھا تاہم جلق سے نہیں بچ پایا۔ بچپن میں خوب مستیاں کیں، ان دنوں لاٹری کا بڑا رواج تھا اس لیے ہم بھی لاٹری کے پتے خرید کر بیچتے یا پھر خود ہی گھر پر بنا لیتے، اس حوالے سے آپس میں خوب لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ کھیل کود میں کنچا، سز لونگ یا ہاپوٹاپو (Hopscotch)، گلی ڈنڈا، پٹھو گرم، کھوکھو، چھپم چھپائی، سز گتہ (ٹھیکریوں کا کھیل) اور پونسہ گتہ (پیسوں کا کھیل) وغیرہ کا رواج عام تھا۔ آخر الذکر دو کھیلوں میں گول ترشی ہوئی ٹھیکریوں یا ریز گاری کو کچھ دوری سے چھوٹے سے سوراخ میں ڈالنا مطلوب ہوتا تھا اور جو جتنے ڈال لیتا تھا وہ اتنے جیتتا تھا۔ کہیں کہیں پر تاش کے پتوں کے چند کھیلوں جیسے مونگہ پتہ (مانگ پتا)، ترپ، رمّی اور تین پتی کا بھی رواج تھا، اول الذکر سے تو میں نے عمر بھر گریز کیا، ترپ اور رمّی کبھی کبھار کھیلتا تھا البتہ تین پتی کے چکر میں دسویں جماعت کے دنوں میں پھنس گیا اور یہ عادت بہت دیر تک میرے ساتھ رہی۔ شکر یہ تھا کہ ہماری یہ عادت ضرر رساں نہ تھی کیونکہ ہم جوا اپنی حیثیت کے مطابق ہی ریز گاری سے کھیلتے تھے اور کبھی زیادہ داؤ نہیں لگاتے تھے۔ بس دن میں چار پانچ روپے کا ہیر پھیر ہو جاتا تھا۔ کرکٹ کا کھیل بھی ہمیں اچھا لگتا تھا، گھر کے باہر صحن میں کھیلا کرتے تھے لیکن بعض اوقات عیدگاہ اور ہاری پربت بھی کرکٹ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ چند پڑوسیوں کو ہمارا آنگن میں کرکٹ کھیلنا اچھا نہیں لگتا تھا اور وہ ہمیں ہر بار بھگانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ ہم ہمدانیہ سکول سے واپس آ رہے تھے کہ ریڈیو پر سنا کہ راما کانت ڈیسائی نے محمد حنیف کو صفر پر بولڈ آوٹ کر لیا تھا، ہمارے سینے چوڑے ہو گئے مگر آس پاس ماتم پسرا ہوا تھا۔ وہاں تو یہ حال تھا کہ پاکستان کے کسی کرکٹر نے سنچری بنائی نہیں تو لوگ تہری بانٹنے کے لیے باہر نکل آتے تھے۔

میری ایک اور عادت میرے والد کو ہمیشہ پریشان کرتی تھی۔ میں جہاں بھی بیٹھ جاتا تھا کسی نہ کسی توڑ پھوڑ میں لگ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ماچس کی ڈبیا ہاتھ لگ جاتی تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا اور ایک ایک کر کے ان ٹکڑوں کو بکھیر دیتا۔ نفسیاتی طور پر اسے تجزیاتی فطرت کہیے یا پھر تخریبی فطرت۔

میرے پتاجی کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا تھا اور انھوں نے مجھے کئی بار تنبیہ بھی کی۔ شاید اسی فطرت کے سبب میں نے مستقبل میں اپنی زندگی کو بھی پراگندہ کرلیا۔ زندگی میں بہت کچھ بنالیا اور اس سے زیادہ تباہ کرلیا۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو خود پر ہنسی بھی آتی ہے اور ترس بھی۔

غالباً ۱۹۵۷ء کے جاڑوں کا موسم تھا کہ میرے والد تجارت کی غرض سے دہلی چلے گئے اور اپنے بال بچوں کو جموں میں نہر کے پاس صراف صاحب کے گورنمنٹ بنگلے میں چھوڑ گئے۔ کشمیر سے باہر جانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ جاتے وقت جواہر ٹنل (بانہال ٹنل) کھلی نہیں تھی اس لیے پرانے راستے سے پیر پنچال پہاڑیاں عبور کرنا پڑیں۔ ہوائیں اس زور سے چلتی تھیں کہ گاڑیاں بھی ہلنے لگتی تھیں اور لوگ من ہی من میں خدا کو یاد کرنے لگتے تھے۔ دیکھتے ہی وحشت طاری ہوجاتی تھی۔ تاہم آتے وقت ہم لوگ جواہر ٹنل سے آئے جو ایک عجوبہ سا لگ رہا تھا۔ بانہال کو قاضی گنڈ سے جوڑنے والی ۲.۸۵ کلومیٹر لمبی اس سرنگ نے جموں و کشمیر کے رسل ورسائل میں ایک انقلاب لایا۔ تاہم جب کبھی موسم سرما میں جموں کشمیر کی شاہراہ بند ہوجاتی ہے تو کشمیر میں قحط کا سا سماں پیدا ہوتا ہے۔ اشیائے خوردنی، سبزی، ایندھن اور گوشت کے نرخ آسمان کو چھونے لگتے ہیں۔ میں کبھی حیران ہوتا ہوں کہ لداخ میں راستے تقریباً چھ مہینے کے لیے بند ہوجاتے ہیں اور وہ لوگ کس طرح گزارا کرتے ہوں گے۔ ائیر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والے ہمارے حکمران ان مسئلوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیتے۔ انھیں صرف اپنے عیش و آرام کی فکر لگی رہتی ہے۔

پانچویں کے بعد میں، شبن اور محلے کے دو اور دوست پران اور مہاراج گورنمنٹ ہمدانیہ ہائی سکول نواکدل میں تعلیم پانے لگے۔ چاروں ایک ساتھ سکول جاتے، کھیل کود میں ایک ساتھ رہتے اور اگر کوئی لڑنے بھڑنے کی کوشش کرتا تو ایک ساتھ اس کا مقابلہ کرتے۔ اچھی چوکڑی بن گئی تھی ہماری۔ ہمدانیہ سکول باقی گورنمنٹ سکولوں خصوصاً رنگ ٹینگ سکول سے قدرے بہتر تھا۔ پتاجی کے کہنے پر میں نے اردو کے بدلے ہندی اختیاری مضمون لے لیا، حساب، سائنس وغیرہ انگریزی کے ذریعے پڑھتے رہے، صرف سوشل سٹڈیز اردو میں پڑھائی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ آٹھویں بورڈ امتحانات تک یوں ہی چلتا رہا جس کے بعد میں ڈی اے وی ہائیر سیکنڈری سکول چلا گیا جہاں اردو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا حتیٰ کہ جو کچھ معلوم تھا وہ بھی بھول گیا۔ شبن کشن کول کے ساتھ میری دوستی کافی دیر تک قائم رہی یہاں تک کہ بے روزگاری کے

دنوں میں مجھے اس کے ساتھ اس کی بہن کے گھر جنک پوری، دہلی میں ایک ماہ کے لیے رہنا پڑا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ شبن یتیم تھا مگر بہت ہی ذہین تھا، گریجویشن کر کے پڑھائی ترک کر لی۔ اس کے سوتیلے بھائی نے، جو پرائمری سکول میں استاد تھا، اس کو اور اس کی سگی بہنوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا مگر شبن اس کے لاڈ پیار کی قدر نہ کر سکا۔ گریجویشن کر کے دہلی چلا گیا اور وہاں اپنی سگی بہن کے پاس رہنے لگا۔ ایک اچھی نوکری ملی، پھر ایم ڈی آئی میں چلا گیا اور وہاں نہ جانے کیا بھوت سوار ہو گیا کہ نوکری چھوڑ کر دہلی میں اپنا پرنٹنگ پریس کھول لیا۔ تب تک میرا اس سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا اور پھر سننے میں آیا کہ بزنس میں خسارہ ہونے کے سبب وہ دبئی چلا گیا تھا اور وہاں کچھ سال رہ کر واپس چلا آیا۔

ہمدانیہ سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران دو تین حادثات پیش آئے جن کو بیان کرنا ناگزیر سمجھتا ہوں۔ سکول جہلم دریا کے کنارے واقع تھا۔ ایک روز دسویں جماعت کے ایک طالب علم نے چرس پی کر سکول کی دیوار پھاند لی اور دریا میں تیرنے کے لیے چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔ یہ حادثہ سکول کی تاریخ میں ایک بدنما داغ بن کر رہ گیا۔ اسی زمانے میں مجھے سگریٹ پینے کی لت لگ گئی۔ ایک روز میں اپنے پڑوسی دوست کے ساتھ جا رہا تھا کہ اس نے کسی کی پھینکی ہوئی سلگتی سگریٹ اٹھالی جس کو ہم دونوں پینے لگے۔ رُخ گھر کی جانب تھا کہ سامنے سے میری ماں آگئی۔ پھر گھر میں کیا حال ہوا ہوگا اس کا اندازہ خود ہی لگا لیجیے۔ اس کے بعد شبن اور میں کبھی کبھار سگریٹ خرید کر پی لیتے تھے۔ سکول میں ایک ہم جماعت تھا موہن سنگھ۔ اس کا باپ کسی سگریٹ کی دکان پر خدمتگار کا کام کرتا تھا۔ وہ گاہ بہ گاہ چپکے سے سستی بلبل یا نمبر تین سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر سکول لے آتا تھا اور ہم سکول سے فارغ ہو کر نوا کدل گرلز کالج کی گلی میں گھس جاتے تھے اور سگریٹ پیا کرتے تھے۔ یہ عادت آہستہ آہستہ میرے ساتھ مستقل طور پر چپک گئی۔

دو اور حادثات کا ذکر کر رہا ہوں جن کا سکول کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ میری بیوہ پوپھی کا سسرالی کنبہ مشترکہ تھا جو تقریباً تیس افراد پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ڈونگے (بڑی کشتی) میں کھیر بھوانی جانے کا فیصلہ کر لیا اور پوپھی میری ماں سے اجازت لے کر مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ واپسی پر جہلم میں ایسی طغیانی آگئی کہ دریا سمندر کی شکل اختیار کر گیا۔ ہمارا ڈونگا شادی پور سنگم کے قریب پہنچ گیا۔ سیلاب دیکھ کر

نہ صرف سواریاں بلکہ ملاح بھی پریشاں ہوگئے۔ میری پوپھی کی پریشانی اس لیے بھی بڑھ گئی کیونکہ میں اس کے بھائی کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کو میری ماں کے جلال کا اندازہ تھا۔ کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ خیر دو روز صبر کر کے دریا کا پانی اُتر گیا اور ملاح ہمارے ڈونگے کو کسی طرح سرینگر پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

والدین نے اپنے آبائی مکان کی نئی تعمیر شروع کردی اور ہر سال نیچے سے ایک ایک منزل بنتی رہی جس کے بارے میں دوسری جگہ ذکر آئے گا۔ پہلی منزل بن چکی تھی۔ ہم سب پڑوسیوں کے یہاں شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے چلے گئے۔ بجلی گُل ہونے کے سبب وہاں پر پٹرومکس روشن کیے گئے تھے۔ ہم تین چار بچے ایک پٹرومکس کے پاس کھڑے شرارتیں کرنے میں مگن تھے کہ کسی کے منہ سے دفعتاً نکلا، ''دیکھو آگ لگ گئی، دیکھو آگ لگ گئی۔'' اسے پیش آگاہی کہیے یا کچھ اور، چند ہی لمحوں میں باہر شور وغل مچ گیا کیونکہ کچھ مکانوں کے فاصلے پر ایک مکان سے، جو پشمینہ تاجروں کا تھا، شعلے اٹھ رہے تھے۔ سبھی لوگ گھبرا کر گلیوں میں نکل آئے۔ میں، میری ماں اور میری بہنیں دوڑ کر گھر پہنچے۔ آسمان آگ کی لپٹوں اور دھوئیں سے ڈھک گیا تھا۔ میری ماں جذباتی تو تھیں ہی، آنگن میں بیٹھ گئیں اور سینے پر دوہتڑ مارتی ہوئیں رونے بسورنے لگیں۔ محلے میں مکانات ایک دوسرے سے سٹے ہوئے تھے اور آگ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ فائیر بریگیڈ کی گاڑیاں یکے بعد دیگرے چلی آ رہی تھیں مگر تنگ گلیوں کے باعث انھیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آگ پر کیسے قابو پالیا جائے۔ علاوہ ازیں انھیں ہائیڈرنٹ (Hydrant) نہیں مل رہا تھا جہاں سے پانی کھینچا جا سکتا تھا۔ آخر کار وہ پانی کا منبع ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے اور رات بھر آگ پر قابو پانے کی کوششیں کرتے رہے۔ قریباً دس گیارہ مکانات جل کر راکھ ہوگئے جب کہ کچھ اور کو آگ کے شعلوں نے چھو لیا تھا مگر زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ البتہ ان گھروں میں رکھا ہوا سامان پانی کے چھڑکاو سے تباہ ہو گیا۔ ہمارے آس پاس کے چار پانچ مکانات آگ کی زد میں نہیں آئے اور میری ماں نے چین کا سانس لیا۔

۱۹۶۱ء کے بعد گھر سے ارتھیوں کا جلوس سا نکلا، اسی سال دادا جی سورگباش ہوگئے، پھر دوسرے سال ۱۹۶۲ء میں جب میں مارچ کے مہینے میں آٹھویں جماعت کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا، میری ماں جواں مرگ ہوگئی اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں جن دنوں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان

جنگ جاری تھی میری دادی کا انتقال ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ مارچ ۱۹۶۲ء کی ایک منحوس صبح کو کنجڑن نے ساگ خریدنے کے لیے میری ماں کو آواز دی اور ماں نے جواباً کہہ دیا کہ محلے میں دوسروں کو بیچ کر واپس آجاؤ۔ اس درمیان وہ نیند سے جاگی، نیچے اتری، رفع حاجت کے لیے باہر پاخانہ میں گئی، وہاں سے لوٹ کر نوکر سے پانی مانگا، گلاس بھر پی لیا اور اس کے ساتھ ہی چوکھٹ کے پاس گر پڑی۔ نوکر نے ہم بچوں کو خبر کردی اور میں دوڑا دوڑا سرکاری ڈسپنسری سے ڈاکٹر کو بلانے گیا۔ ڈاکٹر اطمینان سے کپڑے بدلنے لگا مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بہت دیر کر رہا ہے۔ من ہی من میں اس کو گالیاں دیتا رہا۔ ہمارے پڑوس میں ایک انکل رہتے تھے جو تھے تو ہسپتال میں کمپونڈر مگر عملی ڈاکٹری کا خاصا علم رکھتے تھے۔ وہ بچوں کے رونے کی آوازیں سن کر نیچے آئے، ماں کی حالت دیکھ کر خاموش ہوگئے اور ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے جونہی معائنہ کر لیا تو ماں کی المناک موت کی خبر سنائی۔ ہم سب بچے ماں کے اردگرد کھڑے تھے۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ البتہ گھر میں کہرام مچ گیا۔ پتا جی گھر پر نہیں تھے، وہ نور کے تڑکے ہی اپنے بہنوئی کو، جو پہلی بار ممبر پارلیمنٹ کا حلف اٹھانے کے لیے دہلی جا رہے تھے، ہوائی اڈے پر رخصت کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ کسی پڑوسی نے پولیس اسٹیشن سے ایئر پورٹ خبر بھجوادی اور دونوں واپس چلے آئے۔ اس حادثے سے میرا کمسن دماغ ماؤف ہوگیا۔ مگر پتا جی کے اصرار پر، جو صبر و شکیب کی مورت تھے، میں نے بے دلی سے دس روز بعد ہی آٹھویں کے امتحان میں شرکت کر لی اور کامیابی حاصل کر لی۔

میری ماں بہت ہی خوبصورت تھیں، قد آور، بھورے بال، دمکتا چہرہ اور نسوانیت کا پیکر۔ افسوس کہ حسن بے نظیر کو ان کی بدمزاجی نے درہم برہم کر دیا تھا۔ عجیب سی شخصیت تھی ان کی۔ تضاد کا مرکب۔ صاف ستھری، شفاف، نڈر اور بے باک، جو من میں آتا تھا کہہ دیتیں خواہ اسے کسی کا دل آزردہ ہی کیوں نہ ہو جاتا۔ بات بات پر غصہ کرتیں، غصے میں چلاتیں اور جلی کٹی سناتیں۔ پل میں وہ کسی کو بھی اپنی محبتوں سے سرشار کرتیں، پھر کچھ ان بن ہو جاتی تو دوسرے ہی پل اس کی تکا بوٹی کر لیتیں۔ ہم سب بھائی بہنوں نے غصہ ماں ہی سے ورثے میں پایا ہے۔ غصہ ہم سب کو آتا ہے، بس درجے کا فرق ہے، کوئی بہت غصے والا ہے اور کوئی کم۔ اس غصے میں جل کر ہماری ماں خاکستر ہوگئیں اور اسی غصے نے سارے خاندان کو

پراگندہ کر دیا۔

اس زمانے میں میٹرکولیشن یعنی دسویں جماعت پاس کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ان دنوں ہائیر سیکنڈری کورس کا رواج چل پڑا تھا جو میٹرک کے مقابلے میں آسان سمجھا جاتا تھا۔ میرے پتا جی کو نہ جانے کیوں اندیشہ تھا کہ میں علم الحساب میں کمزور ہوں اور میٹرک میں آسانی سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چونکہ ہمدانیہ سکول میں ہائیر سیکنڈری کورس کا آغاز نہیں ہوا تھا، اس لیے پتا جی نے دیانند اینگلو ویدک (ڈی اے وی) ہائیر سیکنڈری سکول، امیرا کدل میں میرا داخلہ کروا دیا جو گھر سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پرائیویٹ سکول تھا اور فیس تقریباً ۱۶/روپے ماہوار تھی۔ میں نے سائیکل چلانی بھی سیکھ لی تھی۔ اس طرح پتا جی کا دیرینہ سپنا بھی ساکار ہوگیا۔ ڈی اے وی سکول کشمیر کے ممتاز سکولوں میں برن ہال اور ٹینڈل بسکو کے بعد تیسرے نمبر پر آتا تھا۔ یہاں کا سٹینڈرڈ اور ماحول بالکل مختلف تھا۔ پانچویں جماعت تک مخلوط تعلیم تھی، پھر صرف لڑکوں کے لیے مختص تھا۔ سکول میں آریہ سماجی ماحول تھا، آریہ سماج کے سوامی مذہبی تعلیم دینے کے لیے اکثر آیا کرتے تھے اور کبھی کبھار یگیہ کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ گایتری منتر آریہ سماج کا کلیدی منتر ہے اس لیے ہمیں زبانی یاد کرنا پڑتا تھا۔ سکول میں مسلم اور سکھ طالب علم بھی تھے مگر ان کے لیے یگیہ میں حاضر ہونا ضروری نہ تھا۔ نظم وضبط بہت سخت تھا۔ گالی گلوچ سے طلبہ پرہیز کرتے تھے۔ زیادہ تر طالب علم سِوِل لائنز سے آتے تھے جن کا گھریلو سٹینڈرڈ کافی اونچا تھا البتہ جو طلبہ سوسائٹی کے نچلے طبقے سے آتے تھے، ان میں کم تری کا احساس پیدا ہونا فطری تھا۔ ہمارے ہندی ٹیچر کہا کرتے تھے کہ ایک زمانہ تھا کہ سکول کے اندر سب جگہ قالین بچھے ہوتے تھے اور اکثر و بیشتر بچے موٹر کاروں میں آتے تھے مگر آزادی کے فوراً بعد شیخ محمد عبداللہ نے اس پر اعتراض کیا۔ میں ان بچوں میں سے تھا جو نچلے یا درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میں سرینگر کے اس علاقے سے آتا تھا جہاں تہذیب نام کی کوئی چیز ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ ابتدا میں مجھے کچھ اچھا نہیں لگا لیکن بعد میں عادت پڑ گئی اور میں دھیرے دھیرے سکول کے ماحول سے مانوس ہوگیا۔ اس سکول میں میرا پھپھیرا بھائی اور پھپھیری بہن بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ڈی اے وی سکول میں انگریزی ذریعۂ تعلیم تھا۔ پتا جی کی ہدایت پر میں نے نویں جماعت

میں اردو کی بجائے ہندی بطور اختیاری مضمون لے لیا اور اس طرح اردو کے ساتھ سوشل سٹڈیز کی معرفت سے جو تھوڑا بہت واسطہ تھا وہ بھی منقطع ہو گیا۔ یہاں کا ہندی سٹینڈرڈ دیکھ کر میں گھبرانے لگا۔ ہندی استاد شری اومکار ناتھ شاستری بہت ہی سخت گیر تھے، فر فر ہندی نظمیں اور نثر پڑھاتے تھے اور اس کے ساتھ گرامر بھی سکھاتے تھے جو میرے پلے نہیں پڑتا تھا۔ اندر ہی اندر غم کھائے جا رہا تھا اور دن بتانے والا معاملہ ہو رہا تھا۔ میری خوش نصیبی یہ رہی کہ چار پانچ مہینے کے بعد ہندی ٹیچر کی تبدیلی ہوئی اور ان کی جگہ شری نرنجن ناتھ تعینات ہوئے۔ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا خاص کر گرامر پڑھانے کا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو پلے وے میتھڈ (Playway method) کہتے ہیں جس کا سلسلہ فروبیل کے کنڈرگارٹن، مانٹیسوری طریقۂ تعلیم اور ڈالٹن پلان کے تحت مقبول ہوا تھا۔ وہ کھیل کھیل میں محاورے یاد کرواتے، گردان سمجھاتے اور گرامر کی پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھاتے۔ ان کے توسل سے مجھے ہندی مضمون خاص کر گرامر سمجھنے میں کافی آسانی ہوئی۔ جوں توں کر کے دسویں میں ہندی سبجکٹ پاس کر لیا۔

اسی زمانے میں سکول میں ایک نئے استاد وارد ہوئے جو ہمیں دسویں میں ریاضی کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ان کا نام بھی شری اومکار ناتھ تھا۔ وہ بھی کھیل کھیل میں ہنستے ہنساتے ریاضی کے سوالات ہم سے حل کرواتے۔ چالیس منٹ کے پیریڈ میں سبھی لڑکے کتاب کے ایک دو باب حل کر لیتے تھے اور کوئی مایوس نظر نہیں آتا تھا۔ طلبہ کے درمیان ایک طرح کا کمپیٹشن لگ جاتا تھا کہ کون سب سے پہلے پورے باب کے سوالات حل کر لے گا۔ اومکار ناتھ جی گھر کے لیے کوئی کام نہیں دیتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ سکول کے بعد کا وقت کھیل کود کے لیے ہوتا ہے نہ کہ سکول کا کام کرنے کے لیے۔ اب جو آج کل کے اساتذہ کا موازنہ ان سے کرتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں۔ آج کل کے اساتذہ سکول میں ایک دو سوالات کا حل سمجھاتے ہیں اور باقی سوالات گھر میں حل کرنے کے لیے کہتے ہیں، طالب علم جانیں یا پھر ان کے والدین۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے طلبہ دن سکول میں بتاتے ہیں، شام ٹیوٹر کے پاس دوزانو بیٹھتے ہیں اور رات کو دیر تک بجلی کی روشنی میں سکول کا کام کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اب تو ان کے پاس خالی وقت ہی نہیں ہوتا، ایک آدھ گھنٹہ مل بھی جائے تو اس میں موبائل اور ویڈیو گیمز میں مشغول رہتے ہیں۔ کھیلنا کودنا تو اب عنقا ہو گیا ہے۔ ایسی تفریح کو انگریزی میں vicarious entertainment کہتے

ہیں جس میں طالب علم دوسروں کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر جذباتی طور پر محظوظ ہو جاتا ہے اور یہی موڈرن کلچر کی اہم دین ہے۔ ڈی اے وی سکول میں میں نے پہلی بار سکول میگزین ’جھرنا‘ کے لیے دو انگریزی مضامین لکھے جو دونوں چھپ گئے تھے۔ انھیں مضامین کہنا شاید مناسب نہیں ہوگا کیونکہ ایک کا عنوان ’پہلیاں (Riddles)‘ تھا اور دوسرا اقوالِ زریں سے متعلق تھا۔

۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور چین کی جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ کا عجیب سا ناسٹلجیا دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ ہماری فوجیں ہر محاذ پر شکست کھا رہی تھیں، امن کے ٹھیکیداروں نے اپنے دیش کی دفاعی تیاری کی جانب کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود سارا بھارت جاگ اٹھا۔ عورتوں نے اپنے گہنے اتار کر سرکار کے حوالے کر دیے، گلی گلی میں محمد رفیع، لتا منگیشکر اور دیگر گلوکاروں کے حب الوطنی کے گانے گونجنے لگے اور ساری قوم متحد ہو کر سینہ بہ سپر ہو گئی۔ ہندوستانی جذباتیت کی اس سے بہتر مثال اور کہیں نہیں مل سکتی ہے۔ بہر کیف جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو کر رہ گیا۔ چین کی فوجیں لداخ اور نیفا میں ہمارے علاقے میں گھس گئیں، پھر کچھ علاقے خالی کر لیے اور کچھ پر ابھی بھی قابض ہیں۔ البتہ اس جنگ کا ایک فائدہ یہ نکلا کہ ہمارے نام نہاد امن پسند رہنماؤں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ قوم کی دفاع کی جانب برسر پیکار ہو گئے۔ اس جنگ کے کچھ برس بعد ہی پنڈت جواہر لال نہرو کی موت واقع ہوئی۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں اس وقت دسویں کے ڈرائنگ مضمون کا امتحان دے رہا تھا کہ یہ خبر آئی۔ سارا ملک سوگ و ماتم میں ڈوب گیا۔ کشمیر میں بھی کئی دن جلسے جلوس نکلتے رہے اور اپنے رہنما کو شردھانجلی پیش کرتے رہے۔

چونکہ سکول میں ہائر سیکنڈری کورس تھا اس لیے گیارہویں جماعت بھی وہیں سے ۱۹۶۵ء میں ۱۵رسال کی عمر میں پاس کر لی۔ بیالوجی سٹریم کا انتخاب کیا تھا، مضامین تھے؛ بیالوجی (حیاتیات)، فزکس (طبیعات)، کیمسٹری (کیمیات) اور انگریزی۔ اردو اور ہندی دونوں نصاب میں نہیں تھے۔ موسم سرما کی چھٹیوں میں سکول کے انتظامیہ نے ہمیں فائنل امتحان کی خاطر تیار کرنے کے لیے ایک ریٹائرڈ پروفیسر کو بطور وزیٹنگ لیکچرر بلوایا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تم عمر میں بہت چھوٹے ہو اور امتحان دینے کے لائق نہیں ہو۔ شاید سچ ہی کہہ رہا تھا کیونکہ میں آخر کار ڈاکٹر نہیں بن سکا۔ میرے پتا جی نہ جانے کیوں بچوں کو بہت چھوٹی عمر میں سکول میں داخل کراتے تھے۔ بڑی بہن کے ایڈمشن کے وقت اس کی عمر دو سال

زیادہ لکھوائی تھے۔ میری ولادت کی تاریخ تبدیل تو نہیں کی تھی لیکن میرا داخلہ چار سال کی عمر میں کروایا تھا اور اس طرح میں نے مارچ ۱۹۶۵ء میں گیارہویں کا امتحان پاس کیا اور پھر ۲۱ سال کی عمر میں ایم ایس سی اور بی ایڈ کی ڈگریاں لے لیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر میں نے دو سال بعد پری میڈیکل کا امتحان دیا ہوتا تو میرا ذہن پختہ ہوتا اور شاید مجھے آسانی سے میڈیکل سیٹ مل جاتی۔

ڈی اے وی سکول میں ایک اور استاد تھے جنھوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کا نام تھا شری شمبھوناتھ کاچرو۔ ایسا کوئی مضمون نہیں تھا جو وہ پڑھا نہیں سکتے تھے۔ انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ہندی، اردو، ڈرائنگ ..... یعنی ہرفن مولا تھے۔ ایک بار سکندر اور پورس کی لڑائی کے بارے میں سمجھانا تھا۔ کلاس میں جونہی داخل ہوئے تو ڈرامائی انداز میں سکندر اور پورس کا وہ سین پیش کیا جس میں جیت کے بعد سکندر پورس سے پوچھتا ہے کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اور پورس بنا کسی جھجھک کے جواب دیتا ہے کہ جیسے ایک راجہ کو دوسرے راجہ سے سلوک کرنا چاہیے۔ وہ سبق میں آج تک نہیں بھول پایا۔ انگریزی پڑھاتے وقت کاچرو صاحب طلبہ کو نڈر ہونے کی ترغیب دیتے۔ میری شخصیت میں بے خوفی اور ہمت کی تقطیر سب انہی کا کرم ہے۔ ایک دفعہ انگریزی میں مکتوب نگاری سکھا رہے تھے۔ انھوں نے ایک روز قبل طلبہ کو ہدایت دی تھی کہ ہیڈ ماسٹر کے نام ایک خط لکھ کر لانا جس میں تین روز کی چھٹی کی استدعا کی گئی ہو۔ عام روش کے عین مطابق ہم نے خط کا آغاز ’آئی بیگ ٹو سے‘ (I beg to say) اور اختتام ’یورس اوبیڈینٹ سرونٹ‘ (Yours obedient servant) سے کیا تھا۔ علاوہ ازیں اکثر لڑکوں نے چھٹی لینے کے لیے والد یا والدہ کی بیماری کا بہانہ بنایا تھا۔ جب کاچرو صاحب نے چند عبارتیں پڑھیں تو ایک دم بھڑک اٹھے اور جو نوٹ بک ان کے ہاتھ میں تھی وہ غصے سے فرش پر پھینک دی۔ پھر چلا کر کہا۔ ”یہ غلامانہ آداب والقاب انگریزوں کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے۔ ہم آزاد تو ہو چکے ہیں مگر ذہنی طور پر غلامی کی زنجیریں توڑ نہیں پائے ہیں۔ ہمیں اس طرز انداز کو ترک کرنا چاہیے۔ اس پر المیہ یہ کہ ہر درخواست میں والدین کی بیماری کو وجہ بتایا گیا ہے جب کہ سچ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بیمار نہیں ہے۔ کیا ہم تفریح کے لیے چھٹی نہیں مانگ سکتے ہیں؟ کیا ہم پہلگام یا گلمرگ کی سیر کرنے کے لیے چھٹی نہیں مانگ سکتے ہیں؟ آخر یہ بیماری کا ہی بہانہ کیوں؟ آگے سے خیال رہے کہ مثبت وجہ دی جائے۔ پھر

انھوں نے نمونے کے طور پر تختۂ سیاہ پر ایک خط لکھ کر بتایا جس میں کہیں کوئی غیر ضروری آداب والقاب نہ تھے اور چھٹی کا سبب صحت افزا مقام پر پکنک کا ارادہ بتایا گیا تھا۔ ان کا یہ لیکچر میرے ذہن پر مستقل طور پر مرتسم ہوگیا۔ زندگی میں Be Positive کا پہلا سبق مل گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے جب بھی کوئی درخواست تحریر کی ان باتوں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ کاچرو صاحب موقع پا کر کبھی کبھی سیکس جیسے نازک مضمون پر بھی درس دیا کرتے تھے۔ ہم جنسیت اور ہتھ رسی جیسی کجرویوں کی لت عمر کے اس مرحلے پر خاص طور سے لگ جاتی ہیں۔ ان عادتوں سے بچوں کی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ والدین سے اس بارے میں پوچھنا معیوب سمجھا جاتا ہے، اس لیے طلبہ ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے ہیں مانو ایک اندھا دوسرے اندھے سے راستہ پوچھ رہا ہے۔ ایسے میں کاچرو صاحب جیسا کوئی استاد ہماری رہنمائی کرے تو انتہائی مفید ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں سکولی نصاب میں سیکس ایجوکیشن شامل کرنے پر کافی بحث چھڑی ہوئی ہے اور قدامت پسند اس کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں سکولوں میں سیکس ایجوکیشن کی تعلیم دینا بہت ہی ضروری ہے بشرطیکہ تعلیم دینے والے نفسیات یا جنسیات کے ماہر ہوں۔

ڈی اے وی سکول میں سگریٹ پینے کا میرا مشغلہ جاری رہا۔ مہاراج گنج کا ایک دوست رام پرکاش میرا ہم جماعت تھا، اس کے والد کا نسوار بنانے کا کارخانہ ان کے مکان کے گراونڈ فلور پر تھا۔ یہ نسوار سارے کشمیر میں سپلائی ہوتی تھی۔ ساتھ میں ہی ان کی سگریٹوں کی دکان تھی۔ ایک روز رام پرکاش نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے پتاجی کو میری سگریٹ نوشی کے بارے میں بتائے گا۔ بس پھر کیا تھا، میں اس کی خوشامد کرنے لگا، سگریٹ نوشی کی تعریفیں کیں اور اس کو کانونٹ سکول راجباغ کے پاس لے گیا جہاں اس نے بھی سگریٹ کا کش لگایا۔ صید خود ہی دام میں آگیا اور اس کے بعد گاہے گاہے اپنی دکان سے فور سکوئر کی ایک ڈبیا اٹھا کر لے آتا تھا۔

ڈی اے وی سکول میں مجھے ایک بہت ہی اچھا دوست ملا۔ اشوک مسری۔ میری طرح ہی نچلے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی اور میری دوستی خوب نبھی۔ اکٹھے پڑھا کرتے، سگریٹ پیتے، جوا کھیلتے، حسینوں کے متعلق خوش گپیاں کرتے اور ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوجاتے۔ بہت ہی بردبار اور سنجیدہ قسم کا آدمی تھا۔ اس نے کئی بار مجھے ذہنی تناؤ سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ بی ایس

سی کے بعد وہ ویٹرنری کالج ناگپور چلا گیا اور مویشیوں کا ڈاکٹر بن کر واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ رابطہ اب تک برقرار ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ہم جماعت ستیش کول (ایمہ) تھا، جس نے کالج سے چھٹکارا پا کر کئی بالی وُڈ فلموں اور دوردرشن کے سیریلوں جیسے مہابھارت وغیرہ میں اداکاری کی۔ پنجابی فلموں میں اس کو کافی شہرت مل گئی مگر زندگی کے آخری پڑاؤ پر اس کو بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بچپن ہی سے مجھے دو چیزوں میں بہت دلچسپی تھی، ایک کرکٹ اور دوسری مصوری۔ روزمرہ کے کام کو نظر انداز کر کے میں گھنٹوں کرکٹ کھیلنے میں مصروف رہتا۔ میرے پوپھا امر سنگھ کلب کے پاس رہتے تھے اور ہم بہن بھائی اکثر وہاں کئی کئی دن رہتے تھے۔ میں سکول ٹائم کے بعد یا چھٹیوں کے دنوں میں صبح سے شام تک کلب کے میدان میں کھیلتا رہتا جس کے باعث سب لوگ مجھ سے ناراض ہو جاتے تھے۔ دراصل کشمیری پنڈتوں کی زندگی کا مقصد بچوں کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے پر مرتکز رہتا تھا۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ بچہ کتابی کیڑا بن کر صرف امتحان کی تیاری کر لے اور کسی طرح بھی ڈاکٹر نہیں تو انجینئر بن جائے۔ ان کا ماننا تھا کہ کھیل کود سے اس مدعا کو پانے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کرکٹ کھیلنا ممنوع تھا اور اس کھیل میں میری دلچسپی والدین کی ناراضی کا باعث بن جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے آرٹ اور پینٹنگ کا بھی بڑا شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھویں جماعت میں موسم سرما کی چھٹیوں کے دوران میں نے دو بہت ہی خوبصورت پینٹنگز بنائی تھیں جن پر سکول کے ڈرائنگ ماسٹر نے شاباشی دی تھی۔ ڈی اے وی سکول کے لیے بھی میں نے جواہر لال نہرو کا ایک بہت ہی خوبصورت پورٹریٹ بنایا تھا جس کی نوک پلک ایک پیپر ماشی آرٹسٹ نے سنواری تھی۔ میرا یقین ہے کہ اگر میں نے مصوری میں دلچسپی لی ہوتی تو کافی شہرت مل گئی ہوتی۔ میرے پتاجی نے مجھے کرکٹ کھیلنے یا مصوری کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ محلے میں میں واحد لڑکا تھا جس کے پاس کرکٹ کا پورا سیٹ دستیاب تھا اور مصوری کے لیے رنگوں کا ڈبہ بھرا پڑا رہتا تھا۔ والد صاحب مجھے پیپر ماشی بنانے والے فنکاروں کے پاس بھی لے جاتے تھے جن سے میں پھول پتیاں، توتا مینا اور ہاتھی گھوڑا بنانا سیکھتا تھا۔ پیپر ماشی کے لیے وہ رنگ اور موئے قلم خود ہی بناتے تھے اور مجھے بھی کچھ موئے قلم تحفتاً دیتے تھے۔ تاہم پتاجی کو اندیشہ تھا کہ اگر میں آرٹسٹ بن گیا تو ایم ایف حسین کی طرح ننگے پاؤں شہر شہر آوارہ گھومتا پھروں گا اور گاڑیوں پر پینٹ کرتا پھروں گا۔ وہ اکلوتے بیٹے کو یوں کھونا نہیں

چاہتے تھے۔

کرکٹ کھیلنا تو خیر ان دنوں غیر منفعت کام تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے پانچ پڑوسیوں کا ایک ساجھا آنگن تھا جس میں ہم بچپن میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے یا پھر نزدیک ہی چند ہمسایوں کے یہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے ایک پڑوسی کی کھڑکیاں بہت نیچے تھیں اس لیے ان کے یہاں ہماری لکڑی کی گیندیں (بیرہ) اکثر جایا کرتی تھیں جن کو اس گھر کی مالکن کبھی واپس نہیں کرتی تھی۔ اس کے تہہ خانے میں ہماری سیکڑوں گیندیں جمع ہو گئی تھیں۔ دونوں میاں بیوی کرکٹ سے نفرت کرتے تھے۔ بیٹے کو بھی کھیلنے نہیں دیتے تھے مگر وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا ہاتھ میں کتاب لیے ہمارے رن گنتا رہتا تھا اور اگر کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا تو اس کی تردید کر کے تھرڈ امپائر کا کام کرتا تھا۔ تعجب کی بات تو یہ ہوئی کہ مائیگریشن کے بعد جموں میں میں نے اسی عورت کو ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھتے اور اس سے محظوظ ہوتے دیکھ لیا۔

ماں کی اچانک موت کے باعث میرا پسندیدہ کھیل کرکٹ چھوٹ گیا۔ جب وہ زندہ تھیں تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں تھا۔ کھیلتے وقت مجھے اکثر چوٹ آتی تھی، ماں کسی قریبی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر مرہم پٹی کرواتیں اور حسب ضرورت ٹیٹنس کا ٹیکہ لگواتیں۔ ان کی ناگہانی موت کے چند دن بعد میں پڑوسی کے آنگن میں کرکٹ کھیل رہا تھا کہ لکڑی کی گیند، جسے ہم کرکٹ کھیلا کرتے تھے، میرے سر پر آن لگی۔ چوٹ تو نہیں آئی مگر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ''اگر مجھے چوٹ لگ جاتی تو میں کہاں جاتا، گھر میں ماں تو ہے نہیں، بڑی بہن کالج میں ہے اور پتا جی دفتر میں، دونوں شام کو آجائیں گے۔ پھر میرا کیا ہوتا......؟'' میں نے اسی وقت کرکٹ کا بیٹ زمین پر رکھ دیا اور کسی سے کچھ کہے بغیر میدان چھوڑ کر چپ چاپ گھر چلا گیا۔ پھر کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس طرح کرکٹ کو تب تک الوداع کہہ دیا جب تک یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی میں مجھے ڈیپارٹمنٹ کی ٹیم میں شرکت کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے اپریل ۱۹۶۵ء میں پاکستان نے آپریشن جبرالٹر کے تحت کشمیر میں کثرت سے درانداز بھیج دیے جس کے باعث ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو ۱۷؍ دن تک جاری رہی۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے بھاری ٹینکوں اور بمبار جہازوں کا استعمال ہوا۔ ان ہی دنوں میری دادی کی موت واقع ہوئی اور جس شمشان گھاٹ پر اس کی لاش

کو میرے پتا جی نذرِ آتش کر کے آئے اس سے تھوڑی دوری پر چاند ماری میدان سے رات بھر فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ پاکستان نے سادہ لباس میں اپنی فوج کے دس ہزار لوگ سرحد کے پار بھیج دیے تھے اور چاہتے تھے کہ ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان سے منقطع کیا جائے۔ ان کی نظر سرینگر ائیر پورٹ اور قومی شاہراہ پر تھی۔ رات بھر تصادم رہا اور ہوائی اڈے پر کچھ مسلح لوگوں نے حملہ کر دیا۔ ہندوستانی فوج نے وقت گنوانے کے بغیر ریاست کے باہر بھی سرحد پر کئی جگہ مورچے کھول دیے اور پاکستانی فوج کو آڑے ہاتھوں لیا۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوائی جہاز اڑان بھرتے، بمباری ہوتی، سائرن بجتے اور رات کو بلیک آوٹ ہوتا مگر کشمیر ایسی جگہ تھی جہاں کا نظارہ دیکھنے لائق تھا۔ کشمیریوں کو یقین تھا کہ نہ ہندوستان ان پر بم برسائے گا اور نہ ہی پاکستان۔ جب بھی آسمان میں پاکستانی سابر جیٹ نظر آتے لوگ چھتوں پر چڑھ کر ان کا استقبال کرتے اور تالیاں بجاتے۔ یہاں تک کہ ایسی افواہیں اڑائی گئیں کہ جنرل ایوب خان کی بیٹی خود سابر جیٹ چلاتی ہوئی ڈل جھیل سے کنول کا پھول کاٹ کر لے گئی۔ یہ افواہ ریڈیو صدائے کشمیر کی اڑائی ہوئی تھی جو سرحد کے پار سے اپنے پروگرام نشر کرتا تھا۔ ان دنوں ریڈیو کشمیر سے بھی بڑا مزاحیہ سلسلہ وار پروگرام (ووتل بُجہء) نشر ہوتا تھا جس میں پاکستان کے فوجی دعووں پر خوب طنز کیا جاتا تھا۔ اس دوران شہریوں اور طلبہ کو سول ڈیفنس اور ٹریفک پولیس کی ٹریننگ دی گئی۔ چونکہ میں این سی سی کیڈٹ تھا اس لیے ٹریفک تربیت کے تحت میں نے پلیڈیم سینما کے بالکل سامنے لال چوک کا ٹریفک بیٹ بڑی کامیابی سے سنبھالا اور میری رہنمائی کرنے والا پولیس حوالدار مجھ سے اتنا خوش ہوا کہ انعام کے طور پر پلیڈیم میں مفت سینما دیکھنے کے لیے اندر بھیج دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہاں شمی کپور کا فلم ’بلف ماسٹر‘ چل رہا تھا۔ سول ڈیفنس ٹریننگ کے لیے ہم کچھ دوست ایک ساتھ نمائش گاہ چلے جاتے اور وہاں پر تربیت پاتے۔ اختتام پر انھوں نے کچھ رقم بھی بطور اعزازیہ دی تھی۔

والدہ کی ناگہانی رحلت کے بعد سارا بوجھ والد کے کاندھوں پر پڑا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۴۵؍ برس کی تھی۔ ان کے پاس دو ہی راستے تھے، دوسری شادی کرنا یا پھر باقی ماندہ زندگی بطور رنڈوے کے گزارنا۔ گھر میں چار نافرمان و شرارتی بچے تھے، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا، انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ پتا جی کی تعریف کرتے وقت لغت میں درج الفاظ کم پڑتے ہیں۔ نیک، حلیم، شریف، خوش گفتار اور

بچوں پر اپنی جان چھڑکنے والے۔ ایسے پتا جی خوش نصیبوں کو ہی ملتے ہیں۔ ساری عمر انھیں کبھی غصہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ ان کا ہی کلیجہ تھا کہ ماں کا سارا غصہ پی جاتے تھے اور ان کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ قصوروار ہیں۔ یہی رویہ انھوں نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی روا رکھا۔ منہ سے فرمائش نکلی نہیں کہ چیز حاضر ہو جاتی تھی۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ بچے اچھی ڈگریاں حاصل کر لیں اور زندگی میں آرام وسکون سے جی سکیں۔ دراصل پتا جی کا سارا خاندان ہی شریف الذات تھا۔ سب آپس میں بند مٹھی کی طرح رہتے تھے۔ ایسے خاندان میں جہاں گھر سے کبھی کوئی بات باہر نہیں جاتی تھی، وہاں جب میری ماں نے قدم رکھا ہوگا تو زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوئی ہوگی۔ مگر پتا جی اور ان کی بہنوں نے ان شعلوں کو کبھی ہوا دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ حالات سے سمجھوتا کرکے وقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ دادا اور دادی شرافت کے پتلے تھے، ڈھلتی عمر میں زہر کے گھونٹ پی کر رہ گئے، جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو چپ چاپ بڑی بیٹی کے گھر میں شرن لی اور عمر کا باقی حصہ وہیں پر بتایا۔

پتا جی کے نہ چاہنے کے باوجود گھر اکھاڑہ بن گیا۔ بات بات پر ہنگامہ ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں بچوں کی نشوونما پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ بچے، جن کا ذہن معصوم اور اثر پذیر ہوتا ہے، جب اپنے والدین کو ہر وقت غصہ کرتے، لڑتے جھگڑتے اور چیختے چلاّتے دیکھتے ہیں تو سہم جاتے ہیں، خوفزدہ ہوتے ہیں اور ان کے مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ والدین ان کی ضروریات کی جانب توجہ نہیں دے پاتے ہیں۔ بچے والدین کے پیار سے محروم رہتے ہیں اور اس پیار کی بھوک کو مٹانے کی کوشش میں متبادل ذرائع ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمیں جس گود میں تھوڑا بہت پیار ملتا، وہیں اپنا سر ٹیک دیتے۔ ماں کے جلالی اور غالبانہ کردار کی وجہ سے کئی برے نتائج سامنے آئے۔ چنانچہ وہ بات بات پر غصہ کرتیں، پتا جی کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ معاملے کو کسی طرح رفع دفع کیا جائے۔ وہ اپنی مردانگی کو نظرانداز کرکے بے بسی سے اپنے ہاتھ ملتے رہتے، دنیا بھر کے دوش اپنے ذمہ لیتے، بات بگڑ نہ جائے اس لیے سچ بولنے سے کتراتے اور جھوٹ و مبالغہ آرائی سے کام لیتے۔ وہ ایذا پسند زندگی بسر کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ یہ ان کی طبیعت ثانی بن چکی تھی لیکن یہی رویہ بیوی کی رحلت کے بعد ان کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ ان سے اب یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خوشامدی رویہ ترک کر لیں، گھر میں ہر چیز پر کڑی نظر رکھیں اور

بچوں کو غلط کام کرنے پر تنبیہ کریں لیکن وہ خود کو اس نئے رول میں ڈھالنے میں ناکام رہے۔ بچوں نے جب ان کی یہ کمزوری بھانپ لی تو ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ پتاجی بچپن میں اپنے والد سے دبتے رہے، جوانی میں اپنی بیوی سے اور معمری میں اپنے بچوں سے۔ ڈرپوک ہونا، فیصلہ نہ کر پانا، کسی تعمیری کام سے، جس میں جھوکم ہو، جی چرانا ان کی عادت بن گئی، اس لیے عمر بھر سسکتے رہے حالانکہ بچوں کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا۔

بیوی کے دباؤ میں آ کر نہ صرف انھوں نے بزنس چھوڑ کر نوکری کر لی بلکہ اپنے مکان کی ازسرنو تعمیر بھی کی۔ چنانچہ وہ دستکاریوں کی بزنس کرتے تھے، اس لیے ریاستی محکمہ صنعت وحرفت سے چھ ہزار روپے کا قرض اٹھالیا۔ اس سرمایے کو پیداواری کام میں لگانے کے بجائے مکان کی تعمیر پر خرچ کر لیا۔ وہ اس زعم میں تھے کہ لوگ ایسے قرضے واپس نہیں کرتے مگر انھیں عجیب تجربے سے گزرنا پڑا۔ مکان کی تعمیر کیا ہوئی کہ جیسے پیوندکاری ہوئی۔ مقامی ضابطے کے مطابق مکان کو ازسرنو تعمیر کرنے کے لیے گلی کے لیے کئی فُٹ زمین چھوڑنی پڑتی تھی۔ اس سے بچنے کے لیے لوگ 'پنڈ پنڈ' (منزل بہ منزل) کا سہارا لیتے تھے۔ اوپر والی منزلوں کو کڑیوں کی ٹیک دے کر پہلے نچلی منزل کو گراتے تھے اور اس کی تعمیر کرتے تھے۔ پھر آگے جا کر باری باری ایسی ہی کارروائی بالائی منزلوں کی تعمیر کرتے وقت دہراتے تھے۔ ہمارے مکان سے ملحق دو گلیاں تھیں اس لیے دونوں طرف زمین چھوڑنی پڑتی۔ ایسا کرنے سے مکان عمارت کم اور مینار زیادہ نظر آتا۔ خیر پتاجی کو جتنا روپیہ ملا، سو پہلی دو منزلوں پر خرچ کر لیا۔ ماں اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ کر نگرانی میں جُٹ گئی مگر اس کارروائی نے پڑوسیوں میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ کہتے ہیں حاسد کو تل پہاڑ نظر آتا ہے۔ جن پڑوسیوں کی والد نے کئی بار امداد کی تھی وہی تعمیر کو روکنے کے لیے رکاوٹیں ڈالنے لگے اور کئی بار مغلظات اور جھگڑوں پر بھی اتر آئے۔ شومیِ قسمت کہ دوسری منزل بنتے ہی ماں نے آخری سانس لی اور مکان کی مزید تعمیر مکمل نہ ہو سکی۔ تیسری منزل کسی حسینہ کے چہرے پر کانٹوں کا تاج سا نظر آتا تھا۔ اِدھر مکان کا محل وقوع ایسا تھا کہ کرایہ پر اٹھانا ممکن نہ تھا، اُدھر پتاجی نے بزنس بند کر کے نوکری جوائن کی تھی جس میں کچھ ہی وقفے کے بعد انھیں تنازعے کا سامنا کرنا پڑا اور نتیجے میں ان کی آمدنی محدود ہو گئی۔ قرض اتارنا مشکل ہوا، دونوں دکانیں بک گئیں اور سود مرکب کے سبب قرض کا غبارہ پھولتا رہا۔ وقتاً فوقتاً قرض دہندہ

پریشان کرتے رہے یہاں تک کہ مکان پر کئی مرتبہ قرقی کے نوٹس بھی لگ گئے۔ اس کا غم پتا جی کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا مگر انھوں نے بچوں کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالت یہ ہوئی کہ چھ ہزار کے بدلے پتا جی نے آخرش اٹھارہ ہزار روپے کا بھگتان کیا اور تب کہیں جا کر معاملہ نپٹ گیا۔

والد کی دو دکانیں تھیں۔ ایک بنڈ پر جہلم دریا کے کنارے اور دوسری سنٹرل مارکیٹ میں (سٹال نمبر ۱۱۵، نمائش گاہ)۔ نام تھا 'سودیشی آرٹس اینڈ کرافٹس'۔ بنڈ والی دُکان پسٹن جی بلڈنگ کے پاس دوسری منزل پر تھی۔ اس کی لمبائی اتنی تھی کہ ایک طرف پولو گراونڈ کا نظارہ کر سکتے تھے اور دوسری طرف جہلم کا۔ دونوں دکانیں میرے پوپھا پنڈت شام لال صراف کی تھیں جنھوں نے 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک سے جڑ جانے کے باعث دکانیں میرے والد کے حوالے کر دی تھیں۔ صراف صاحب نے میرے والد کو میٹرک پاس کرتے ہی اپنے ساتھ کاروبار میں لگایا تھا مگر بقول صراف صاحب میرے پتا جی آرام طلب تھے اور تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ حالانکہ آمدنی کم نہ تھی اور گھر کا خرچہ بخوبی نکل جاتا تھا لیکن وہ دس سے چار بجے والی نوکری اور پہلی تاریخ کو بیوی کے ہاتھ پر تنخواہ رکھنے والا معاملہ، جو اکثر کشمیری پنڈتوں کو اچھا لگتا ہے، نہیں تھا۔ ماں اس لحاظ سے کبھی خوش نہیں رہیں اور بار بار صراف صاحب سے شوہر کو کہیں ملازم لگانے کے لیے منت سماجت کرتی تھیں۔ آخرکار انھوں نے پتا جی کی تجربے اور مہارت کو دیکھ کر انھیں کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں ۱۹۶۱ء میں ملازمت دلوا دی۔ افسوس کہ اسی کے ساتھ ہمارے خاندان کا زوال شروع ہوا۔ بزنس چھوٹی، قرضہ بڑھتا رہا، دکانیں کوڑیوں کے مول بک گئیں، صراف صاحب منسٹری سے دست بردار ہو کر پارلیمنٹ کے ممبر نامزد ہوئے، نوکری جو ملی تھی اس میں ٹنٹا کھڑا ہو گیا، پہلے مینجر کا پوسٹ دیا گیا تھا مگر جب انھوں نے دیکھا کہ بہنوئی اب منسٹر نہ رہا تو اسٹنٹ مینجر کے پوسٹ پر مستقلی کر دی۔ پتا جی دس سال تک اپنے حق کے لیے لڑتے رہے، اسٹنٹ مینجر کی تنخواہ لینے سے انکار کیا اور احتجاج کے طور پر صرف دو سو روپے کی مجموعی تنخواہ لیتے رہے۔ جب کیس کا فیصلہ ہوا، کورٹ نے مینجر کے پوسٹ پر بحال تو کیا لیکن دس سال کی بقایاجات رقم دینے سے انکار کیا۔

دوسری جانب جیون ساتھی چھوٹ گیا اور گھر کی دیواریں کھانے کو دوڑنے لگیں۔ شومی قسمت

یہ کہ ایک ہی سال میں موسم سرما میں پے در پے تین ایکسیڈنٹ ہو گئے۔ پتا جی چونکہ سائیکل پر دفتر جایا کرتے تھے، ایک بار تانگے سے ٹکرا کر گر پڑے اور ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہسپتال میں داخل ہوئے، پلاسٹر چڑھایا گیا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ گھر میں جو کوئی آتا تھا کوئی نہ کوئی علاج تجویز کر لیتا یا پھر کسی نہ کسی ہڈی جوڑنے والے کا نام بتلاتا۔ ایک رشتہ دار نے فتح کدل میں ایک جراب ساز کا حوالہ دیا اور کہا کہ ہم نے اس کے ہاتھوں معجزہ ہوتے دیکھا ہے۔ پھر کیا تھا، اس کو بلایا گیا، پلستر جو چڑھا تھا وہ کاٹ لیا گیا، اس نے کچھ کھینچ تان کر لی اور پھر مہینے ڈیڑھ مہینے تک گھر میں جڑی بوٹیوں سے دوائی بنا کر اس پر لگائی گئیں جب تک پتا جی کی صحت بحال ہو گئی۔ تنخواہ بند ہونے اور گھر میں آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باعث گھر میں کال پڑ گیا تھا، اس لیے وہ جلد از جلد دفتر جانا چاہتے تھے۔ سائیکل چلانے سے گھبراتے تھے اس لیے پیدل ہی تین چار کلو میٹر دور آفس چلے جاتے۔ دو سو روپے کی تنخواہ میں تانگے یا آٹو میں جانا کہاں ممکن تھا۔ غالباً دسمبر کا مہینہ تھا۔ چند روز سے بہت برفباری ہوئی تھی۔ پتا جی پیدل دفتر سے واپس گھر آ رہے تھے کہ ستھو بربرشاہ کے پاس ان کی پتلون موزے سے باہر آ کر گیلی ہونے لگی۔ انھوں نے پائنچے کو واپس موزے میں ڈالنے کے لیے اپنا پاؤں اٹھا کر ایک دکان کے تھڑے پر رکھ دیا۔ آناً فاناً دکان کے اوپر لگا ہوا بھاری بھرکم سائین بورڈ جمی ہوئی برف کی تاب نہ لا کر دھڑام سے ان کی ٹخنے پر گر گیا وران کا پاؤں فیل پا مریض کی مانند متورم ہو گیا۔ کچھ خیر خواہوں نے انھیں گھر لایا اور ہم نے پھر اسی موزہ ساز سے رجوع کر لیا۔ اس نے دوبارہ چند جڑی بوٹیاں لکھ کر دیں جنھیں اصلی گھی میں حلوے کی طرح پکا کر میری پوپھی ان کے ٹخنے پر لگاتی تھی اور پھر مفلر اور چند موٹے کپڑوں سے لپیٹ کر رکھتی تھی۔ پندرہ بیس روز میں پتا جی پھر سے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے اور دوبارہ چھڑی کے سہارے پیدل دفتر جانے لگے۔ دو تین مہینے یوں ہی گزر گئے اور ان کی خود اعتمادی لوٹ آئی، اس لیے انھوں نے پھر سے سائیکل پر دفتر جانا شروع کر دیا۔ قریب ایک مہینہ گزر گیا کہ وہ ایک بار پھر سائیکل سے گر گئے اور جانگھ میں دوبارہ اسی جگہ چوٹ لگی جہاں پہلے لگی تھی۔ اس بار چوٹ کی شدت ویسی نہ تھی جیسی پہلی دفعہ تھی۔ ہڈیاں جوڑنے کا ماہر پھر طلب کیا گیا، وہی جڑی بوٹیوں والی کارروائی شروع ہوئی اور دس پندرہ روز کے بعد پتا جی پھر سے دفتر جانے لگے۔

وہ جاڑا تو سارے کنبے کے لیے ڈراونے خواب (Nightmare) جیسا تھا۔

دو سو روپے ماہانہ آمدنی میں تین لڑکیوں، ایک لڑکے اور ایک بیوہ بہن کو دس سال تک پالنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ بچے ایسی جماعتوں میں پہنچ گئے تھے جہاں سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن سکا۔ پتا جی اس اصول پر کاربند تھے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے چاہے بھیک مانگنا پڑے، ادھار لینا پڑے یا پھر چوری کرنا پڑے، سب جائز ہے۔ (Beg, Borrow or Steal)۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے ہماری پڑھائی کے لیے لاتعداد مصیبتیں جھیلیں مگر ہم تھے کہ ان کی خدمت اور ایثار کی قدر نہ کر سکے۔ میری بڑی بہن گیان جی حالی مجھ سے چار سال بڑی تھیں، ایم ایس سی (زولوجی) اور بی ایڈ کر کے سکول میں بطور ٹیچر لگ گئیں، شادی روشن لال حالی سے ہوئی جو محکمہ روڈس اینڈ بلڈنگس میں اوورسیر تھے۔ دوسری بہن، ریتا دھر، مجھ سے چار سال چھوٹی تھی، ہائر سیکنڈری سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر پائی کیونکہ ایچ ایم ٹی فیکٹری میں اسے اتفاقاً نوکری مل گئی، اس کی شادی منجیت دھر سے ہو گئی جو شادی کے بعد شالی سٹور میں ملازم ہو گئے۔ تیسری بہن رینو ترمبو نے ایم اے کر لیا اور ہنگامی حالات کے دوران اپنی پسند کے ایک مسلمان تاجر منظور احمد ترمبو سے شادی کر کے کشمیر کو مستقر بنا لیا۔

بچپن ہی سے پتا جی نے ایک اچھے دوست کی طرح میری رہبری کی۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے وہ نہ تو بچوں پر غصہ کرتے تھے اور نہ کبھی پیٹتے تھے۔ پیار سے سمجھاتے رہتے۔ اس طرح سمجھنا تو آسان ہے مگر سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ بہت صبر اور ہمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہاں دوسرے والدین اپنے اور اپنے بچوں کے درمیان حیا کے نام پر دبیز پردے حائل کرتے ہیں وہیں میرے پتا جی نے کمسنی ہی میں مجھے جنسی کجرویوں اور غیر فطری جنسی افعال کے مضر اثرات سے آگاہ کیا جس کے لیے میں ہمیشہ ان کی ہمت کی داد دیتا رہا۔ کالج میں طالب علمی کے دوران انھیں میری سگریٹ نوشی کے بارے میں خبر ملی۔ ایک روز میں تانگے پر اپنی پوپھی کے ہاں جا رہا تھا اور پتا جی پیچھے پیچھے سائیکل پر آ رہے تھے، اچانک گویا ہوئے۔ ''سنا ہے اب تم سگریٹ بھی پیتے ہو؟'' پہلے تو میں خاموش رہا پھر ہمت جٹا کر پوچھ لیا۔ ''آپ کو کس نے بتایا؟'' جواب ملا۔ ''دو تین روز پہلے پروفیسر ٹی این بھان نے حبہ کدل میں تمھیں سگریٹ خریدتے ہوئے دیکھا تھا۔'' مجھے کوئی معقول جواب نہیں سوجھا، جھوٹ تو میں بولتا نہ تھا، سو چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ مکرر مخاطب ہوئے۔ ''بیٹے سگریٹ پینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں خود بھی حقہ اور

سگریٹ پینے کا شوقین تھا مگر بہت سال پہلے میں نے اس عادت کو ترک کر دیا، اب تو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ تم ابھی بچے ہو، صحت خراب ہو جائے گی، بہتر یہ ہے کہ اس عادت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرلو۔'' اس روز کے بعد میں نے سگریٹ پینا ترک کرلیا مگر کچھ برس کے بعد ذہنی تناؤ کے سبب دوبارہ شروع کرلیا۔ آخر کار یہ عادت ۱۹۹۹ء میں مکمل طور پر چھوٹ گئی۔ اس کے برعکس پتا جی نے خود تناؤ کے باعث ڈھلتی عمر میں حقہ اور سگریٹ پینا پھر سے شروع کیا اور مرتے دم تک نہیں چھوڑ پائے۔

والد صاحب نے مجھے کالج ٹائم کے بعد ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لیے نزدیک ہی ایک پرائیویٹ کوچنگ سینٹر میں بھیج دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک سٹینو ٹائپسٹ، جو صراف صاحب کے تحت بحیثیت پرائیویٹ اسسٹنٹ کام کرتا تھا، ترقی کرتے ہوئے انڈر سیکریٹری بنتے دیکھا تھا۔ ان کی تمنا تھی کہ میں بھی سٹینوگرافی اور ٹائپنگ سیکھ کر اپنا کیرئر بناؤں اگر تعلیم میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ میں نے ٹائپ کرنا تو جلدی سیکھ لیا مگر شارٹ ہینڈ میں کچھ مزہ نہیں آیا۔ وہ عمر ہی ایسی تھی کہ زندگی کے مزے لوٹنے کو جی چاہتا تھا، دن بھر کالج جانا اور پھر شام کو کوچنگ سنٹر میں ایک ڈیڑھ گھنٹے مغز پچی کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ قریب سات آٹھ مہینے کے بعد میں نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔ تاہم اس کا ایک فائدہ یہ نکلا کہ میں نے اچھی رفتار کے ساتھ ٹچ ٹائپنگ کرنا سیکھ لیا اور اسی کا یہ ثمر ہے کہ میں یہ کتاب خود ہی ٹائپ کر رہا ہوں۔ انگریزی ٹائپنگ جاننے کے سبب ہی میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اردو ٹائپنگ سیکھ لی اور اب اپنی کتابوں کی کمپوزنگ خود ہی کر لیتا ہوں۔

میری بدنصیبی یہ تھی کہ ماں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا مگر اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کچھ عرصہ بعد نیک سیرت، کم گو، ایثار کن اور خلیق پوپھی نے، جو بچپن ہی میں بیوگی سے دوچار ہوئی تھیں، ہمارے گھر کی کمان سنبھال لی۔ پوپھی کیا تھیں، ممتا کا بے مثال پیکر تھیں۔ ان کا اصلی نام مندودھری تھا مگر سسرال والوں نے خاوند پران ناتھ کی نسبت سے پرانا شوری نام رکھ دیا تھا۔ شادی بچپن ہی میں ہوئی تھی لیکن چند برسوں کے بعد وہ بیوہ ہوگئیں۔ دوسری شادی کا رواج تو تھا نہیں، اس پر مصیبت یہ کہ ان پڑھ تھیں، اس لیے نوکری کرنا ممکن نہ تھا۔ زندگی بھر بیوگی سے جوجھتی رہیں، کبھی سسرال اور کبھی اپنی بڑی بہن کے ہاں رہتیں جہاں وہ اپنے بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ آئے دن کے مصائب نے انھیں

قنوطی بنا دیا تھا، وہ کسی بھی مسرت سے کھل کر وابستہ نہیں ہوتی تھیں۔ کوئی کچھ مانگنے آجاتا تو پہلے انکار کر لیتیں اور بعد میں جوں توں کر کے دے دیتی تھیں۔ مدعا خود کو اور اپنے بال بچوں کو آدم نظر سے بچانے کا تھا۔ جونہی ہمارے گھر میں ماں کی جوانمرگی کا زلزلہ آیا تو دوڑتی بھاگتی ہم کو اپنی شرن میں لے لیا۔ بڑی بے لوث اور تجربہ کار عورت تھیں جنھوں نے زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھی تھی۔ ہمیں پا کر ان کی ویران زندگی میں جیسے بہار آگئی۔ ہم ان کو پیار سے 'جگری' کہتے تھے۔ ہمدردی، قربانی اور بے نفسی کا پیکر تھیں وہ۔ جگری عمر بھر لوگوں کی سیوا کرتی رہیں اور بدلے میں کبھی کسی چیز کی امید نہ رکھی۔ اگر نرسنگ پیشے میں چلی گئی ہوتیں تو بہت نام کماتیں۔ بچپن ہی میں خاوند کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد انھوں نے پارسائی کی زندگی اپنالی۔ اس زندگی میں تیاگ تھا، بلیدان تھا، ہمدردی تھی اور خدمت تھی۔ بھگوان پر ان کا اٹل وشواس تھا مگر ایشور کو پانے کے لیے اپنا ہی ایک منفرد راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ انھوں نے سنیاسیوں کی طرح دنیا کو نہیں تیاگا بلکہ دنیا میں رہ کر اس سے کنارہ کشی کرلی اور لوگوں کے دکھ درد کو بانٹتی رہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ ضرورت مند انسان کی خدمت زندگی میں ہی کرنا چاہیے، مرکر شرادھ اور خیرات دینے کے ڈھکوسلوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہی تیاگ سب سے بڑا تیاگ ہے، موہ مایا کے بندھنوں سے آزاد، لالچ نام کو بھی نہیں، شک اور وہم سے دور، ورنہ جس عمر میں وہ بیوہ ہوئی تھیں اس عمر میں تو فرشتوں کے قدم بھی ڈگمگاتے ہیں۔

جگری بہت ہی ذہین اور کم گو تھیں۔ ذہین اتنی کہ انتہائی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا لیتیں۔ کم گو اتنی کہ پہاڑ کا سینہ چاک ہو سکتا تھا مگر ان کے سینے میں چھپا راز افشا نہیں ہوتا۔ افسوس وہ تعلیم یافتہ نہ تھیں ورنہ میرا یقین ہے کہ انھوں نے بیوہ ہونے کے باوجود اپنا نام روشن کیا ہوتا۔ چنانچہ جن دنوں ان کے بہنوئی ہیلتھ منسٹر تھے ایک دو ڈاکٹروں نے انھیں کہا تھا کہ اگر وہ محض میٹرک پاس ہوتیں تو ان کو ہسپتال میں اچھی نوکری پانے کے لیے کسی ٹریننگ کے لیے بھیجا جا سکتا تھا۔ یہ بات ان کے دل میں ہمیشہ کھٹکتی رہی، اس لیے تعلیم نسواں کی ہمیشہ طرفدار رہیں۔ ان کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ تعلیم ہی عورت کا سب سے بڑا زیور ہے۔ پڑھائی میں دلچسپی لینے کی ترغیب مجھے جگری کی بدولت ہی ملی۔ وہ ہمیشہ ایسی کہانیاں سناتیں کہ سننے والا تعلیم کے فوائد کا قائل ہو جاتا۔ ان کی سرپرستی کے بعد میں نے بہت کم گھر سے باہر قدم رکھا۔ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ صبح البتہ بہت دیر سے جاگتا۔ رات کے پچھلے پہر تک وہ مجھے چائے بنا کر دیا کرتی

تھیں۔ اسی شفقت کی وجہ سے مجھے کھیلنے کے بدلے کتابیں پڑھنے میں زیادہ دلچسپی ہونے لگی البتہ چائے پینے کی بُری عادت پڑ گئی۔ بیس پچیس کپ روزانہ اندر جاتے تھے جن کا برا اثر بعد میں دیکھنے کو ملا۔

اپنی کوکھ سے جگری کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے سسرال میں زیادہ وقت نہیں گزرا حالانکہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے چھوٹے دیور کو گود لیا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے سسرال سے کبھی ناتا نہیں توڑا اور مرتے دم تک سسرال والے ان کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنی خوشی اور غم میں انھیں برابر کا شریک بنا لیتے۔ سسرال چھوڑے ہوئے تو برسوں بیت گئے تھے مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب بھی سسرال میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جاتا تھا یا پھر کوئی مسئلہ آن کھڑا ہوتا تھا وہ فوراً جگری کے پاس دوڑے چلے آتے تھے اور ان سے نہ صرف صلاح مشورہ لیتے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ جگری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ لوگوں کو مل جل کر رہنے کی تلقین کرتیں جبکہ عام عورتوں میں یہ خاصیت بہت کم ملتی ہے۔ عموماً لوگ بندر بانٹ میں یقین رکھتے ہیں لیکن جگری اپنی ساری قوت لگا کر گھروں کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچانے کی کوشش کرتیں۔ برسوں سے لڑتے آ رہے دشمنوں کو وہ منٹوں میں دوست بنانے میں کامیاب ہو جاتیں۔ نفاق میں اتفاق پیدا کرنے کا ہنر کوئی ان سے سیکھ لیتا۔

☆☆☆

میرے محسن میرے رہنما

زندگی میں ہر آدمی کسی نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے خاص کر لڑکپن کے زمانے میں جب ہیرو ورشپ (Hero worship) کی خو پڑ جاتی ہے۔ بارہا ایک سے زیادہ لوگ بھی اثر بخشتے ہیں تاہم رول ماڈل عام طور پر ایک ہی شخص بن جاتا ہے۔ میری زندگی پر بھی کئی لوگوں کا پرچھاواں پڑا مگر جو شخص میرے لیے مشعل راہ بن گئے وہ تھے میرے پوپھا پنڈت شام لال صراف۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ انھوں نے مجھے اپنی شاگردی میں لے لیا تھا مگر اکلویہ کی طرح میں نے بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر ان کی سوچ وفکر اور طور طریق سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرلی۔

پنڈت شام لال صراف کے بارے میں ’تیسری لوک سبھا کے ممبران کے کوائف‘ ہوز ہو ۱۹۶۲ء‘ (Parliament of India,Third Lok Sabha,Who's Who 1962) میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہیں:

> صراف، شری شام لال، کانگریس (نامزد- جموں وکشمیر، ۱۹۶۲ء)؛ ولد پنڈت سنسار چند صراف؛ پیدائش سرینگر ۴؍جولائی ۱۹۰۴ء؛ سی ایم ایس سکول اور ایس پی کالج سرینگر میں تعلیم پائی؛ شادی شریمتی گنوتی سے ۲۰؍مارچ ۱۹۲۳ء کو ہوئی؛ پیشہ: بزنس مین؛ جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس سے وابستہ رہے، ۱۹۳۰ء سے قبل ہی قومی تحریک سے جڑے رہے، جموں وکشمیر کے ریاستی قانون سازیہ سے ستمبر ۱۹۵۱ء تا ۷؍اپریل ۱۹۶۲ء تک وابستہ رہے، اسی دوران اپریل ۱۹۴۷ء سے ۷؍اپریل ۱۹۶۲ء تک ریاستی کابینہ میں منسٹر رہے؛ سماجی کام: کئی سماجی، کلچرل، تعلیمی اور مذہبی اداروں اور سوسائیٹیوں کے رکن رہے؛ ہابی:

کلچرل ایکٹوٹیز؛ مشاغل : مطالعہ کرنا، سیر اور جسمانی ورزش کرنا؛ خصوصی دلچسپی: اخلاقی اور روحانی اصلاح؛ کلب: امر سنگھ کلب کے ممبر؛ اسفار: سیلون، یو کے، فرانس، مغربی جرمنی، سویٹزرلینڈ، چیکوسلوویکیا، ہنگری، یوگوسلاویا، پولینڈ، سویڈن اور اٹلی؛ مستقل پتہ: ۶، کلب روڈ، سرینگر، کشمیر۔

۲۰۰۳ء کے انڈین پارلیامنٹری کمپینین میں ان کے بارے میں مزید درج ہے کہ ان کی وفات ۲۶/ جولائی ۱۹۸۳ء کو ہوئی۔

صراف صاحب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ٹینڈل بسکو میموریل سکول میں تعلیم پائی تھی جس کا موٹو 'ہر میدان میں مرد بنو' (In all things be men) تھا۔ اس لیے ان کے کردار میں راست بازی، جرأت مندی اور نظم وضبط کا عنصر غالب تھا۔ یہ خصائل ان کو وراثت میں ملی تھیں۔ سنا ہے کہ ان کے والد بہت ہی نفاست پسند اور سخت نظم وضبط کے قائل تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ انھیں بغیر اجازت دو پیسے کے چنے کھانے کی پاداش میں گھر سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ خوش گفتاری ایسی کہ میں نے کبھی بھی ان کے منہ سے کسی کی بُرائی نہیں سنی۔ جب بھی کوئی ان کے سامنے کسی تیسرے شخص کی بُرائی کرتا، وہ اس کو روک لیتے تھے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے کشمیری دستکاریوں کی تجارت شروع کی تھی۔ دو دکانیں تھیں، ایک جہلم کے بنڈ پر اور دوسری نمائش گاہ میں۔ اچھا خاصا بزنس چل رہا تھا۔ آمدنی بھی معقول تھی۔ انہی دنوں ان کی شادی میری سب سے بڑی پوپھی، تارا شوری سے ہوئی۔ رشتے دار شادی سے بہت خوش نہ تھے کیونکہ صراف صاحب کسی سرکاری عہدے پر براجمان نہ تھے۔ انھوں نے ملازمت کے بجائے تجارت کو ترجیح دی تھی جو کشمیری پنڈتوں کی عام روش کے برخلاف تھا۔ اس زمانے میں کشمیری نوجوان مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف آواز اٹھانے لگے تھے، اس لیے وہ بھی سیاسی میدان میں کود پڑے اور اپنی زندگی قوم کے لیے وقف کر دی۔ اپنی دونوں دکانیں اپنے سالے کے حوالے کر دیں۔ ابتدا میں ہندوؤں کی جماعت 'یووک سبھا' میں شامل ہوئے اور جب شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا تو ان کی قیادت قبول کر کے نیشنل کانفرنس کے رکن بن گئے۔ جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس بھی

کانگریس کی طرح سیکولرازم کا دعویٰ کرنے لگی اس لیے کانگریس کے قریب آ گئی۔ شیخ محمد عبداللہ کی دوستی جواہرلال نہرو سے گہری ہوگئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کشمیری تھے۔ 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک کے سلسلے میں صراف صاحب کو کئی بار جیل جانا پڑا جن میں سے کڈ جیل کی نظربندی سب سے خطرناک تھی۔

چنانچہ پتی پرمیشور ایسے ملے تھے جو آئے دن جیل میں پڑے رہتے، تارا شوری کو، جس کا نام سسرال میں گنوتی رکھا گیا تھا، زیادہ تر میکے ہی میں رہنا پڑتا تھا اور لوگوں کے منہ سے طرح طرح کے طعنے اور بدشگونیاں سننا پڑتی تھیں۔ کوئی کہتا کہ اب کی دفعہ دس سال کی قید بامشقت ہوگی، کوئی اور کہتا کہ اب حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ان باغیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا، غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ گنوتی نیک، پارسا، صابر اور بردبار عورت تھیں۔ بچپن ہی سے دھرم کرم کے کاموں میں مشغول رہتی تھیں۔ بھگوان شِو کی بھکت تھیں۔ صبح سویرے اٹھ کر مندر جاتیں، شِو لنگ پر پانی چڑھاتیں، بہت دیر اس کی پوجا کرتیں اور پھر واپس گھر چلی آتیں۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ صراف صاحب کئی سال جیل کاٹنے کے بعد چھوٹ کر آ گئے اور یہ خوشخبری دینے کے لیے کوئی رشتہ دار دبے پاؤں مندر پہنچ گیا۔ سوچا تھا کہ گنوتی خبر سن کر خوشی سے پھولی نہ سمائے گی اور سب کچھ چھوڑ کر دوڑتی ہوئی گھر لوٹ آئے گی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں، سنی ان سنی کر دی، حسب دستور پوجا پاٹ مکمل کر کے واپس آئیں اور گھر پر معمول کے کاموں میں مگن ہوگئیں۔ آزادی کے بعد وہی شوہر ریاستی کابینہ کے وزیر بن گئے لیکن جاہ وجلال کے دنوں میں بھی گنوتی دنیا سے لاتعلق اور بے نیاز رہیں۔ گھر میں ٹھاکر کا ایک کمرا الگ سے سجا رکھا تھا جہاں وہ دن رات چوکڑی لگا کر بھگوان شِو کی پوجا کرتی تھیں۔ بچپن ہی سے کبھی گوشت خوری نہیں کی مگر خاوند گوشت خور تھے اس لیے ان کے لیے گوشت کی مختلف قسمیں بنایا کرتیں جو اتنی لذیذ ہوتیں کہ کھانے والا انگلیاں چاٹ کر رہ جاتا تھا۔ کیا مجال کہ نمک کم یا زیادہ ہو۔ چولہے سے جلتی لکڑی نکالتیں، اس پر تھوڑا سا شوربا ڈال دیتیں اور اس سے پیدا ہوئی جھاگ سے نمک کا اندازہ لگا لیتیں۔ سنا ہے کہ سولہ بچے جنے تھے مگر ان میں سے صرف ایک لڑکی بچ گئی۔

صراف صاحب مہاتما گاندھی کے پرستار تھے اور ان کے اصولوں پر عمر بھر چلتے رہے۔ ان کے علاوہ جواہرلال نہرو کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر میں نے صراف صاحب کو نہ دیکھا ہوتا تو اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ کوئی آدمی گاندھی جی کے اصولوں پر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ شرافت،

نفاست، سادگی اور ایمانداری کا نمونہ تھے وہ۔ نور کے تڑکے جاگتے تھے، موسم کیسا بھی ہو نہائے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ہر روز یوگ کرتے تھے۔ اس کے بعد بھگوت گیتا، رامائن اور جپ جی کا پاٹھ کرتے۔ خوش گلو اتنے تھے کہ کبھی کبھی میں پاس ہی بستر میں لیٹا ان کے منہ سے گیتا کا پاٹھ سن کر محظوظ ہوجاتا۔ کم گو تھے اور ضرورت سے زیادہ کبھی نہیں بولتے تھے۔ چاہے کوئی کتنی بھی کوشش کرلیتا کہ ان کو بحث ومباحثے میں الجھائے، وہ الجھتے نہیں تھے۔ میں نے انھیں کبھی بیمار ہوتے نہیں دیکھا، صرف گاؤٹ کی بیماری لگی تھی جس سے کبھی کبھار پریشان ہوجاتے۔ آخری دنوں میں بھی کچھ زیادہ بیمار نہیں پڑے اور دیکھتے دیکھتے ہی اپنے پران تیاگ دیے۔

سودیشی تحریک کے تحت انھوں نے ہمیشہ کھدر زیب تن کی اور غیر ملکی اشیا سے انحراف کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ کسی مغربی ملک کے دورے پر چلے گئے اور جاتے جاتے مجھ سے پوچھا کہ تمھیں کچھ چاہیے تو بتاؤ۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتا تھا اور میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اس لیے رِسٹ واچ لانے کی درخواست کی تاکہ امتحان میں کام آسکے۔ واپسی پر انھوں نے 'لارکس' برانڈ کی ایک گھڑی مجھے دی اور ایک میرے پھپھیرے بھائی اشوک دلال کو، جو دوسری پوپھی کا بیٹا تھا اور مجھ سے بیس دن چھوٹا تھا۔ میں تو گھڑی بڑے شوق سے پہننے لگا مگر اشوک اپنے پتاجی کی دی ہوئی فاورلوبا ہی پہنتا رہا۔ ایک روز میں نے پوچھا ''بھئی، تم وہ گھڑی کیوں نہیں پہنتے ہو جو ٹوٹھا جی (صراف صاحب کو گھر میں ہم 'ٹوٹھا جی' کہتے تھے) نے لائی تھی؟'' جواب ملا۔ ''کتنا بے وقوف ہے تو۔ وہ کوئی پہننے لائق گھڑی ہے۔ نہ جانے کہاں سے بیس پچیس روپے کی گھڑی اٹھا کر لائے ہیں۔'' اس نے میرے اندر تجسس کی چنگاری سلگائی۔ میں نے بازار میں دریافت کرلیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک معمولی برانڈ کی گھڑی ہے جو پچیس روپے سے زیادہ قیمت کی نہیں ہے۔ بہت مایوس ہوا اور آخر کار صراف صاحب سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ''ٹوٹھا جی، آپ کو میرے لیے فارین سے اس معمولی برانڈ کے سوا اور کوئی گھڑی نہیں ملی؟'' وہ کچھ نادم سے ہوئے۔ پھر کھڑے ہوکر اپنے وارڈ روب سے اپنی ملیشیا (ایک قسم کا کھدر نما موٹے ریشے کا کپڑا) قمیص نکالی اور مجھے دکھا کر کہنے لگے۔ ''بیٹے یہ دیکھو، یہ ملیشیا قمیص ہے جو میں یہاں سے پہن کر فارین گیا تھا اور وہاں سے بھی یہی پہن کر لوٹا ہوں۔ میرا پورا وارڈروب چیک کرلو، تمھیں کہیں کوئی فارین چیز نہیں ملے گی۔ بس تمھارا

دل رکھنے کے لیے میں نے ممبئی میں یہ گھڑی بیس روپے کی خریدی تھی۔'' اب شرمندہ ہونے کی باری میری تھی۔ کہنے کو وہ اس کی قیمت کچھ بھی بتا سکتے تھے اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ فارین سے لائی ہے مگر انھوں نے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ جو سچ تھا وہ بول دیا۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا صراف صاحب سودیشی آندھولن کے باعث ہاتھ کرگھے سے بنے ہوئے سودیشی کپڑے پہنا کرتے تھے مگر شرط یہ تھی کہ کپڑے صاف ستھرے اور باضابطہ استری کیے ہوئے ہوں۔ ایک روز میں مقامی ٹوئیڈ کا فرن (چوغا) پہن کر ان کے یہاں پہنچ گیا۔ انھیں میرا لباس کچھ پسند نہیں آیا۔ کہنے لگے کہ ایسا لباس پہن کر گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ میں نے پوچھا ''کیوں؟'' کہنے لگے ''باہر مناسب اور زیبا لباس پہن کر نکلنا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ٹوٹھا جی، یہ تو میرا قومی لباس ہے۔ ہر کشمیری کو فرن پہننے پر فخر کرنا چاہیے۔'' وہ آگے کچھ نہ بولے، شاید میری بات کی گہرائی اثر کر گئی تھی۔ مجھے کشمیری لباس پہننے میں کبھی کسی ندامت یا تحقیر کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ میں ایک بار سرینگر کے اعلیٰ ریستوراں پریمیئر میں بانڈی پور کی چادر پہن کر چلا گیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے شیروانی اور نہرو جیکٹ تو فخر کے ساتھ اپنا لیے مگر اپنے مقامی لباس کو کبھی اپنانے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے آزادی کے بعد جنم لیا ہے، اس لیے 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک کا چشم دید نہیں ہوں۔ تاہم کشمیر کی آزادی اور الحاق کے بارے میں جو کچھ بھی جانکاری حاصل ہوئی اس کا خلاصہ کر چکا ہوں۔ یہاں پر اتنا کہنا کافی ہے کہ اس حوالے سے نیشنل ڈیفنس کالج، دہلی (NDC,Delhi) کے لیے میں نے ایک مقالہ 'Genesis of Kashmir Problem and Article 370' قلم بند کیا تھا جو کالج کی لائبریری میں موجود ہے۔ کالج کے قوائد وضوابط کے تحت اسے شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ فی الحال یہاں پر کچھ ضمنی واقعات پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تحریک آزادیٔ کشمیر نے ۱۹۴۷ء کے بعد جو رخ اپنایا وہ اس تحریک کا نشیب بن کر سامنے آتا ہے۔ ۱۹۵۳ء تک سیاست نے کچھ ایسی منزلیں طے کر لیں کہ جموں وکشمیر اور مرکزی حکومتوں کے آپسی رشتوں میں کچھ کھٹاس سی پیدا ہوگئی اور وقت کے ساتھ ساتھ دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس تناتنی کے پیچھے ایک تو زرعی اصلاحات تھے اور دوسرے جموں میں پرجا

پریشد کی ایجی ٹیشن جس پر شیخ محمد عبداللہ قابو نہیں پا رہا تھے۔ سیاسی تدبّر کا مظاہرہ کرنے کے بدلے انھوں نے کشمیر کے الحاق پر ہی سوال اٹھایا جس نے فرقہ وارانہ کشیدگی کو جنم دیا۔ نتیجتاً مرکزی حکومت نے انھیں برخاست کر کے جیل میں ڈال دیا۔ شیخ صاحب نے کرائے کے مصنف سے لکھوائی اپنی سوانح عمری 'آتش چنار' میں اپنی برطرفی کے بارے میں صراف صاحب کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک من گھڑت دلیل پیش کی ہے کہ صراف صاحب نے اپنے لاڈلے سالے، جو محکمہ جیل میں کام کرتے تھے، کی وساطت سے اپنے آفس کی گھڑی چوری کروائی جو بعد میں صراف صاحب کی موٹر کار سے برآمد ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ صراف صاحب سے استعفیٰ مانگا گیا تھا۔ صراف صاحب نے اس واقعہ کی چھان بین کروانے کی بجائے پینترا بدلا۔ واہ کیا دلیل پیش کی ہے اور وہ بھی صراف صاحب کے بارے میں جن کے دامن پر فرشتے نماز پڑھیں۔ یہ تو آسماں پر تھوکنے کے مترادف ہے۔ رادھا کرشن بدکی، جو میرے پتا جی تھے، صراف صاحب کے اکلوتے سالے تھے۔ وہ صراف صاحب کی ہی عطا کردہ دو دکانیں ۱۹۶۱ء تک چلاتے رہے اور پھر کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں نوکر ہو گئے۔ اس لیے سمجھ نہیں آتا کہ ۱۹۵۳ء میں جیل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم سالے صاحب کہاں سے پیدا ہو گئے جنھوں نے گھڑی چرائی جس کی وجہ سے جموں و کشمیر کا ہندوستان سے الحاق خطرے میں پڑ گیا اور شیخ محمد عبداللہ کو تاریخی کلاک ٹاور کی سوئیاں واپس پھیرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ شیخ صاحب نے صراف صاحب پر ایسی تہمت لگا کر دراصل خود کو ہی دنیا کی نظروں سے گرا دیا۔ اس بارے میں بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، میں آج بھی چیلنج کرتا ہوں کہ دونوں شیخ صاحب اور صراف صاحب کی املاک کا احتساب کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کتنے پانی میں تھا۔ صراف صاحب ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک ریاستی کابینہ کے وزیر رہے اور پھر مزید پانچ سال لوک سبھا کے ممبر رہے، اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے رعناواری کے دو آبائی مکان بیچ کر گوگجی باغ میں دو کنال زمین پر ایک آدھا ادھورا تین منزلہ مکان چھوڑ گئے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں ان کے سالے کا بیٹا ہوں جو ملازم ہونے تک صرف ایک سائیکل کا مالک تھا۔ ان کے سالے کے پاس وازہ پور میں ایک ادھورا آبائی مکان تھا جس کی مرمت کے لیے انھوں نے قرضہ اٹھایا تھا اور اس کو چکاتے چکاتے ان کی عمر بیت گئی تھی۔ صراف صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی جو وومنز کالج میں لیکچرر تھیں اور ان کی تقرری

میں ان کے پتا جی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ شیخ صاحب کی بیٹی کی تقرری بھی انہی دنوں کالج میں ہوئی تھی۔ مذکورہ مکان کے علاوہ نہ ان کے پاس زمینیں یا جاگیریں تھیں اور نہ ہی کسی ملکی یا غیر ملکی کمپنی کے حصص۔ اگر صراف صاحب بے ایمانی یا رشوت خوری میں ملوث ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کا نام بخشی غلام محمد کے ساتھ ساتھ کامراج پلان میں نہ آتا یا پھر آئینگر کمیشن میں گھسیٹا نہ جاتا۔ خواجہ غلام محمد صادق نے ان پر بھی بخشی غلام محمد کی طرح کمیشن بٹھایا ہوتا کیونکہ وہ بھی صادق صاحب کے مخالف خیمے کے رکن تھے۔

لوگ کہہ سکتے ہیں کہ صراف صاحب ایک پاپولر رہنما نہیں تھے یا زمانہ ساز سیاست دان نہیں تھے یا پھر کسی دوسرے کا حق مار کے کسی حاجت مند کی ضرورت پوری نہیں کرتے تھے لیکن ان کی دیانت داری اور سیرت کی عظمت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کو ان سے بہت ساری امیدیں تھیں مگر گاندھیائی اصولوں پر کاربند ہونے کے سبب وہ ان کی آرزوئیں پوری نہ کر سکے۔ اس بارے میں چند ذاتی تجربات پیش کر رہا ہوں۔ میں نے پری میڈیکل کا امتحان ۱۹۶۶ء میں ۵۳ فیصدی مارکس لے کر پاس کیا۔ ریاستی اور غیر ریاستی میڈیکل کالجوں کے لیے میڈیکل سیٹیں الاٹ ہوئیں، مسلمان امیدواروں کا بنچ مارک ۵۰ فیصدی مقرر رہا، جبکہ ہندو امیدواروں کا بنچ مارک ۶۲ فیصدی طے کیا گیا۔ پتا جی کا ماننا تھا کہ مربی بیارد مربہ بخور یعنی کامیابی اسی صورت میں ملتی ہے جب کوئی مربی ہو، اس لیے ان کے اصرار پر میں صراف صاحب کے پاس چلا گیا۔ ان دنوں وہ ایم پی لوک سبھا تھے۔ وہ اپنے گھر میں فرش پر بیٹھے کچھ ٹائپ کر رہے تھے۔ میں نے سامنے بیٹھ کر اپنا مدعا بیان کیا۔ ''ٹوٹھا جی، میں نے پری میڈیکل پاس کیا ہے، آپ کسی میڈیکل کالج میں مجھے سیٹ دلوا دیں۔'' وہ خوش ہوئے، مبارکباد دی اور پھر پوچھ لیا۔ ''بیٹے، کون سا ڈویژن حاصل کیا ہے؟'' میں نے جواباً عرض کی۔ ''ہائی سیکنڈ ڈویژن...۵۳ فیصد مارکس ہیں۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے۔ ''سیکنڈ ڈویژن...! بیٹے، فرسٹ ڈویژن ہوتا تو دلوا سکتا تھا، سیکنڈ ڈویژن میں سیٹیں کہاں ملتی ہیں۔'' کچھ اشتعال کے سبب اور کچھ ناامیدی کے باعث میں نے جھٹ سے جواب دیا۔ ''فرسٹ ڈویژن ہوتا تو آپ کے پاس کیوں آتا۔ سیٹ خود ہی مل جاتی۔ سیکنڈ ڈویژن ہے تبھی تو آیا ہوں۔'' صراف صاحب سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''کتنا اچھا ہوتا اگر اپنے بل بوتے پر سیٹ حاصل کرتے، بیساکھیوں پر جینا بھی کوئی جینا ہے۔'' مجھ سے رہا نہ گیا اس لیے دل کی بھڑاس نکالی۔ ''ہاں

آپ صحیح فرماتے ہیں۔ مسلمان ہوتا تو سیٹ گھر لے کر آجاتے مگر کیا کروں پنڈت ہوں، میرے لیے تو سیٹیں نایاب ہیں۔'' میرا اتنا کہنا کہ وہ بہت خفا ہوگئے۔ ان کا جلال پہلی بار دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ بولے۔'' بیٹے، میرے سامنے ایسی بات آج کی سو معاف کرتا ہوں، دوبارہ کبھی نہ کرنا۔ تمھیں کیا معلوم کہ کشمیری مسلمان کے لیے ہندوستان صرف اوڑی سے لے کر قاضی گنڈ تک محدود ہے جبکہ تمھارے لیے ہندوستان کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر کشمیری مسلمانوں کو ہم اس محدود بوتل میں بند کرلیں تو ایک وقت آئے گا کہ وہ یہی بوتل ہمارے سر پر پھوڑ دیں گے۔ سمجھے!'' شاید ان کے یہ کلمات ۱۹۹۰ء میں بطور پیش گوئی ہمارے سامنے آئے۔ میں نے گفتگو کو مزید طول نہیں دینا چاہا۔ مگر آگے جا کر زندگی کے تجربات نے مجھے ان الفاظ میں چھپی حقیقت سے روشناس کرایا۔ معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کی سیاست نے کشمیر کو ملک کی باقی ریاستوں سے حاجز کیا ہے۔ ان کی سیاسی تلقین بازی کے سبب کشمیری غیر ریاستی ماحول میں اجنبیت محسوس کرتے ہیں، اس لیے ایڈجسٹ نہیں کر پاتے۔ ان تجربات سے میرے دل میں مسلمان ہم وطنوں کے تئیں ہمدردی پیدا ہوئی اور میں ایک نئے زاویئے سے سماجی زندگی پر غور کرنے لگا۔ بہت عرصہ بعد جب میں نے مرکزی محکمے میں اعلیٰ عہدہ سنبھالا تو پوپھا جی کے یہ الفاظ مجھے ہندوستان کی اقلیتوں ، درجہ فہرست ذاتوں اور قبائلیوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے رہنمائی کرتے رہے۔ اس گفتگو کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس روز کے بعد میں نے پھر کبھی کسی کے پاس مدد کے لیے ہاتھ نہیں پھیلائے۔

اب تو سارے ملک کی حالت ہی بدل گئی ہے۔ سرمایہ انسان کا کیریئر بنانے میں اہم رول ادا کررہا ہے۔ رشوت خوری، جعلی بزنس، بنک قرضوں کی لوٹ اور انکم ٹیکس چوری کو ترجیح دی جاتی ہے۔ میڈیکل سیٹ کی خاطر پچیس لاکھ روپے اور انجینئرنگ سیٹ کی خاطر پانچ لاکھ روپے بطور کیپٹیشن فیس (Capitation fee) بلیک میں دینا پڑتی ہے۔ جب سے نیٹ (NEET) کا چلن ہوا ہے میڈیکل کالجوں نے ٹیوشن فیس اتنی بڑھا دی کہ بات وہیں کی وہیں پہنچ گئی۔ اگر آپ کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو ہندوستان کے پچاس فیصد کالجوں کے دروازے آپ کے لیے بند ہیں جبکہ باقی ماندہ کالجوں میں ریاست کی مستقل سکونت اور مختلف ریزرویشن کوٹا کی پابندیاں لاگو ہیں۔ دراصل کیپٹیشن فیس کا سلسلہ ایک سوچی سمجھی سکیم ہے جس کو سیاست دانوں اور افسر شاہی نے اپنے مفاد کے لیے لاگو کیا ہے۔ ان کالجوں

میں اس طبقے کے وارثوں کو بنا کسی میرٹ اور جوکھم کے سیٹیں مل جاتی ہیں۔ اکثر و بیشتر کالج سیاست دانوں کی ہی ملکیت ہیں، اس لیے جمع کی گئی رقم ان کی جیبوں یا بے نامی کھاتوں میں چلی جاتی ہے اور پھر الیکشن کے وقت کام آتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔ اب ذرا سوچیے کہ جو طالب علم ۲۵ رلاکھ دے کر ڈاکٹر بن جاتے ہیں، وہ کیا خاک بیماروں کو صحت یاب کریں گے۔ وہ تو چاہیں گے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ بیمار ہو جائیں اور ان سے ڈاکٹری معائنے، کلینکل ٹیسٹوں اور ہسپتالوں میں داخلے کے توسل سے رقم وصول کریں۔ ایسے لوگ صرف روپیہ کمانے اور عیش و آرام سے جینے کے خواہاں ہوتے ہیں اور موقع پاتے ہی غیر ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان جیسا غریب ملک ترقی یافتہ ملکوں کے لیے سستے داموں 'میڈ ان انڈیا' ڈاکٹر اور انجینئر تھاپنے کی فیکٹری بن جاتا ہے۔ پھر ان لوگوں سے قومی جذبے اور ایثار کی توقع رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

۱۹۷۰ء کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں ایم ایس سی کا طالب علم تھا۔ اتوار کو پوپھا جی کے یہاں چلا گیا۔ صراف صاحب جیسا کہ ان کی عادت تھی بستر پر نیم دراز لیٹے ہوئے تھے اور میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے مکالمے کا آغاز کیا۔ ''ٹوٹھا جی، جتنے بھی منسٹر آپ کے رفقائے کار تھے لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہیں (اس زمانے میں لاکھوں کا ذکر ایسے ہوتا تھا جیسے آج کل کروڑوں کا ہوتا ہے)۔ دیکھ لیجیے کس شان و شوکت سے جی رہے ہیں، کیا ٹھاٹ باٹ ہے اور کیسے عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ایک آپ ہیں، بیس سال منسٹر اور پانچ سال ایم پی رہ کر بھی تنگدستی اور محرومی سے جوجھ رہے ہیں۔ میں آپ کے سالے کا بیٹا ہوں۔ آج تک مجھے ایک اچھی سائیکل بھی نصیب نہیں ہوئی، سکوٹر اور موٹر کار کی تو بات ہی نہیں۔'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولے۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میری لمبائی کتنی ہوگی؟'' مجھے ان کے سوال کی معنویت سمجھ نہیں آئی تاہم بغیر کسی تامّل کے جواب دیا۔ ''ہوگی یہی کوئی چھ فُٹ سے زیادہ۔'' انھوں نے ایک اور سوال پوچھا۔ ''اور تمہاری پوپھی کی؟'' میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''ہوگی کوئی تین چار فُٹ۔'' انھوں نے پھر سوال داغا۔ ''ہم دونوں کی شکل و صورت کو دیکھ کر کیا تمہیں لگتا ہے کہ ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں؟'' میں نے بنا سوچے جواب دیا ''نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ ستم ظریفانہ انداز میں گویا ہوئے۔ ''بہت

اچھا۔ اب ہماری ذہنی صلاحیت اور رویے پر غور کرو۔ میں ہندو مسلم سکھ عیسائی، کسی بھی فرقے یا ذات کے آدمی کے ساتھ اٹھتا ہوں، بیٹھتا ہوں اور کھاتا پیتا ہوں مگر تمھاری پوپھی کو اگر کسی اور مذہب یا ذات کا آدمی غلطی سے چھو بھی لے تو وہ پریشان ہوتی ہے اور پہلی فرصت میں نہا لیتی ہے۔ بڑے بڑے عہدیداروں کی بیویاں ان کے ساتھ آفیشل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں مگر مجھے اکثر اکیلا ہی جانا پڑتا ہے کیونکہ تمھاری پوپھی وہاں جل بن مچھلی کی طرح اضطراب میں رہتی ہے۔ کتنی بڑی ذہنی خلیج ہے یہ!'' میں فکرمند ہو گیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سو تو ہے....'' اس کے بعد وہ روحانی خلیج کی حوالہ دینے لگے۔ ''اور پھر دیکھو روحانی طور پر ہمارا اَن میل (Incompatibility)۔ وہ ان پڑھ ہے، رسم و رواج، چاہے کتنے بھی فرسودہ کیوں نہ ہوں، ان پر اندھ وشواس کرتی ہے۔ اس کے لیے بھکتی سب کچھ ہے، گیان مارگ اور کرم مارگ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جبکہ میں انسانی وجود کو سمجھنے کی کوشش میں گیان پراپت کرتا ہوں، رشی منیوں کی باتوں کا تجزیہ کرتا ہوں مگر سائنسی نظریات، نئی ایجادوں اور طور طریقوں سے منہ نہیں موڑتا۔ میں اپنے ذہن کے دروازے کھلے رکھتا ہوں۔ کیا اس کے بعد تمھیں لگتا ہے کہ ہم فکر و سوچ اور روحانی طور پر ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں؟ نہ جسمانی مطابقت، نہ ذہنی مطابقت اور نہ ہی روحانی مطابقت....! پھر ہم دونوں میں باہمی یگانگت کے لیے مشترک صفت کونسی ہے؟'' وہ کچھ دیر رک گئے اور پھر گویا ہوئے۔ ''بیٹے، اگر میں نے دولت کی لالچ کی ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ میں سگریٹ، شراب اور خوبصورت عورتوں پر للچایا نہ ہوتا اور عین ممکن ہے کہ میں نے کئی دوسرے رفیق کاروں کی مانند اپنی رفیق حیات کو چھوڑ چھاڑ کر دوسری شادی کر لی ہوتی۔ تب تو میں تمھارا پوپھا نہ کہلاتا بلکہ کسی اور کا پوپھا بن گیا ہوتا۔ اُس صورت میں تم ایسے ہی ہوتے جیسے اس وقت ہو جبکہ فائدہ کسی اور کو ہوتا۔ کم سے کم اس وقت تم فخر سے مجھے اپنا پوپھا تو کہہ سکتے ہو۔ ہے نا......؟'' ان کے چہرے پر دوبارہ وہی شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر مجھے چائے بنوانے کے لیے پوپھی کے پاس بھیج دیا۔

ایک انوکھی سیکھ تھی اس طویل مکالمے میں۔ انسانی ہم آہنگی اور توافق کی عجیب سی مثال! اتفاق سے کچھ ہی دن پہلے میں نے اپنی معشوقہ کو خط لکھ کر اسے رشتہ منقطع کیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ ہم دونوں کے بیچ بہت بڑی خلیج ہے۔ اس مکالمے کے ترنت بعد میں تلافی کی غرض سے دہلی چلا گیا تا کہ اسے یہ کہہ

دوں کہ وہ میرے خط پر کوئی دھیان نہ دے اور میں اسے شادی کرنے کے لیے ہر صورت میں تیار ہوں۔ مگر اسے ملنے کے بعد پتا چلا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور میں اپنا سامنہ لے کر واپس کشمیر چلا آیا۔

ایک روز میں اتفاق سے پوچھا کے یہاں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسرے سائیڈ سے ایک خوش گلو نسوانی آواز آئی۔ ''صراف صاحب ہیں؟'' ''جی ہیں، ابھی بلاتا ہوں۔ آپ ہولڈ کیجیے۔'' میں نے صراف صاحب کو شتابی بلایا۔ وہ تھوڑی دیر تک بات کرتے رہے اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ جلدی سے کپڑے بدل کر ڈرائیور کو بلایا اور چل دیے۔ قریب آدھے گھنٹے کے بعد لوٹ آئے تو مجھے متجسس پایا۔ کہنے لگے۔ ''معلوم ہے کس کا ٹیلی فون تھا؟ بخشی صاحب کی دوسری بیوی، خورشید جلال الدین کا۔ بخشی صاحب! جس کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کی قسمت کا ستارہ کبھی ڈوب ہی نہیں سکتا۔ بیگم خورشید نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ اس کے گھر میں بجلی گل ہونے کے سبب اندھیرا چھا گیا تھا۔ اجالا کرنے کے لیے نہ موم بتیاں تھیں اور نہ ہی کوئی اور سادھن۔ گھر میں اور کوئی آدمی بھی نہ تھا جو بازار سے موم بتیاں لا کر دیتا (بخشی غلام محمد ان دنوں زیر حراست تھے)۔ جب سے اس نے بخشی صاحب سے شادی کر لی ہے اس کے دل میں یہ وہم پیدا ہوا ہے کہ بخشی صاحب کی پہلی بیوی کے بچے اس کو مارنے کی سازش کر رہے ہیں اور کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بیٹے، جب بخشی صاحب ریاست کے پرائم منسٹر تھے، ان کا واش روم دنیا کی بہترین صابنوں سے مہکا کرتا تھا، لیونڈر، صندل، گلاب اور بھی نہ جانے کیا کیا..... اب تو یہ حالت ہے کہ نہ وہاں صابن ملتی ہے اور نہ ہی خوشبو۔ اس کے برعکس میرے واش روم میں اُس وقت بھی لائف بوائے صابن ہوتی تھی اور آج بھی وہی صابن دستیاب ہے۔''

جہاں تک مجھے معلوم ہے بخشی صاحب کی پہلی بیوی دیوی سمان تھیں۔ حلیم، نیک اور رحم دل مگر ان پڑھ اور گرہستی ٹائپ۔ بخشی صاحب نے دوسری شادی کیا کی کہ چیف منسٹری گئی، رشوت خوری کے سبب آئینگر کمیشن کی انکوائری ہوئی، انھیں جیل کی ہوا کھانی پڑی اور ایک بار جب وہ مجاہد منزل کے راستے اپنی کار میں جا رہے تھے تو ہجوم نے پکڑ کر ان پر جوتوں کی بارش کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ ان کا وہاں سے بچنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ دوسری شادی کا صدمہ پہلی بیوی برداشت نہ کر پائیں اور جلد ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ مرحومہ میری ماں کے مرنے کے بعد ہمارے گھر پر تعزیت کے لیے آئی تھیں اور

ہمارے تحفظ کے لیے انتظامات کروائے تھے۔ مہاراج گنج میں وہ کار سے اتریں اور پھر پیدل چل کر گھر تک آئیں۔ راستے میں کسی کا تولیہ گرا تھا جس پر ان کا پاؤں پڑ گیا۔ دفعتاً انھیں گالیوں کی بوچھار سننے کو ملی۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور کہا کہ ''میں اپنے میکے جا رہی ہوں وہاں سے دھو کر واپس بھجوا دوں گی۔'' یہ تھا ان کی شرافت اور حلیمی کی نمونہ! نہ غصہ نہ جلال اور نہ یہ کہنا کہ تمھیں معلوم نہیں تم کس سے بات کر رہی ہو! اتنا ہی نہیں انھوں نے مصیبت کے دنوں میں بخشی صاحب سے یہ کہہ کر کہ خدارا اس کے گھر کی حالت تو دیکھ لو میرے پتاجی کی کشمیر سے حیدر آباد ٹرانسفر بھی رکوائی تھی۔

کافی عرصہ بعد بخشی صاحب کی رحلت ہوئی۔ لوگوں نے شیخ محمد عبداللہ کی شہ پر لاش کو اس کے آبائی قبرستان میں دفنانے پر احتجاج کیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو بخشی صاحب کو کبھی 'بتہ' بب (رزق رساں) کہتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس کو کشمیر میں کہیں بھی جگہ نہیں ملنی چاہیے کیونکہ وہ غدار ہے۔ ایک نعش کے ساتھ اتنی بے حرمتی...! میں نے ۱۹۷۵ء کے معاہدے کے بعد ہفت روزہ 'عقاب' میں جلی حروف میں لکھا تھا، ''بخشی صاحب کو قبر سے نکال دو تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ شیخ صاحب ان کے جوتے چرا کر لے گئے۔'' بخشی صاحب کو تو اپنے کرموں کا پھل مل گیا مگر آج وہی کشمیری شیخ صاحب کی قبر کھودنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ تناقض محال ہی ہے کہ آج شیخ صاحب کی قبر پر فوجی چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے ہیں۔

مذکورہ واقعات نے مجھے صراف صاحب کا معتقِد بنا لیا۔ ان کے اصولوں کی سچائی میرے سامنے کھل کر آنے لگی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ''انسان کی شخصیت کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ جسمانی، ذہنی اور روحانی (Physical, Mental and Spiritual)۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان تینوں کے درمیان اعتدال پیدا کرے۔ ہمیں ان تینوں پہلوؤں کی نشو ونما کی جانب دھیان دینا چاہیے۔'' کبھی کبھی میں چھیڑنے کی غرض سے سوال اٹھاتا ''یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تینوں پہلوؤں پر ایک سمان دھیان دے پائیں۔ دارا سنگھ کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ذہنی اور روحانی پہلوؤں پر غور کرے، شیکسپیئر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ جسمانی اور روحانی پہلوؤں کی آبیاری کرے ناممکن ہے اور پھر سنت کبیر سے یہ امید رکھنا کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بھی فعال رہے کہاں کی دانشمندی ہے۔ ان تینوں پہلوؤں میں اعتدال لانے سے ایک اوسط

درجے کا آدمی بن سکتا ہے مگر وہ کسی ایک شعبے میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے باقی پہلوؤں کو نظر انداز کرنا لازم ہے۔'' اس مکالمہ کا کوئی حل نہیں نکلا، بہرحال میں ان کی باتیں گانٹھ باندھ کر رکھ لیتا تھا۔

پنڈت شام لال صراف، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے پندرہ سال منسٹر رہے اور پھر پانچ سال ممبر پارلیمنٹ۔ جب وہ پہلی بار ایم پی بنے اس وقت ایم پی نامزد ہوتے تھے۔ صادق صاحب کے زمانے میں کئی مرکزی قوانین ریاست میں لاگو ہو گئے اس لیے دوسری بار انھیں لوک سبھا کے لیے انتخابات لڑنے کی ضرورت پڑی۔ صراف صاحب جن دنوں لوک سبھا کے ممبر تھے انہی دنوں وزیر اعظمی کے دو دعوے داروں، مرار جی ڈیسائی اور اندرا گاندھی، کے بیچ ٹھن گئی اور ووٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ صراف صاحب نے اندرا گاندھی کی استدعا کے باوجود مرار جی ڈیسائی کی کھل کر حمایت کی مگر اندرا گاندھی نے جیت درج کی۔ اس کا خمیازہ صراف صاحب کو آگے اٹھانا پڑا۔ دوسرے جنرل الیکشن میں صراف صاحب نے اننت ناگ حلقۂ انتخاب سے کاغذاتِ نامزدگی بھر لیے۔ چنانچہ وہ برسر اقتدار پارٹی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے رکن نہ تھے، اندرا گاندھی کی شہ پر ان کے کاغذاتِ نامزدگی رد کر دیے گئے اور وہاں سے ان کا حریف بلا مقابلہ کامیاب قرار دیا گیا۔ اننت ناگ کا ڈپٹی کمشنر عبدالخالق تھا جس نے یہ کارروائی انجام دی۔ اس بات کا اعلان اس وقت ہوا جب صراف صاحب انتخابی مہم کے لیے بذریعہ کار سرینگر سے اننت ناگ جا رہے تھے، اس لیے مایوس ہو کر گھر لوٹ آئے۔ کورٹ نے بھی فیصلہ ان کے خلاف سنایا۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ ایک ایسے سیاسی لیڈر کے کاغذات نامزدگی رد کیے گئے جو تین بار اسمبلی کے ممبر اور ایک بار ممبر پارلیمنٹ رہ چکے تھے۔ ہندوستانی جمہوریت میں اس سے بڑھ کر مذاق اور کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ برس بعد اندرا گاندھی نے ایک خط کے ذریعے ان کی صلاحیتوں اور حصولیابیوں کا اعتراف کیا اور انھیں کاٹیج انڈسٹریز بورڈ کے چیئرمین کا پوسٹ آفر کیا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ خط میری نظروں سے گزرا ہے۔ بقول فراق گورکھپوری:

شِو کا وِش پان تو سنا ہوگا
میں بھی اے دوست پی گیا آنسو

☆☆☆

عہد جوانی رورو کاٹا!

سکول سے فارغ ہو کر میں نے سری پرتاپ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فرسٹ ٹی ڈی سی (پری میڈیکل) پاس کیا۔ میڈیکل کالج میں داخلہ اس لیے نہیں ملا کہ مجھے امتحان میں فرسٹ ڈویژن نہیں ملا تھا اور میں میرٹ لسٹ برائے ہندو میں شامل نہ ہو سکا۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ سیکنڈ ڈویژن جو کچھ بھی ملا کسی پرائیوٹ ٹیوٹر کے بغیر اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ملا تھا۔ حسرت تو اس بات کی رہی کہ انگریزی مضمون میں، جس پر مجھے ناز تھا، بہت کم نمبرات ملے تھے۔ پتاجی کے ایک دوست پروفیسر ٹی این بھان سے پوچھا تو انھوں نے سارے معاملے کا تجزیہ کر کے سمجھا دیا۔ بقول ان کے چونکہ میں نے پانچ سوالات میں سے گرامر کے ایک سوال کا جواب نہیں لکھا تھا اور باقی چار جوابات میں ممکنہ صرف ونحو کی غلطیوں کے سبب کچھ مارکس کٹ گئے ہوں گے اس لیے جتنے بھی نمبرات ملے تھے، واجبی تھے۔ ان کی بات کی تصدیق یوں ہوئی کہ میرے ایک دوست نے بازاری 'میڈ ایزی' کتاب سے یاد کیے ہوئے جوابات جوں کے توں لکھے تھے اور مجھ سے دگنے نمبر حاصل کیے تھے۔ بہر حال بھان صاحب کی رہنمائی نے مجھے مستقبل میں امتحانات کے لیے صحیح لائحہ عمل اختیار کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ علاوہ ازیں میں نے نوکری کے دوران برٹش لائبریری دہلی کی ممبر شپ لے لی اور 'انگلش فار فارین سٹوڈنٹس' سیریز کا مطالعہ کر کے کافی حد تک اپنی انگریزی سُدھار لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے انگریزی خوش نویسی بھی سیکھ لی۔

میری ایک اور بری عادت تھی، وہ یہ کہ میں امتحانات کی تیاری کرنے میں انتخابیت سے کام لیتا تھا۔ کچھ اہم موضوعات کو بڑی گہرائی اور گیرائی سے سمجھنے کی کوشش کرتا جبکہ باقی ماندہ موضوعات کو نظر انداز کرتا۔ مثال کے طور پر میں نے گریجویشن میں ملیریا پیراسائٹ پر بڑی بہن کی ایم ایس سی (زولوجی) کتابوں سے نوٹس بنا لیے تھے۔ جامع مطالعہ کے باعث میں امتحان میں طویل جوابات لکھنے پر مجبور تھا۔

نتیجے میں وقت ختم ہو جاتا اور ایک دو سوال چھوٹ جاتے۔ پروفیسر بھان کی دلیل سے مجھے یہ احساس ہوا کہ امتحان میں سبھی سوالوں کے لیے منصفانہ طور پر وقت بانٹنا چاہیے اور ہر سوال کا جواب لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کسی سوال کا جواب متعینہ وقت سے تجاوز کرے تو اسے وہیں چھوڑ کر اگلے صفحے سے دوسرے سوال کا جواب لکھنا چاہیے۔ بعد میں اگر وقت مل جائے تو واپس آ کر اس جواب کو مکمل کرنا چاہیے۔

طالب علمی کے زمانے میں ایک اور مسئلے سے جوجھنا پڑتا تھا۔ کشمیر میں موسم سرما میں اکثر بجلی سپلائی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی کمرے میں روشنی اس قدر پھیل جاتی جیسے مقبرے پر کسی نے چراغ رکھ دیا ہو۔ انجام کار مٹی کے تیل کا گلوب لیمپ جلا کر پڑھائی کرنا پڑتی تھی چاہے بجلی ہو یا نہ ہو۔ قومی اخبارات جو دہلی سے شائع ہوتے تھے، سرینگر دن کے تین چار بجے پہنچ جاتے یا کبھی کبھی موسم کی خرابی کے سبب پہنچتے ہی نہ تھے۔ اس طرح ہم لوگ سکول یا کالج سے آنے کے بعد ہی انھیں پڑھ سکتے تھے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ درس گاہ میں دن بھر مغز ماری کرنے کے بعد دوستوں کے ساتھ کھیلیں یا پھر گھر میں بیٹھ کر تیل کی بتی کے نیچے اخبار پڑھیں...! یوں بھی میں صبح بہت دیر سے جاگتا تھا، پھر دن بھر درس گاہ، واپسی پر کچھ تفریح اور اتنی دیر میں ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ موسم سرما میں تو بہت جلدی سورج ڈوب جاتا تھا، اس لیے رات میں پڑھائی کرنے کی ضرورت پڑتی تھی اور ساتھ میں چائے کی چسکیاں۔ اب بھلا کون بار بار چائے بنانے کچن میں جاتا، بس بغل میں بند کھڑکی کے داسے پر مستقل طور پر سٹوو رکھا تھا اور اسی پر چائے بنا کر پی جاتا تھا۔ چائے نوشی کی ایسی بری عادت تھی کہ روزانہ بیس پچیس کپ اندر چلے جاتے۔ کافی ہاؤس میں کافی پینا اور ہوٹلوں میں چائے نوش کرنا میری طبیعت ثانی بن گئی تھی جو تب تک چھوٹ نہیں پائی جب تک ایک آیوروید ڈاکٹر نے بواسیر (Piles) کے سبب مجھے کلیتہً منع نہ کیا۔ ایم ایس سی کے دوران ایک ایچ ایم وی کا ٹو اِن ون سستے میں خرید لیا تھا جس پر گانے سننے کے لیے کالے توے جیسے میوزیکل ریکارڈس لگانے پڑتے تھے۔ چنانچہ مجھے غزلیں اور پرانے فلمی گیت سننے میں مزہ آتا تھا اس لیے ان ریکارڈس کی لائبریری بنا رکھی تھی جس میں زیادہ تر بیگم اختر اور کے ایل سائیگل کے ریکارڈس تھے۔ ان کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام سے روز رات کو تعمیل ارشاد پروگرام اور لاہور سے جمعہ کی شب

قوالیوں کا پروگرام نشر ہوتا تھا جو میری کمزوری بن گئے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ میں صابری برادران کا دیوانہ اس سمئے سے بن چکا تھا جب ان کا کہیں مارکیٹ میں نام بھی نہ تھا۔ میری خوش نصیبی یہ تھی کہ لکھنؤ میں پروبیشن کے دوران صابری برادران کو روبرو سننے کا موقع مل گیا۔ سامعین کے وجد کی حالت بیان کرنے کے لیے شاید ہی الفاظ مل سکیں۔ ہال میں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ذرّہ ذرّہ ان کی آواز میں شریک ہو رہا ہے اور سرمستی میں تھرک رہا ہے۔

سری پرتاپ کالج، سرینگر سے میں نے ۱۹۶۸ء میں بی ایس سی (آنرس) کامیاب کیا۔ بی ایس سی میں میرے سبجکٹ علم نباتات (بوٹنی)، علم حیوانات (زولوجی)، علم کیمیات (کیمسٹری) اور انگریزی تھے۔ کسی مضمون میں آنرس کرنے کے لیے دورانیے کی توسیع کے بغیر اضافی نصاب کی پڑھائی کرنا پڑتی تھی۔ میں نے علم نباتات میں آنرس کیا۔ جماعت میں صرف آٹھ طلبہ تھے جن میں سے دو پاس ہو گئے اور ان میں سے ایک، وجے بھان، نے پڑھائی چھوڑ کر پیٹرس لومبا یونیورسٹی، یو ایس ایس آر کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ اس طرح اس سال میں ہی ایک اکیلا بچ گیا جس کو آنرس کی ڈگری مل گئی۔ ایس پی کالج میں ایک سادہ زندگی بسر کرنے والے، شریف النفس، نیک سیرت، ہنس مکھ، خوش اخلاق اور ایمان دار لکچرار تھے جن کا نام بشیر احمد تھا۔ شہر کے پائیں علاقے حول میں رہتے تھے۔ اس نام سے دو تین اور بھی لیکچرر تھے مگر ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے میرے ذہن پر ایک انمٹ چھاپ چھوڑ دی۔ کلاس میں ایسے پڑھاتے جیسے اپنی اولاد کو پڑھا رہے ہوں۔ موسم گرما میں میں نے ان کو دو تین بُش شرٹ و پینٹ اور موسم سرما میں دو سوٹس سے زیادہ اور کچھ پہنتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سننے میں آتا تھا کہ وہ خود کو تمام تازہ تبدیلیوں سے آگاہ رکھنے کے لیے کتابوں کی خریداری پر اپنی آمدنی کا کثیر حصہ خرچ کرتے تھے اور دوسرے اساتذہ کی طرح کبھی پرائیویٹ ٹیوشن نہیں لیتے تھے۔ بی ایس سی (آنرس) کے دوران انھوں نے ایک دو بار مجھے گھر بلا کر اپنے نوٹس نقل کرنے کے لیے دے دیے کیونکہ اس زمانے میں زیراکس کی سہولت نہیں تھی۔ حال ہی میں میری ایک تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مبنی کتاب 'عصری تقاضے' شائع ہوئی ہے جس کو میں نے اپنے اساتذہ محمد یٰسین صاحب، شمبھوناتھ کاچرو صاحب، بشیر صاحب اور جی ایم وفائی صاحب کے نام معنون کیا ہے۔ گریجویشن کے دوران میں کیمسٹری لیبارٹری میں سالٹ انیلسز

(Salt Analysis) کے تجربات بڑے انہماک سے کرتا تھا اور اس کے بعد نوٹس بناتا تھا۔ کچھ کتابوں کی مدد سے میں نے اس حوالے سے ایک کتابچہ قلم بند کیا۔ میرے پھیرے بھائی نے اسے شائع کروانے کی کوشش کی مگر ناتجربہ کاری کے سبب ہمیں رائلٹی کے بارے میں نہ جانے کیا زعم تھا کہ ناشر کی شرائط منظور نہیں کیں اور نتیجے میں وہ مسودہ ورق ورق بکھر گیا اور میری ساری محنت ضائع ہوگئی۔

گریجویشن کے اواخر ہی میں میری صحت بگڑ گئی۔ وجہ ایک ڈاکٹر کی لاپرواہی تھی جس نے اینٹی بایوٹک دوائی وائبرامائسٹین ضرورت سے زیادہ مقدار میں تجویز کی۔ نتیجے میں مجھے کولائٹس (ورم قولون) کی شکایت ہوگئی اور خونی دست لگ گئے جو بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ شاید سپر بگ (Superbug) کا اثر تھا۔ فائنل امتحانات سے پہلے نوجوان پھیرے بھائی کی ناگہانی موت واقع ہوئی جس سے سارا خاندان ہیجان و اضطراب میں مبتلا ہوا۔ اس طرح میری بیماری کے پیچھے ذہنی تناؤ کا بھی بڑا ہاتھ رہا اور بہت برسوں تک اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کئی ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کیا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا البتہ اورئینٹل کالج میں ایک ہم جماعت کی توسط سے گیسٹر وانیٹرولوجسٹ حامد درّانی سے مشورہ لیا، اس نے ہسپتال میں اینڈوسکوپی (Endoscopy) کر کے مرض کی صحیح تشخیص کی اور پھر ان کی دوائیوں سے بہت حد تک صحتیاب ہوگیا۔ بیماری کے سبب میرا وزن کافی گھٹ گیا اور میں نرکل کی مانند لمبا، کمزور اور بدنما لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے مصالحے دار کھانوں، تلی ہوئی چیزوں اور چائے و کافی سے مکمل پرہیز کرنے کی ہدایت دی۔ باقی چیزوں سے تو میں نے برسوں پرہیز کیا مگر چائے سے چھٹکارا پانا میرے بس میں نہ تھا۔ نوکری لگنے کے بعد میری پہلی پوسٹنگ چنڈی گڑھ ہوئی جہاں پانی اور ہوا اتنا صاف ستھرا تھا کہ اس بیماری سے کافی حد تک چھٹکارا ملا۔ کبھی کبھار کھانے پینے میں اب بھی تھوڑی سی غفلت ہو جائے تو پریشانی ہوتی ہے۔ اس بیماری کے ضمنی اثر سے بعد میں بواسیر سے بھی جوجھنا پڑا۔

کھیل کود تو پہلے ہی چھوٹ گیا تھا، پھر اس بیماری نے آ دبوچا، اس لیے گھر سے باہر جانا بہت کم ہوتا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے تاش کھیلنے کی عادت پڑ گئی جس کے ساتھ کچھ عنصر جوئے کا بھی ہوتا تھا مگر صرف اس حد تک جتنی بنا کسی جوکھم کے ہماری استطاعت ہوتی تھی۔ دن بھر لگے رہتے تھے، شام تک چار پانچ روپئے ایک جیب سے دوسری جیب میں چلے جاتے۔ پھر دوسرے روز بازی پلٹ جاتی تھی۔ اس

طرح یہ کھیل جوئے کے بدلے محض تفریح بن کر رہ گیا تھا۔ بیٹھک کبھی میرے گھر میں لگتی، کبھی کسی اور کے گھر میں۔ کبھی کبھی ہم ایک مسلم دوست کے گھر جاتے تھے اور دن بھر کھیلتے تھے۔ اس کی شفیق اور رحم دل والدہ نمکین چائے کا بڑا سماوار اور خود اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چپاتی سائز کی رومالی روٹیاں سامنے رکھ دیتی تھیں اور ہم مسلسل پانچ چھ کپ چائے پی جاتے تھے۔ وہ محبتیں آج کے زمانے میں کہاں ملتی ہیں۔

میرے دوست اکثر فلمیں دیکھنے چلے جاتے مگر مجھے فلموں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن میں والدین کے ساتھ 'مس میری' دیکھی تھی، پھر بہت برسوں بعد 'سمپورن رامائن'، 'ان پڑھ' اور 'آئی ملن کی بیلا'۔ پہلی فلم جو میں نے دوستوں کے ساتھ شیراز سینما کے تھرڈ کلاس میں دیکھی تھی اس کا نام تھا 'سنگم'۔ انگریزی فلمیں تو گنی چنی ہی دیکھی ہیں مثلاً My Fair Lady, The Sound of the Music, The Agony and the Ecstacy, Blow Hot and Blow Cold & John F Kennedy۔ ان ہی دنوں مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ میرے ماما جی مکھن لال نہرو انگریزی تھرلر جیسے ارل سٹینلے گارڈنر کے ناول جن میں مشہور کردار پیری میسن ہوتا تھا، جیمز ہیڈلی چیز اور اگاتھا کرسٹی وغیرہ روزانہ پڑھا کرتے تھے مگر مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ ان کے گھر میں اردو افسانوں کے مجموعے اور ناول بھی ملتے تھے جو ان کے علاوہ مامی جی بھی پڑھتی تھیں۔ جب بھی میں وہاں قیام کرتا تھا تو ان میں سے کوئی کتاب پڑھ لیتا۔ کرشن چندر ان کا پسندیدہ رائٹر تھا اس لیے میں نے بھی اس کے کئی افسانے اور ناول پڑھ لیے۔ اس کے تین چار افسانے جیسے کتاب کا کفن، کالو بھنگی، بھگوان کی آمد، چاچا مہرو وغیرہ مجھے بہت پسند آئے تھے اور چاہتا تھا کہ ان کی اور بھی کتابیں پڑھ لوں۔ دراصل طالب علمی کی عمر میں ہر آدمی انقلابی ہوتا ہے اور انقلابی لٹریچر ہی پسند کرتا ہے۔ اس دور میں انگریزی کے کئی ماہر نفسیات و جنسیات کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جو کوک شاستر نہیں بلکہ سنجیدہ ٹائپ کی ہوتی تھیں۔ یہ عادت بہت وقت تک رہی اور میں نے جنس کے موضوع پر کم سے کم بیس پچیس مستند کتابیں پڑھ ڈالیں۔ دراصل جب پڑھنے کا ڈھب آیا تو جماعتیں ختم ہو گئی تھیں اور ڈگریاں بے معنی ہو چکی تھیں۔ اِدھر ہندی کی پڑھائی من کو نہیں بھائی اور بہت کوشش کر کے بھی ہندی فکشن میں دلچسپی پیدا نہیں ہوئی حالانکہ دیدی کی وساطت سے دت بھارتی، عادل رشید اور گلشن نندہ کے ہندی ناول پڑھنے کا موقع مل گیا تھا۔ دھیرے

دھیرے میری دلچسپی گاندھیائی لٹریچر میں بڑھ گئی۔ گاندھی جی کی کئی کتابوں کا میں نے بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا جیسے ان کی سوانح عمری، ستیہ گرہ، گاندھیائی اقتصادیات، صحت کی کنجی وغیرہ۔ یہ کتابیں نوجیون ٹرسٹ سے بذریعہ وی پی پی منگوانی پڑھتی تھیں مگر بہت سستی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں گاندھی جی کے اصولوں کا بہت حد تک پابند ہوگیا۔ سادہ زندگی بسر کرنا، سادہ کپڑے پہننا، دھن دولت اور مال جائیداد کی حرص نہ کرنا، غیر ملکی اشیا کا استعمال نہ کرنا وغیرہ میرا شیوہ بن گیا۔ البتہ غصے اور خواہشِ نفسانی پر آج تک قابو نہ پا سکا۔ مذکورہ خصائل تمام عمر میری زندگی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔

بی ایس سی آنرز کر کے میں نے ایم ایس سی (بوٹنی) میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ علم حیوانات اور کیمیات میں مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ بہت اڑچنیں آئیں۔ وہی داخلے کے لیے فرقہ وارانہ میرٹ کا چکّر اور سفارشیں۔ بی ایس سی میں بھی مجھے سیکنڈ ڈویژن ہی ملا تھا۔ اگر میں ایسا کہوں کہ مجھے زندگی کے ہر امتحان میں سیکنڈ ڈویژن ملا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ پتا جی ایک بااثر شخص کو جانتے تھے، ان کا سفارشی خط لے کر ہم ڈاکٹر پی کاچرو، صدر، شعبۂ علم نباتات کی رہائش پر پہنچ گئے۔ انھوں نے بھروسہ دلایا کہ وہ مجھے سیٹ دے سکتے ہیں بشرطیکہ آنرز کا نتیجہ جلدی آجائے اور اس میں مجھے کامیابی مل جائے۔ اِدھر مسئلہ یہ تھا کہ آنرس کا رزلٹ نکل نہیں رہا تھا اور اُدھر ایم ایس سی کی سیٹیں بھری جارہی تھیں۔ مجھے اپنا ایک سال ضائع ہوتا نظر آرہا تھا۔ یونیورسٹی تو اپنے وقت پر ہی نتیجے کا اعلان کر سکتی تھی۔ آخر طے پایا کہ میرا رزلٹ رازدارانہ طور پر بند لفافے میں شعبۂ بوٹنی کے صدر کو بھیجا جاسکتا ہے۔ فیصلہ تو ہوا مگر دفتری طوالت کا کیا کیجیے۔ پتا جی نے اپنے دوست پروفیسر ٹی این بھان کی معرفت سے یونیورسٹی کے اسسٹنٹ کنٹرولر امتحانات، سی ایل کول، سے رابطہ کر لیا جن کے پاس رزلٹ محفوظ تھا۔ پتا جی بھانپ گئے کہ وہ کچھ آنا کانی کر رہے ہیں۔ انھوں نے کینٹین کے ایک بیرے کو پہلے ہی سے ایک سو روپیہ بطور بخشش دے کر یہ ہدایت دی کہ جونہی ہم کول صاحب کے کمرے میں جائیں گے تم کسی بہانے اندر آکر سلام کرنا اور میرے آرڈر پر جلدی سے چائے لے کر آجانا۔ حسب ہدایت وہ کمرے میں آیا اور ہنس ہنس کر پتا جی کو کورنش بجالائی گویا بہت عرصے سے جانتا ہو، پھر پتا جی کے کہنے پر شتابی چائے اور کباب لے کر آگیا۔ چائے پی کر کول صاحب کا رویہ ہی بدل گیا، جلدی سے اٹھے، الماری سے مارکس رجسٹر برآمد کی، میرے نتیجے کو ایک شیٹ پر اتارا اور اپنا دستخط و

مہر لگا کر لفافے میں بند کر دیا۔ پھر مہر بند کرنے کے بغیر ہی پتا جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پتا جی نے شکریہ ادا کیا، کمرے سے باہر نکلے اور سیدھے ڈیپارٹمنٹ پہنچے۔ لفافہ کاچرو صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے نتیجہ دیکھ کر مجھے دوسرے دن فیس جمع کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے سو روپے کا کمال دیکھ لیا۔ اس زمانے میں ایک سو روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔

داخلہ ہونے کے بعد کئی مہینے یوں ہی بیت گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایم ایس سی میں ڈاکٹر پی کاچرو صاحب کی بروقت مدد سے مجھے سیٹ ملی تھی۔ مگر میری بدنصیبی یہ رہی کہ اِکالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر وی کول میری ہمسائیگی میں رہتے تھے اس لیے ان کے کمرے میں میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گھر بھی آتا جاتا تھا یہاں تک کہ ان کی بہن کو کبھی کبھار پڑھاتا بھی تھا۔ ڈاکٹر کاچرو اور ڈاکٹر کول کا آپس میں سانپ نیولے کا بیر تھا مگر میں اس اندرونی سیاست سے بے خبر تھا۔ کاچرو صاحب کو جب اس بات کی خبر ملی تو انھوں نے میرا نام دشمن کیمپ کی فہرست میں درج کر لیا جس کا خمیازہ مجھے آگے جا کر بھگتنا پڑا۔ یہ الزام میرے ساتھ تب تک چپکا رہا جب تک میں یونیورسٹی سے فارغ نہ ہوا۔ حالات نے کاچرو صاحب اور میرے درمیان تعلقات میں مزید کھٹاس پیدا کر دی۔

دوسری طرف گھر میں انتشار بڑھ رہا تھا۔ بڑی بہن نے اپنی مرضی سے شادی کرنے کی ٹھان لی تھی جبکہ میں اس شادی کے حق میں نہیں تھا۔ آئے دن اس بات کو لے کر گھر میں جھگڑے ہوتے تھے۔ سب لوگ اس کی طرف داری کر رہے تھے۔ اس بارے میں صراف صاحب سے بھی ایک بار تو تو میں میں ہوئی، وہ شادی کے حق میں تھے اس لیے مجھ سے الجھ پڑے۔ شوراتری کے بعد ’سلام‘ کا دن تھا، میں مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ان کے گھر سے نکلا، ہری سنگھ ہائی سٹریٹ پر شراب کی دُکان سے پہلی بار آٹھ روپے کا ’ہے وارڈس‘ کا پوّا خرید لیا اور جا کر اپنے کمرے میں چپ چاپ پی لیا۔ حالانکہ بعد میں شراب پینے کے کئی اور موقعے ملے خاص کر فوج میں نوکری کے دوران مگر مجھے شراب کبھی راس نہ آئی۔ شدید شکستہ دلی کے ساتھ میں نے پڑھائی ترک کر کے نوکری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حالانکہ بی ایس سی کے دوران مجھے علم نباتات سے بے حد لگاؤ تھا اور اسی باعث بوٹنی آنرز میں داخلہ بھی لیا تھا لیکن ایم ایس سی کے دوران مجھے اس مضمون میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کی وجہ میرے

گھریلو تفرقات اور ڈیپارٹمنٹ کی سیاست تھی۔ یونیورسٹی الیکشن کے دوران پر پولیس میں مجھے ڈیپارٹمنٹ کے کسی عہدے کے لیے چنا گیا مگر کاچرو صاحب نے اس کو رد کر دیا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ اِدھر ایک اور لیکچرر مہیش شرما تھے جن کے ساتھ ابتدا میں میرا کافی علیک سلیک تھا۔ ایک دو بار کینٹین میں ان کے ساتھ چائے پینے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ایک روز وہ مجھ سے خفا ہو گئے۔ بات یوں تھی کہ میں کبھی کبھی بوریت دور کرنے کے لیے کارٹون بنایا کرتا تھا۔ شرما صاحب کلاس میں پڑھاتے کم تھے اور ایکٹنگ زیادہ کرتے تھے۔ جوان تھے، خوبصورت بھی تھے اور پھر کلاس میں جتنی لڑکیاں سامنے بیٹھتی تھیں ان کو متاثر بھی تو کرنا تھا۔ وہ خود کو دلیپ کمار سے کم پایہ نہیں سمجھتے تھے۔ کلاس میں داخل ہوتے، چند تعارفی کلمات منہ سے نکالتے، پھر اپنا دایاں پاؤں میز پر ٹکا کر جیب سے وِلز کنگ سائز سگریٹ نکال کر اسے سلگا دیتے اور تب جا کر لیکچر شروع کرتے۔ پڑھانے کا ڈھنگ بھی کچھ اثر انگیز نہیں تھا۔ اس ڈرامے بازی اور کھوکھلے پن کی وجہ سے مجھے ان کے لیکچر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پیریڈ کا ایک ڈیڑھ گھنٹہ جوں توں کر کے گزارتا تھا۔ ایک روز جب وہ لیکچر دے رہے تھے تو میں نے ان کا کارٹون بنایا جس میں ایک طرف ان کو اور دوسری طرف اپنے ایک ہم جماعت چمن لال ترسل کو پہلوانوں کے روپ میں بنایا اور نیچے یوں عنوان لکھ دیا۔ ’’آج شب کو دیکھیے کشمیر کے مشہور پہلوان چمن لال چارلی اور جموں کے مشہور پہلوان مہیش شرما کے درمیان گھمسان کشتی۔ وقت سات بجے، مقام حبہ کدل چوک۔‘‘ یہ کارٹون کلاس میں گھومتا رہا مگر جونہی لڑکیوں کی قطار میں پہنچ گیا وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں، نتیجے میں مجھے بھی اپنی ہنسی پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ شرما جی نے دیکھ لیا، لڑکیوں کو مصلحتاً کچھ نہ کہہ سکے مگر مجھ پر برس پڑے۔ ’’بُدکی، تم کیوں ہنس رہے ہو؟‘‘ میں نے معصوم سا چہرہ بنا کر جواب دیا۔ ’’سر میں ہنس نہیں رہا ہوں یوں ہی معصومیت سے دیکھ رہا ہوں۔‘‘ ان کی آواز اور بھی بلند ہو گئی۔ ’’تمھارا مطلب کیا ہے؟ یہ معصومیت کیا ہوتی ہے؟‘‘ اس کے بعد مجھ سے بھی رہا نہ گیا، جواب دیا۔ ’’سر، دراصل آپ کا لیکچر میرے سر کے اوپر سے جا رہا ہے۔ اس لیے معصومیت سے بورڈ کو دیکھ رہا تھا۔‘‘ جواب سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے۔ ادھ جلے سگریٹ کو پاؤں تلے روند دیا، پھر اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور آخرش یہ کہہ کر باہر چلے گئے۔ ’’میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں اس کلاس کو پڑھانے کے لیے کبھی نہیں آؤں گا۔‘‘ کلاس کے سبھی طلبہ مجھ سے خفا ہو گئے لیکن مہیش صاحب کب تک

پھٹکار کرتے، آخر آنا ہی پڑا۔ ایم ایس سی (پریویس) کے پریکٹکل امتحانات کے دوران مہیش شرما نے اسی بات پر مجھ سے انتقام لینے کی بھرپور کوشش کی۔

اِدھر گھر میں بہن کی شادی کے انتظامات ہو رہے تھے اور میں نے احتجاج کے طور پر اس میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی میں نے پڑھائی ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی جگہ نوکری کرنے کے واسطے اپنے ماماجی کے پاس بارہمولہ چلا گیا۔ انھوں نے مجھے ایسا قدم اٹھانے سے روک لیا اور ذہن نشین کر لیا کہ لوگ چڑھتے سورج کو پوجتے ہیں جبکہ ڈوبتے کو کوئی نہیں پوجتا۔ واپس آیا تو پوپھی بھی بے قرار نظر آ رہی تھی، بہت ہی صبر آمیز اور رازدارانہ انداز میں گویا ہوئی۔ ''تم کو کیا لگتا ہے کہ میں ان لڑکیوں کی وجہ سے یہاں اس گھر میں پڑی ہوئی ہوں۔ یہ تو پرایا مال ہے، کسی روز دوسرے گھر میں چلی جائیں گی۔ تم تو اس گھر کے چشم و چراغ ہو۔ اگر تم اپنی تعلیم پوری نہیں کرو گے تو میری اتنے برسوں کی محنت اِکارت جائے گی۔ میرے ان سفید بالوں کا کچھ خیال ہو تو سب باتوں کو بھول کر اپنے امتحان کی تیاری کرلو۔'' جگری کی باتیں سن کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

تھیوری سے پہلے پریکٹکل امتحانات تھے جن کی معیاد تین دن ہوتی ہے۔ پہلے دن لیبارٹری میں مہیش شرما سبھی طلبہ میں سیکشن کاٹ کر سلائڈ بنانے کے لیے منتخب پودے کا میٹیریل بانٹ کر باہر چلے گئے۔ دریں اثنا ایک طالبہ نے سب سے پوچھا کہ یہ کون سا پودا ہے؟ بدقسمتی سے میں نے اسے مخاطب ہو کر بتایا کہ 'یہ آسمنڈا' ہے۔ میری یہ بات شرما صاحب نے، جو اس وقت دوبارہ کمرے کے اندر آ رہے تھے، سن لی۔ ان کو بدلہ لینے کا اس سے بہتر موقع کہاں ملتا۔ جلدی سے میرا میٹیریل چھین لیا اور میرے خلاف صدر، شعبۂ علم نباتات کو رپورٹ کر دی۔ کاچرو صاحب تو ویسے ہی بھرے پڑے تھے، انھیں بھی عداوت نکالنے کا موقع مل گیا۔ ذہنی تناؤ کے باعث اس دن میں شہدوں کی طرح ملبوس تھا، قمیص کے بٹن کھلے ہوئے، بلیو جینز، چوڑا 007 بکل والا کمربند اور بال بکھرے ہوئے۔ میں نے اپنا کمربند نکال کر سامنے میز پر کنڈلی مارے سانپ کی مانند رکھ دیا۔ اتنی دیر میں کاچرو صاحب آئے اور مجھ سے حجت کرنے لگے۔ ویسے ہی دل جلا تھا۔ میں نے حقارت آمیز صورت بنا کر ان کو انتباہ کیا کہ وہ مجھ سے نہ الجھیں ورنہ میں انھیں اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ میرا جواب سن کر وہ چپ چاپ باہر چلے گئے۔ کچھ دیر کے

بعد اصل ممتحن آئے۔ میری خوش نصیبی یہ تھی کہ ممتحن، ٹی این خشو، کشمیری تھے، بہت پہلے اسی شعبہ کے صدر رہ چکے تھے اور اب لکھنؤ میں کام کرتے تھے۔ بڑے بردبار، نرم مزاج اور رحمدل تھے۔ سب کی شکایتیں سن کر میرے پاس چلے آئے اور پوچھنے لگے۔ ''بیٹے، یہ بیلٹ میز پر کیوں رکھی ہے؟'' ان کے مشفقانہ لہجے کو دیکھ کر میں نادم ہو گیا، اس لیے حلیمی سے جواب دیا۔ ''سر، کرسی پر اتنی چوڑی بیلٹ پہن کر کام کرنا مشکل ہو رہا تھا، اس لیے نکال کر میز پر رکھ دی۔'' وہ میرا جواب سن کر حیران ہو گئے۔ کہاں تو سوچا تھا کہ کسی سرکش سے واسطہ پڑنے والا ہے اور کہاں میرا ندامت بھرا جواب! کہنے لگے۔ ''تم کوئی رنگ لیڈر ہو گیا؟ یہ جھگڑا وغیرہ...... یہ کیا سن رہا ہوں میں....؟'' میں نے نرم روی سے جواب دیا۔ ''سر ہر کوئی اپنی اپنی جگہ رنگ لیڈر ہوتا ہے۔ دراصل مہیش سر کو میرے ساتھ پرانی دشمنی ہے جس کا وہ انتقام لے رہے ہیں۔'' انھوں نے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور کہنے لگے کہ تم اپنے کیے کے لیے کل تک خود ہی سزا تجویز کر لو۔'' پھر انھوں نے شرما صاحب کو دوسرا کوئی میٹیریل دینے کی ہدایت دی اور وہاں سے چل دیے۔ مہیش شرما پانی پر تیرنے والا پودا 'سالوینیا' میرے سامنے رکھ کر چل دیے۔ میں نے کسی دوسرے نگران کی وساطت سے خشو صاحب کو بلوایا اور انھیں اس پودے کی حالت دکھائی جو عمداً اینٹھا گیا تھا۔ ''دیکھیے سر، انھوں نے جان بوجھ کر یہ مسلا اور اینٹھا ہوا سالوینیا مجھے دے دیا ہے جس کا سلائیڈ بنانا تو کجا، رنگنا بھی مشکل ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ دیکھ لینا اس کے باوجود کلاس میں سب سے اچھا سلائیڈ میرا ہی ہوگا۔ میں صرف آپ کو اطلاع دینا چاہتا تھا۔'' خشو صاحب واپس ہیڈ کے کمرے میں چلے گئے۔ دو دن ختم ہونے کے بعد تیسرے روز کچھ اور تجربات کرنے تھے اور آخر میں بالمشافہہ زبانی امتحان (Viva voce) تھا۔ اس روز میں ہارے ہوئے لشکر کے سپاہی کی طرح اپنے مستقبل کے لیے فکر مند تھا۔ بہن تو دو روز پہلے شادی کر کے سسرال چلی گئی تھی اور اب میرے احتجاج کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس لیے اس روز اچھا سوٹ اور ٹائی پہن کر اور اپنی پریکٹکل کاپی و خشک نباتاتی ارژنگ (Herbarium) بغل میں دبائے یونیورسٹی پہنچا۔ ہال کے دروازے کے پاس ممتحن ڈاکٹر خشو صاحب اور ایک پروفیسر ڈاکٹر اے کے کول کھڑے تھے۔ میں جونہی ان کے قریب پہنچا تو خشو صاحب نے اوپر سے نیچے تک مجھ پر نظر دوڑائی اور کہنے لگے۔ ''ہاں بیٹے، کیا تم نے اپنی سزا کے بارے میں کچھ سوچ لیا ہے؟'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سر، مہاتما گاندھی نے اپنی

خودنوشت سوانح حیات 'مائی ایکسپریمنٹس وِدٹرتھ' (My Experiments with Truth) میں صفحہ ۱۶۲ پر لکھا ہے کہ فارگونیس ازمور مینلی دین پنشمنٹ (Forgiveness is more manly than punishment)۔" دراصل میں کئی برسوں سے گاندھی جی کی کتابیں پڑھتا رہا تھا اور یہ فقرہ میرے ذہن پر مرتسم ہو چکا تھا۔ اس لیے فٹافٹ بول دیا مگر صفحہ نمبر کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، اس کا حوالہ تو یوں ہی رعب جمانے کے لیے دے دیا۔ کول صاحب بول اٹھے۔ "اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے گھر میں پرسوں ضیافتیں چل رہی تھیں۔ اس کی بہن کی شادی تھی۔" غالباً انھیں شادی کا کارڈ مل گیا تھا کیونکہ ان کے بھائی میرے والد کے رفیق کار تھے۔ تاہم انھیں حقیقت کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ یہ سن کر خشو صاحب نے میرے کمر پر تھپکی دے کر کہا۔ "شاباش بیٹے، مجھے یہی امید تھی تم سے۔ جاؤ اندر جا کر اپنا کام کرلو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ویسے نہیں ہو جیسا تم پرسوں خود کو دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔" بات آئی گئی ہوگئی۔ چار بجے مجھے ہیڈ کے کمرے میں بلایا گیا۔ وہاں ٹیبل پر قطار میں سجے ہوئے پانچ چھ مائکروسکوپ امیدواروں کا انتظار کر رہے تھے۔ کاچرو صاحب ایک مائکروسکوپ کے پاس کھڑے سلائیڈ ٹھیک کر رہے تھے۔ سامنے ایک صوفے پر خشو صاحب بیٹھے تھے اور ان کی بغل میں ایک لیکچرر جاوید صاحب تھے۔ کاچرو صاحب نے سلائیڈوں کی شناخت کرنے کے لیے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں سارے سلائیڈ دیکھ کر ان کے نام نوٹ کر کے ان کو سونپ دیے۔ پھر جاوید صاحب نے بلا کر اپنے سامنے بٹھایا۔ کاچرو صاحب نے وہیں سے اونچی آواز میں ممتحن کو یاد دلایا۔ "یہ وہی طالب علم ہے جس نے ہنگامہ کیا تھا۔" ان کا منشا یہ تھا کہ خشو صاحب کو میرے بارے میں یاد دہانی کرا دے تاکہ وہ مجھے وائیوا میں رگڑ لے۔ یہ تھا ایک کشمیری پنڈت کا رویہ۔ ایسا ہی کچھ بہت عرصہ پہلے پری میڈیکل امتحان میں بھی ہوا تھا کہ میری پریکٹکل نوٹ بک ممتحن کو دکھائے بغیر ہی میرے کالج کے پنڈت لیکچرر نے دور پھینک دی تھی۔ مگر جاوید صاحب اس وقت فرشتہ بن کر سامنے آئے، انھوں نے بہت ہی مثبت رول ادا کیا جس کے لیے میں ان کا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔ انھوں نے میری پریکٹکل نوٹ بک خشو صاحب کے سامنے رکھ دی اور ان سے کہنے لگے۔ "اس سٹوڈنٹ کی یہ کاپی دیکھیے۔ یہ بہت ہی محنت کش لڑکا ہے۔ اس کی پریکٹکل کاپی دیکھنے کی چیز ہے۔" خشو صاحب نے میری پریکٹکل نوٹ بک ہاتھ میں اٹھا لی اور اس کی

ورق گردانی کرنے لگے۔ ان کی نگاہیں ایک بہت ہی خوبصورت گچھی (Morchella Mushroom) پر پڑ کر وہیں ٹھہر گئیں۔ اس کے بعد ان کی نظریں پنسل سے بنائے ہوئے نباتاتی سنگواروں (Plant Fossils) پر پڑیں جن کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کیمرے سے اتارے گئے بلیک اینڈ وہائٹ فوٹو ہیں۔ انھوں نے حیرت انگیز لہجے میں سوال کیا۔ ''یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں؟'' میں نے جواباً عرض کی۔ ''سر یہ تصویریں میں نے بنائی ہیں اور وہ بھی لیبارٹری میں۔'' خشو صاحب گویا ہوئے۔ ''تم آرٹسٹ ہو کیا؟'' میں نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''نہیں سر، میں شوقیہ مصور (Amateur) ہوں۔'' اس بات پر پروفیسر جاوید کہنے لگے۔ ''یہ لڑکا تو میری کلاس کا بہت ہی ذہین اور ہونہار طالب علم ہے۔'' ''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔'' خشو صاحب نے اور کوئی سوال کرنے کے بغیر ہی مجھے رخصت کر لیا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ ایک ہندو اور وہ بھی کشمیری پنڈت نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جبکہ ایک مسلمان نے میری زندگی سنواری جس احسان کے لیے میں انھیں عمر بھر نہیں بھلا سکتا۔ جاوید صاحب نے اس سے پہلے کہیں سے سنا تھا کہ میں اردو سیکھ رہا ہوں اور زیادہ دھیان اسی طرف دے رہا ہوں، اس بات پر انھوں نے ایک روز تنبیہ بھی کی تھی کہ مجھے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے اور اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ اس کے بعد جب میں امتحان دے کر فارغ ہوا تو بلڈنگ کے باہر ایک اور کشمیری پنڈت لیکچرر، ڈاکٹر گردھاری لال دھر ملے جن کے ہمراہ کچھ فائنل ائیر کے طالب علم تھے۔ انھوں نے مجھے بلا کر کہا۔ ''دیکھا کتنا نقصان کروایا اپنے آپ کو۔ پندرہ نمبر کاٹے گئے تمھارے۔'' میں سکتے میں پڑ گیا۔ کہاں تو خشو صاحب کا طور طریق اور کہاں اس لیکچرر کی من گھڑت باتیں جو عمر بھر خشو صاحب کے نوٹوں سے طالب علموں کو پڑھاتا رہا۔ میں نے جواب دیا۔ ''ہاں سر، مجھے بھی معلوم ہے۔ وہ تو ان پندرہ نمبروں سے اپنے مکان کی ایک اور منزل تعمیر کروا رہے ہیں۔ کیوں نہ آپ بھی مزید پندرہ نمبر کاٹ لیں اور اپنے مکان کی ایک اور منزل بنوالیں۔'' جواب سن کر وہ کھسیانے سے ہو گئے۔ خیر وہ نمبر تو کیا کاٹتے مگر کئی مہینوں بعد ان کو تپ دق کا عارضہ ہوا اور کسی وجہ سے انھیں 'پاسونیکس' دوائی نہیں مل رہی تھی۔ میں ان کی عیادت کے لیے گیا اور جب میں نے یہ بات سنی تو اپنے دوست کی وساطت سے ایک ہول سیل ڈیلر سے پاسونیکس کے کئی ڈبے خرید لیے اور یونیورسٹی میں ان کے گھر پہنچا

دیے۔ امتحان کے آخری دن گھر لوٹتے سمے میں سوچنے لگا۔ ''کیسے کیسے ایذا رساں لوگ ہیں اس دنیا میں۔ کتنے خوش ہوتے ہیں دوسروں کو نقصان پہنچانے میں یا ان کو نقصان پہنچتا دیکھنے میں۔'' بہت انتظار کرنے کے بعد جب نتیجے برآمد ہوئے تو مجھے پریکٹکل میں بہت اچھے نمبرات حاصل ہوئے تھے حالانکہ مجموعی طور پر مجھے ایم ایس سی (پریویس) میں تھرڈ دویژن ملا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اس لیے میں بہت مایوس ہو گیا اور آگے کے لائحہ عمل کے بارے میں فکر مند ہو گیا۔ بہر حال ایک امید کی کرن نظر آرہی تھی کہ ایم ایس سی میں آخرش دونوں سالوں یعنی پریویس اور فائنل کے نمبرات جوڑ کر کل میزان کیا جاتا ہے، جس پر ڈویژن کا دارومدار ہوتا ہے، پھر کیوں نہ فائنل میں بہت محنت کی جائے۔ بقول جگن ناتھ آزاد:

ہمیں گرداب سے اے ناخدا تو کیا ڈراتا ہے
کہ ہم گرداب کو بھی دامنِ ساحل سمجھتے ہیں

ایک مرتبہ میں یونیورسٹی بس میں ڈاکٹر ایم ایس وانٹ، صدر شعبۂ انگریزی کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔ پریویس میں نمبر کم ملنے کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر وانٹ صاحب کو سلام کیا اور ساتھ ہی ایک سوال پوچھ لیا۔ ''سر میں ایم ایس سی بوٹنی کے فائنل ایئر میں ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اس کے بعد ایم اے انگلش کر لوں۔ سر، کیا میں پوسٹ گریجویشن کے بعد براہ راست انگریزی میں ایڈمشن لے سکتا ہوں؟'' ان کے چہرے پر خفگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ ''وہاٹ، تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم نے اپنی زندگی کے مقصد کا تعین نہیں کیا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ اگر تم سائنس سٹوڈنٹ ہو تو پھر انگریزی میں ایم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے بڑی نرمی اور عاجزی سے جواب دیا۔ ''مقصد! نصب العین! سر، یہ تو ہمارے معاشرے میں فالتو چیزیں لگتی ہیں۔ یہاں تو جوتوں کے قالب میں چپل ڈھلتے ہیں اور چپلوں کے قالب میں جوتے۔ پھر کونسا مقصد اور کہاں کا نصب العین۔ سر، اپنی زندگی کی تشکیل میں ہمارا ہاتھ کہاں ہوتا ہے۔ ہمارے والدین، ٹیچر اور سوشل انسٹی ٹیوشنز ہمارا مستقبل طے کرتے ہیں۔ میری ہی زندگی لیجیے۔ ڈاکٹر بننے کی ٹھانی تھی۔ نہیں ملی۔ پھر بائیو کیمسٹری یا مائکرو بائیولوجی میں پوسٹ گریجویشن کا سوچ لیا۔ وہ بھی نہ کر سکا۔ حالانکہ مجھ سے کم نمبر والوں کو سیٹیں مل

گئیں۔ بعد میں بوٹنی میں داخلہ لیا اب وہاں بھی تاریک مستقبل دکھائی دے رہا ہے یہاں تک کہ مجھے اس سبجکٹ کے ساتھ اب کوئی دلچسپی نہیں رہی۔“ ”اوہ، آئی سی، یو ہیو اے پوائنٹ“ اور یہ کہہ کر وہ میرے سوال کا جواب دیے بغیر چپ ہو گئے۔ بقول جگن ناتھ آزاد:

آزاد ہے محوِ جہد و عمل انجام یہ کب ہے اس کی نظر
یہ کشتِ عمل کا دیوانہ اس کشت کا حاصل کیا جانے

ایم ایس سی باٹنی کے دوران میرے حق میں حکومت کی جانب سے ۲۴۰۰/- روپے کا ایجوکیشنل لون منظور ہوا جس پر بہت کم بیاج دینا پڑتا تھا۔ جس روز آرڈر ملا مالی سال کا آخری دن یعنی ۳۱؍ مارچ تھا۔ پتا جی کے پاس پہنچا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ آج جموں و کشمیر بنک (ٹریجری) میں بہت بھیڑ ہوگی اور یہ رقم نکالنا مشکل ہوگا۔ عدم استعمال کے باعث دوسرے روز میرا استحقاق باقی نہ رہتا۔ میں خود ہی بنک پہنچ گیا، ایک کلرک سے بات کی، اس کو صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ آپ مجھے ۲۳۰۰/- روپے دلوا دیں اور مبلغ ایک سو روپے اپنے پاس رکھیں۔ وہ اٹھا، کچھ فارم بھروائے، دستخط لے لیے اور پانچ دس منٹ میں میرے ہاتھ میں دو ہزار تین سو روپے تھما دیے۔ میں خوشی خوشی اپنے پتا جی کے پاس واپس چلا گیا تا کہ ان کو بتا دوں کہ دیکھ لو میں بھی کام کروا سکتا ہوں۔ اس دن دوسری بار سو روپے کے نوٹ کا کرشمہ دیکھ لیا۔ بہر حال ذہنی انتشار سے فرار پانے کے لیے میں نے اپنے لیے ایک بڑھیا سا سوٹ بنوا لیا اور باقی ماندہ روپے ایتھر کی مانند نہ جانے کہاں اُڑ گئے۔ تاہم مجھے پتا جی کے لون کا تجربہ تھا اس لیے ایمپوریم میں نوکری لگ کر سب سے پہلے قرضہ اتارنے میں لگ گیا۔

کچھ مہینوں بعد گاندھی میموریل کالج میں بی ایڈ کے لیے داخلہ شروع ہوا۔ میں نے پتا جی سے بات کی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے وہاں سیٹ دلوا دیں۔ وہ پرنسپل اور منیجمنٹ کے دیگر اراکین کو قریب سے جانتے تھے۔ آخر کار میرا داخلہ ہوا۔ کالج کے انتظامیہ نے مجھ سے صرف کالج کی فیس لی اور نذرانے کی رقم (Donation) نہیں مانگی۔ ایم ایس سی کا دوسرا سال لگ بھگ اختتام کو پہنچ رہا تھا، بس دو تین مہینے رہ گئے تھے لیکن امتحانات ملتوی ہو گئے اور ۱۹۷۰ء کے بدلے ۱۹۷۱ء اپریل میں لیے گئے جب کہ بی ایڈ کے امتحانات جون ۱۹۷۱ء میں طے تھے۔ اس لیے مجھے بی ایڈ کلاسز میں حاضری دینے میں کوئی پریشانی نہیں

ہوئی۔ بیچ میں ایک دو دن ناغہ کر کے یونیورسٹی چلا جاتا تھا اور اس طرح دونوں جگہوں پر حاضری لگا لیتا۔ بس دو تین مہینے کی ہی تو بات تھی۔ ذہنی انتشار کے باعث میں نے خود کو پھر سے مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اپنے آپ کو صبح سے شام تک مشغول رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ دن میں کبھی یونیورسٹی اور کبھی گاندھی کالج چلا جاتا، پھر شام کو جامعہ علی گڑھ کے ادیب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نزدیک ہی ایم پی سکول میں واقع اورینٹل کالج چلا جاتا۔ شعبۂ بوٹنی کی طرف سے کرکٹ میچ کھیلنے کے باعث کرکٹ کا بھوت پھر سے سوار ہو گیا تھا، اس لیے وہائٹس کرکٹ کلب کا ممبر بن گیا اور ہفتے میں دو تین دن شام کو کرکٹ پریکٹس کے لیے ایس پی سکول جاتا تھا۔ انہی دنوں صراف صاحب نے مجھے اپنے ایک صحافی دوست میر راجپوری کے اخبار 'جہانِ نو' میں کارٹون بنانے کے لیے بھیج دیا۔ اس زمانے میں سرینگر ٹائمز کے بشیر احمد بٹ کے کارٹونوں کی وجہ سے اخباروں میں کارٹونوں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ میں ہر شام کو جہان نو کے دفتر میں حاضر ہوتا اور کارٹون بنا کر واپس چلا آتا۔ کارٹون کے لیے میں نے اپنا قلمی نام 'دیپک' اور 'تہجد' کی نسبت سے ہجو رکھ لیا تھا مگر بعد میں اس سے ترک کر لیا۔ 'جہان نو' میں کارٹون بنانے کا معاملہ زیادہ دیر نہ چل سکا، پھر مختصر مدت کے لیے باری باری ہفت روزہ 'نوجیون'، 'عقاب' اور 'ہمارا کشمیر' کے لیے بھی کارٹون بنائے۔ اس کے علاوہ دیر رات تک دو ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا۔ گھر کے تفرقات سے بچنے کی خاطر صبح سویرے نکل پڑتا اور شام کو دیر سے گھر لوٹ آتا۔ غرض خود کو کام میں مشغول رکھتا تھا۔

اورینٹل کالج میں ایک طالب علم سے دوستی ہو گئی۔ نام تھا محمد امین صوفی۔ اس نے موج مستی میں کافی عمر گنوائی تھی۔ تیس پار کر کے اسے یہ خیال آیا تھا کہ اسے میٹرک پاس کرنا چاہیے۔ جب کالج میں مجھ پر نظر پڑی تو دوستی کر لی۔ رہتا بھی گھر کے پاس ہی صراف کدل میں تھا۔ ادیب ماہر کا امتحان پاس کر کے اگر کوئی طالب علم صرف انگریزی کا امتحان مقامی بورڈ سے پاس کر لیتا تو اسے میٹرک پاس سمجھا جاتا تھا۔ اردو کے امتحانات یعنی ادیب اور پھر ادیب ماہر میں وہ میری بغل میں بیٹھتا تھا اور میں اپنی جوابی کاپی مکمل کر کے پھر اس کی کاپی پر جوابات لکھ لیتا اور اس طرح وہ ادیب ماہر پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ میرے گھر انگریزی سیکھنے کے لیے چلا آتا مگر اسے سیکھنا تھا نہ کبھی سیکھ لیا۔ جب امتحان کا وقت آیا تو بٹہ مالو ہائی سکول کے امتحان سنٹر میں اس نے ایک نگران کو رشوت دے کر پٹا لیا اور اپنی

جوابی کاپی اور سوالنامہ نیچے میرے پاس بھجوا دیے جو میں نے لکھ کر واپس بھیج دیے۔ غرض یہ کہ اس نے میٹرک کی سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لی۔ میں کچھ حد تک اس کا احسان مند تھا کیونکہ اس نے میری بہت مدد کی تھی۔ چونکہ میں کئی سال تک سوزش قولون میں مبتلا تھا اور میرے پاخانہ کے ساتھ روزانہ خون بہہ نکلتا تھا اس لیے میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ یہ محمد امین کی ہی مہربانی تھی کہ وہ مجھے ڈاکٹر درانی کے پاس لے گیا اور میرا علاج کروایا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ افسوس کہ وہ کچھ برس پہلے اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

دوسرے سال ایم ایس سی (فائنل) کے امتحانات ہوئے۔ وہاں بھی کاچرو صاحب سے ناچاقی ہوئی۔ نباتاتی فعلیات (Plant physiology) کا پیپر تھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر سکندر فاروق پڑھایا کرتے تھے۔ بہت ہی ذہین اور محنتی معلم تھے۔ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ تو اچھا تھا مگر کشمیر یونیورسٹی کے سٹینڈرڈ سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ کہیں اور پڑھ کر اور پڑھا کر اب کشمیر یونیورسٹی آچکے تھے۔ جب امتحان ہال میں زیر امتحان طلبہ نے سوالنامہ پڑھا تو بوکھلا گئے۔ کشمیری پنڈت تو ویسے بھی ڈرپوک ہوتے ہیں احتجاج کیا کرتے مگر مسلمان لڑکے سب کے سب کھڑے ہوئے۔ میں واحد کشمیری پنڈت لڑکا تھا جس نے ان کا ساتھ دیا۔ دریں اثنا کاچرو صاحب ہال کے اندر آئے، اِدھر اُدھر دیکھا، ہر جگہ مسلم لڑکے کھڑے نظر آئے، ان سے بات کرنے سے ڈر گئے، اس لیے سیدھے میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ میں کھڑا کیوں ہوں؟ میں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ”آپ میرے پاس ہی کیوں آئے، اتنے سارے لڑکے کھڑے ہیں، ان کے پاس کیوں نہیں گئے، اسی لیے نا کہ وہ مسلمان ہیں اور آپ ان سے ڈرتے ہیں۔ میں کشمیری پنڈت ہوں اور آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ پر کچھ بھی سختی کر سکتے ہیں، یہ آپ کی بھول ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا اور اس کا تجربہ تو آپ کو ہے ہی۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔“ جواب سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد سکندر فاروق صاحب آگئے۔ وہ بھی دوسرے طالب علموں کو نظر انداز کر کے صرف میرے پاس آئے۔ ان کے ساتھ میرے مراسم بہت اچھے تھے اور کئی بار کینٹین میں چائے بھی پی تھی۔ مگر ایسے وقت مراسم کی کون سوچتا ہے۔ میں ان پر بھڑ گیا اور وہ بھی دم دبا کر چلے گئے۔ پھر نقل کا دور چلا اور سب طلبا چپ چاپ اپنے کام میں لگ گئے۔ اس پیپر میں دو حصے تھے اور ہر حصے میں سے طالب علم کو تین سوالوں کے جواب لکھنے تھے۔ سو میں نے فزیولوجی کو چھوڑ کر

دوسرے حصے، اکالوجی سے تین سوال چن لیے اور ان کے جوابات تفصیل سے لکھ دیے۔ بغل میں ایک پنڈت لڑکی مجھ کو سٹرائک کرتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس نے اپنے سوالنامے کے پشت پر ایک شکل بنا کر اسے مجھ کو دے دیا اور بدلے میں مجھ سے میرا سوالنامہ لے لیا۔ اس شکلی ترسیمی خاکے کو سمجھ کر میں نے اس سوال کا جواب بھی لکھ دیا اور خود سے فزیالوجی کے ایک آدھ اور سوالات کے جواب لکھ دیے۔ اس دوران ایک خاتون نگران نے ایک مسلم طالب علم کو نقل کرتے ہوئے پکڑ لیا جس پر وہ لڑکا بہت بدتمیزی سے پیش آیا۔ کافی ہنگامہ برپا ہوا۔ اس بے عزتی کا بدلا لینے کے لیے اس نگراں کا خاوند، جو یونیورسٹی کا معزز پروفیسر تھا، دوسرے روز سے خود ہی ناظم امتحان بن کر آیا اور اس نے کسی بھی طالب علم کو نقل کرنے نہیں دیا یہاں تک کہ کسی کو سر ہلانے بھی نہیں دیا۔ اس طرح ان سب لڑکوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا جو نقل کرنے کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ نقل پر روک لگنے کی وجہ سے مجھے بہت فائدہ ہوا کیونکہ ان سب لڑکوں کی بہ نسبت میرے جوابات قدرے اچھے ہوتے تھے اور پھر اپنی محنت کا ثمر تھا۔ مجھے ایسے لگا کہ وہ ناظم امتحان میرے لیے ہی فرشتہ بن کر آ گیا۔ نتیجے میں وہ سب لڑکے جنھوں نے نقل کر کے مجھے پریویس میں پچھاڑا تھا اب خود ہی پیچھے رہ گئے۔ اس سال مجھے فرسٹ ڈویژن ملا اور پہلے سال کے نمبر ملا کر کل سیکنڈ ڈویژن (53.3%) بن گیا جو میرے لیے باعث تسکین تھا۔

پوسٹ گریجویشن پاس کر کے میں پہلا طالب علم تھا جس کو نوکری مل گئی ماسوائے ان طلبہ کے جو پہلے ہی سے ملازمت کر رہے تھے اور سٹڈی لیو لے کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میری پہلی تقرری چنڈی گڑھ میں ہوئی۔ ایک روز پروفیسر پی کاچرو صاحب کو خط روانہ کیا جس کا لب لباب تھا کہ دیکھیے آپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود میں نے ایم ایس سی پاس کیا اور نوکری بھی مل گئی جب کہ آپ کے چہیتے طالب علم نوکری کی تلاش میں اب بھی در در بھٹک رہے ہیں۔ کاچرو صاحب نے کوئی منفی ردِعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ ایک مثبت جواب بھیج دیا۔ لکھا تھا کہ ایک استاد ایسے سمندر کی طرح ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے دریا پناہ لیتے ہیں، کوئی متلاطم اور کوئی شانت، کوئی ہنگامہ خیز اور کوئی پُرسکون، کوئی گرج دار اور کوئی خاموش، کوئی جھاگ دار اور کوئی اطمینان بخش! ایک اچھا استاد سب کو گلے لگاتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر کسی کی زندگی کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔ مجھے تم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی البتہ چاہتا تھا کہ تم اچھے

طالب علم بنو اور زندگی میں سرخ رو ہو جاؤ۔ کاچرو صاحب کا خط پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں اور دل کی ساری کدورت ہوا ہو گئی۔ پھر پہلی فرصت میں جب میں سرینگر آیا تو ان کے پاس حاضری دے کر ندامت کا اظہار کیا۔

ایم ایس سی کا امتحان دے کر بی ایڈ کی باری آ گئی۔ اس درمیان میری نوکری کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں لگ کر چنڈی گڑھ پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ امتحان دینے کے لیے مجھے چنڈی گڑھ سے آنا پڑتا تھا۔ جوں توں کر کے تھیوری کا امتحان دیا۔ پھر پریکٹس آف ٹیچنگ کے لیے دوبار چنڈی گڑھ سے آنا پڑا۔ رزلٹ نکلا مگر ایک پرچے میں رہ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے متنازع جواب لکھا تھا کیونکہ سوال سیاسی نوعیت کا تھا۔ خیر تین مہینے بعد اس پیپر کا دوبارہ امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں پھر پاس ہو گیا۔ اب کیا تھا دونوں ڈگریاں۔ ایم ایس سی اور بی ایڈ۔ جیب میں تھیں لیکن نوکری ایسی ملی تھی جس کا میری تعلیم سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔

ایم ایس سی اور بی ایڈ کے ساتھ ساتھ میں شام کو اورینٹل کالج میں اردو زبان بھی سیکھتا تھا۔ وہاں سے میں نے جامعہ علی گڑھ کا 'ادیب' ۱۹۷۰ء میں پاس کیا اور پھر 'ادیب ماہر' ۱۹۷۱ء میں پاس کیا۔ نوکری لگنے کے باعث ادیب کامل کا امتحان رہ گیا۔ اس کالج میں ایک بہت ہی نیک استاد سے واسطہ پڑا۔ نام تھا جناب جی ایم وفائی۔ انھوں نے بہت ہی شفقت کے ساتھ میری رہنمائی کی اور میری خوش نویسی پر خاصا دھیان دیا۔ ان کی بدولت میری اردو کی لکھائی بہت اچھی ہو گئی یہاں تک کہ کبھی کبھی میں نے چند اخباروں میں تفریحاً کتابت بھی کی۔

طالب علمی کے دوران میں نے نواکدل میں واقع اپنے ایک قریبی رشتے دار کے کوچنگ سنٹر میں میٹرک کے سٹوڈنٹس کو ہائجین پڑھائی جس کے لیے پچاس روپے ماہوار مل جاتے تھے۔ علاوہ ازیں کئی ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا جن میں سے چند ایک سے معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ ایک بار میں پیدل گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں کسی کے ٹرانزسٹر پر ہندوستان پاکستان کرکٹ میچ کی کمینٹری نشر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے سکور پوچھ لیا اور پھر اس کے ساتھ ہی چلتا رہا اور سکور سنتا رہا۔ راستے بھر اس سے گفتگو ہوتی رہی۔ معلوم ہوا کہ وہ پری میڈیکل کا طالب علم ہے۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ایم ایس سی (بوٹنی) کا طالب علم ہوں تو اس

نے مجھ سے نباتات کی اناٹومی سمجھانے کی درخواست کی۔ میں نے حامی بھرلی اور اسے اتوار کو اپنے گھر بلایا۔ اس کی نصاب کی کتاب دیکھ کر میں چکرایا کیونکہ مجھے یاد آیا کہ میں ہمیشہ اس حصے کو نظر انداز کرتا رہا تھا اور اس بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں تھا۔ اب تو خیر سر اوکھلی میں دیا تھا پھر موسلوں سے کیا ڈرتا، عزت کا سوال تھا۔ میں نے کتاب رکھ لی اور اسے دوسرے اتوار کو بلایا۔ چنانچہ اناٹومی میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس کو کئی بار آنا پڑا۔ آخر کار مجھے شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے یونیورسٹی لائبریری سے ایساؤ کی پلانٹ اناٹومی ادھار لے کر دن رات اس کا مطالعہ کیا اور اگلے اتوار کو اسے اچھی طرح سے سمجھایا۔ یہ علم میرے کام آئے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس سال ایم ایس سی (فائنل) کے امتحان میں میں نے اناٹومی کے سوالوں کے جوابات اسی بنا پر بڑی وضاحت سے لکھ دیے۔ میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایک تو میں پلانٹ اناٹومی کے سوالات کا جواب دے پاؤں گا اور اس پر اتنی وضاحت سے کہ مجھے اس پیپر میں ۷۰؍فیصدی مارکس مل جائیں گے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اس محاورے 'کر بھلا ہو بھلا' کا مطلب سمجھ میں آگیا۔

ہمارے پڑوس میں ایک انکل رہتے تھے جو ایم اے (اردو) اور بی ایڈ تھے اور سرکاری سکول میں استاد تھے۔ بہت تنگ مزاج تھے مگر مجھے پیار کرتے تھے۔ ان کے پاس میٹرک کے انگریزی پیپر کی جوابی کاپیاں آتی تھیں جو وہ مجھے جانچنے کے لیے تھما دیتے تھے۔ میں خوش ہو جاتا مگر بہت عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ انھیں کاپیاں چیک کرنے کے لیے کافی معاوضہ ملتا تھا۔ مطلب یہ کہ میں نے طالب علمی کے زمانے میں کافی بے گار بھی کی ہے۔ جن دنوں میں اردو سیکھ رہا تھا، ایک روز ماہنامہ شمع دہلی میں بلا عنوان افسانہ پڑھا۔ رسالے نے انعام پانے کے لیے عنوانات طلب کیے تھے۔ میں نے ایک عنوان لکھ کر انکل سے یہ سوچ کر مشورہ لیا کہ وہ تو اردو کے پوسٹ گریجویٹ ہیں۔ انھوں نے میرے مجوزہ عنوان کو مسترد کر دیا اور خود ایک عنوان لکھ کر دیا جو میں نے شمع والوں کو بھیج دیا۔ دوسرے شمارے میں نتیجہ آیا مگر مجھے کوئی انعام وِنام نہیں ملا البتہ حیرت اس بات کی ہوئی کہ جو عنوان میں نے خود تجویز کیا تھا وہی کسی اور نے بھی بھیجا تھا اور اس کو دوسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔ خیر اس کے بعد میں نے کبھی کسی انعام کے لیے کوشش نہیں کی۔ ضمنی طور پر اس حوالے سے ایک اور بات یاد آرہی ہے کہ ایک روز میں اپنی بڑی بہن کے ہاں چلا

گیا اور وہاں پر اپنے جیجا جی کو شمع کا معمہ حل کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں انھیں کچھ دیر کے لیے دیکھتا رہا۔ ایک جگہ انھوں نے ’ع‘ (شمع) کی جگہ ’ح‘ (شمح) لکھ دیا، شاید اس لیے کہ جب ’ع‘ کسی لفظ کے آخر میں جڑ جاتا ہے تو ’ح‘ جیسی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر جہاں ’ح‘ کو اوپر سے ملایا جاتا ہے وہیں ’ع‘ کو نیچے سے ملایا جاتا ہے جس کی وہ تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اس غلطی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ ”تمھیں کیا معلوم ہے۔ یہ صحیح ہے، میں تو کب سے یہ معمے بھرتا رہا ہوں اور مجھے کئی بار انعام بھی ملا ہے۔ بڑے جیجا جی تھے اس لیے میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

☆☆☆

سیاہی کی ایک بوند

؎ خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

(آنند نارائن مُلّاؔ)

سات برسوں میں چار قریبی رشتہ داروں کو بچھڑتے دیکھ کر میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوگیا تھا۔ موت کے خیال ہی سے کچھ خوف سا لگتا تھا۔ اِدھر گھر کوروکھشیتر بنا ہوا تھا۔ پتاجی کی فطرت ایسی تھی کہ بچوں کو کنٹرول نہیں کر پا رہے تھے اور پوپھی، جو ہماری دیکھ بھال کرتی تھیں، سیوا تو کرتی تھیں مگر کسی کو کوئی غلط کام کرنے سے روک نہیں پاتی تھیں۔ بہنوں کی چخ چخ لگی رہتی تھی اور پتاجی ہمیشہ ان کی پشت پناہی کرتے، خواہ ان کی مانگیں صحیح ہوتیں یا غلط۔ ان سب بکھیڑوں سے کنارہ کش ہوکر میں تجرد پسند بن گیا۔ اُدھر کرکٹ چھوٹا اور اِدھر کالا اکشر جو پہلے بھینس برابر لگتا تھا اب مانوس لگنے لگا۔

جون ۱۹۶۸ء میں بی ایس سی آنرس کے امتحانات سے کچھ روز پہلے میرے پھپھیرے بھائی اشوک دلال کا اچانک انتقال ہوگیا۔ بچپن میں ہماری آپس میں زیادہ نہیں بنتی تھی کیوں کہ اس کی شخصیت اور میری شخصیت میں قطبین کا فرق تھا۔ وہ شریف، نفاست پسند، شایستہ اور دروں بین تھا جبکہ میں ان گھڑ، جرأت مند، اور جارحانہ طبعیت کا مالک تھا۔ اس کی ایک بُری عادت تھی جس کی وجہ سے اس کے جسم میں قوت مدافعت کی کمی پیدا ہوگئی تھی، وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت ست، احتیاطی اور انتخابی تھا، صرف آلو، دہی اور کبھی کبھار تھوڑا بہت گوشت کھالیتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس کو بھی خودلذتی کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس کی موت سے دو سال پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی شعوری کوشش کی اور بہت قریب آگئے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے راز داں بن گئے۔ اشوک گو عمر میں مجھ سے بیس ہی دن

چھوٹا تھا مگر پڑھائی میں دو سال پیچھے تھا۔ اس نے ٹی ڈی سی فرسٹ ائیر میں امتیازی نمبرات حاصل کیے اور انجینئرنگ کی سیٹ ملنا طے تھا کہ موت کے آہنی پنجے نے اسے پہلے ہی دبوچ لیا۔ وہ زیادہ تر گھر والوں کے ساتھ ہی فلم دیکھا کرتا تھا مگر چند سالوں سے اس کے والد، جو لیبر انسپکٹر تھے، اس کو سینما کے پاس دیتے تھے۔ امتحان ختم ہونے کے بعد وہ اننت ناگ سے، جہاں اس کا مستقر تھا، سرینگر آیا اور صراف والوں کے ہاں رہنے لگا۔ ایک روز میں نے مذاقاً کہا کہ چلو پکچر دیکھنے چلیں۔ میں عموماً تھرڈ کلاس میں فلم دیکھتا تھا اور اس کو اس بات سے آگاہ کر لیا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ وہ انکار کرے گا مگر اس نے حامی بھر لی اور میرے ساتھ براڈوے میں فلم 'راز' دیکھنے چلا گیا۔ وہاں اس کو تھرڈ کلاس کی لمبی لائن میں کھڑا کر دیا تاکہ اسے احساس ہو کہ ٹکٹ نکالنے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ وہ تو کھڑا ہی رہ گیا کہ میں نے کھڑکی کے سامنے سے گھس کر دو ٹکٹیں خرید لیں اور اس کو لے کر ہال کے اندر چلا گیا۔ اتفاقاً ہمیں پہلی قطار میں سیٹ ملی۔ اس کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے بعد کئی دن بیت گئے اور میں نے ایک روز اس کو اپنے ساتھ کھیر بھوانی کے میلے میں چلنے کی دعوت دی۔ وہ بستر پر بیمار پڑا تھا۔ بولا ’’نہیں بھائی، کچھ دنوں سے طبیعت ناساز ہے۔ ہمت نہیں ہو رہی ہے۔‘‘ میں اس کو الوداع کہہ کر اکیلا ہی چلا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ دوسرے روز صبح سویرے مندر ہی میں خبر ملی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ ہم جب تک وہاں پہنچ گئے تب تک اس کی لاش کا داہ سنسکار ہو چکا تھا۔

رات کو گھر لوٹا تو ایک عجیب سی بے یقینی اور بے ثباتی نے گھیر لیا۔ ہم عمر رازداں کے اچانک بچھڑنے نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ لاشعوری طور پر کاغذ اور قلم کی طلب ہوئی۔ اپنے مجروح جذبات کو قرطاس پر انڈیلنے کی زبردست چاہت ہوئی جس کی پیش بندی بہت پہلے کشمکشِ زیست نے کر لی تھی۔ میرے پاس ایک ڈائری تھی جس میں خوبصورت منی ایچر تصویریں تھیں، اسی کے خالی صفحات پر تک بندی کر کے کچھ لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر رات بھر ایک ہی نشست میں پورا ڈرامہ 'بندھن' کے عنوان سے لکھ مارا۔ وہ شاید میں نہیں بلکہ میرے غم کی انتہا تھی جو بوند بوند میرے قلم کی سیاہی بن کر کاغذ پر ٹپک رہی تھی۔ ایک ناپختہ کوشش جس میں فلموں کا اثر نمایاں تھا۔ کسی ایک زبان پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے کچھ الفاظ انگریزی میں لکھ دیے، کچھ اردو میں اور کچھ ہندی میں۔ ڈرامہ کا مرکزی خیال اس وقت کی میری سوچ کا

آئینہ تھا۔ کہانی گاؤں کے ایک غریب لڑکے کی تھی جس کی ہتھیلی پر بچپن میں ایک امیر زادی سکول میں راکھی باندھ لیتی ہے۔ چنانچہ گاؤں میں وہی ایک لڑکا بہت بڑا ڈاکٹر بن جاتا ہے اور اس کی تعلیم کے لیے لڑکی کے باپ نے قرضہ فراہم کیا ہوتا ہے، اس لیے اس کی شادی اسی لڑکی کے ساتھ مجبوراً رچائی جاتی ہے۔ بھائی بہن کے رشتے کی پاکیزگی برقرار رکھنے کے لیے شادی کے باوجود لڑکا جسمانی ملاپ سے زندگی بھر گریز کرتا ہے جس کے باعث لڑکی کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ آخر میں وہ اپنی بیوی پر اس رشتے کا انکشاف کرلیتا ہے۔ اس ڈرامے کو میں نے کئی بار سٹیج پر لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کئی بار ریہرسل بھی ہوئے مگر ڈرامہ سٹیج کی زینت نہ بن سکا۔ اس ڈرامے کے صدقے میں کچھ دیر کے لیے سٹیج کے ساتھ بھی جڑ گیا لیکن پھر اس سے کنارہ کشی کرلی۔ آخر کار ڈرامے کا مسودہ ورق ورق بکھر گیا اور ردی کی ٹوکری میں اپنا وجود کھو بیٹھا۔ بہر حال اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ میرے دل میں تخلیق کی چنگاری پیدا ہوگئی۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ مجھے انگریزی، اردو، ہندی یا کشمیری کسی زبان میں مہارت حاصل نہ تھی۔ میں نے ڈرامے میں آدھے اردو اور آدھے ہندی کے الفاظ بھر دیے تھے اور جدھر دونوں زبانوں کے الفاظ نہیں ملتے تھے اُدھر انگریزی کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اسی باعث میں پوسٹ گریجویشن کے دوران شام کو اورئینٹل کالج میں اردو سیکھنے چلا جاتا۔

ڈرامہ اور اسٹیج کے ساتھ میرا اہنی مون زیادہ دیر نہ چل سکا۔ پہلے نورنگ ڈراماٹک کلب جوائن کرلیا اور پھر کلانکیتن۔ شوالہ مندر میں کلانکیتن کے ریہرسل جس سٹیج پر ہوتے تھے اس کا بیک گراونڈ ریاست کے مشہور پینٹر اور استاد کاشی ناتھ بھان نے بنایا تھا۔ کلانکیتن کی طرف سے کشمیری ڈرامہ ’تماہ‘ (طمع) کے دو شو گاندربل اور کنگن میں پیش کیے گئے جس میں میں نے پولیس انسپکٹر کا رول نبھایا تھا۔ سپاہی کا رول ایک چھوٹے قد کے مزاحیہ اداکار بشیر نے کیا تھا جو ان دنوں ایم ایس سی (زولوجی) کا طالب علم تھا۔ وہ چارلی چیپلن کی نقل کرنے میں ماہر تھا۔ سرینگر میں ٹی وی سٹیشن کے قیام کے بعد بشیر ٹی وی ڈراموں اور سیریلوں سے منسلک ہوکر بہت مقبول ہوا۔ اس کا ایک فقرہ ’شام لالہ بینڈ ہسے‘ بہت ہی مقبول ہوا۔ گاندربل اور کنگن میں ہمارے دونوں شو کامیاب رہے۔ ڈرامہ کلب جانے کا میرا مدعا یہی تھا کہ میں سٹیج کی تکنیک سمجھ کر ڈرامہ لکھ سکوں مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور میں نے جلد ہی ڈرامہ کلب کو خیر باد کہا۔ کئی

دوست اور وہ لوگ جن سے ڈرامہ کلب کے توسل سے رابطہ ہوا، ریڈیو اور ٹی وی سے جڑ گئے جن میں وجے ہنڈو، اشوک جیلخانی، اُوپندر خشو، پران چندرا، ڈی کے گنجو، اوتار زعفرانی، تیج تکو، زاہد حسین قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر نے آل انڈیا ریڈیو یا دوردرشن کی ملازمت اختیار کرلی اور ٹی وی سیریلوں میں بھی حصہ لیا۔ اُپندر خشو نے، جو میرا پڑوسی اور دوست تھا، ٹی وی سیریلوں جیسے گل گلشن گل فام، سنسکرتی، کرتویہ، سائے دیودار کے، اتفاق، چوراہا اور جال میں اداکاری کی۔ اس کے علاوہ اس نے چند فلموں جیسے انگارے، تباہی، سنیاسی میرا نام اور پت جھڑ میں بھی کام کیا۔

۱۹۷۰ء میں جب میں نے بی ایڈ میں داخلہ لیا تو میری سوچ اور نظریئے میں کافی بدلاو آچکا تھا۔ ایک روز میں نے کالج ڈبیٹ میں پہلی بار حصہ لیا۔ موضوع تھا 'گورونانک کی تعلیمات'۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ میری تقریر کے دوران خاص کر اختتام پر پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا مگر انعام کسی اور کو دیا گیا۔ بہت مایوسی ہوئی۔ گھر جا کر ایک افسانہ لکھ ڈالا جس میں اس ڈبیٹ کا ذکر تھا۔ دوسرے روز وادی کے مقبول ترین روزنامہ 'آفتاب' کے دروازے پر دستک دی۔ افسانے کا کوئی عنوان سوجھ نہیں رہا تھا، نراس ہو کر افسانے کی ہیروئن سلمٰی کا نام اوپر لکھ دیا اور آفتاب کے دفتر میں داخل ہوا۔ مدیر آفتاب کو افسانہ پیش کیا، انھوں نے بڑی بے رخی سے کہا۔ ''رکھتا ہوں مگر افسانے کو چھپنے میں کم سے کم تین مہینے لگ جائیں گے۔'' میں تو اتاولا ہو رہا تھا۔ پہلی تحریر تھی اور چاہتا تھا کہ افسانہ جلد سے جلد چھپ جائے، اس لیے ان سے مسودہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد ایک اور اخبار 'ہمدرد' کے دفتر پہنچ گیا۔ مدیر کرسی پر بیٹھے کچھ مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے افسانے کا مسودہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ دیکھتے ہی گویا ہوئے۔ ''بھئی کیا بات ہے، آج کل جو بھی افسانہ آتا ہے، عنوان 'سلمٰی' ہوتا ہے۔ میرے پاس اس عنوان کا ایک اور افسانہ پہلے ہی سے پڑا ہوا ہے۔ دیکھتا ہوں جو بہتر ہوگا اس کو آنے والے اتوار کو چھاپ لوں گا۔'' میں مطمئن ہو کر واپس چلا آیا اور اتوار کا انتظار کرنے لگا۔ اخبار تو میرے پاس آتا نہیں تھا، اس لیے صبح سویرے جا کر زینہ کدل کے پاس ایک کتب فروش (شاید غلام محمد بک سیلر نام تھا) کی دُکان پر اخبار ڈھونڈا، اسے الٹا پلٹا اور وہاں اپنا افسانہ روزنامہ ہمدرد کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا ہوا دیکھ لیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ زندگی میں شاید ہی پہلے کبھی ایسی خوشی کا احساس ہوا ہو۔ اخبار خرید کر گھر لوٹا۔ دیکھا افسانے کی پہلی قسط چھپی تھی اور دوسری قسط

اگلے اتوار کو متوقع تھی۔ دوسری قسط شائع ہوئی تو دونوں اخباروں کو بغل میں دبائے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو دکھاتا پھرا۔ جن کو اردو زبان پڑھنا نہیں آتی تھی ان کو کہانی پڑھ کر سنائی۔ کچھ لوگوں نے میری کوشش کو سراہا اور کچھ نے بس ’ہوں ہاں‘ کر کے ٹال دیا۔ صراف صاحب کے یہاں ان کے داماد کے قریبی دوست جواہر لال مدن آئے ہوئے تھے، نامور انجینئر تھے۔ انھوں نے افسانہ بڑے غور سے سنا اور اتنی داد دی کہ آج تک نہیں بھول پایا۔ ان کی حوصلہ افزائی نے میرے جوش و ولولے کو مہمیز لگائی۔ بدقسمتی سے وہ کچھ سالوں بعد ہی جوانی میں چل بسے۔

’سلمیٰ‘ کے بعد ایک اور افسانہ ’اُڑن کھٹولہ‘ لے کر میں روزنامہ آفتاب کے دفتر پہنچا۔ کمرے میں آفتاب کے مدیر ثنااللہ بٹ کھڑے تھے اور کسی کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگا کہ بٹ صاحب نے پی رکھی تھی حالانکہ کئی لوگوں نے بعد میں بتایا کہ وہ پینے کے عادی نہیں تھے۔ میں نے اندر گھستے ہی سلام کیا جس کا جواب انھوں نے یوں دیا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا۔“ میں نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔ ”سر، ایک افسانہ لکھا ہے۔ آپ اسے شائع کرلیں تو ممنون رہوں گا۔“ بولے۔ ”کیا نام ہے تمھارا؟“ میں نے جواب دیا۔ ”سر، میرا نام دیپک بُدکی ہے۔“ وہ سوال پر سوال کرنے لگے۔ ”کشمیری ہو؟“ میں بھی بلاتوقف جواب دیتا رہا۔ ”جی ہاں۔“ پھر وہ کچھ ناصحانہ انداز میں مخاطب ہوئے۔ ”کشمیری ...اور...اردو..؟ بھئی، کشمیری ہو تو اپنی مادری زبان میں لکھو۔ کشمیریوں کے لیے اردو میں لکھنا بہت مشکل ہے۔“ ان کے لہجے سے عجیب سی کراہت اور روکھاپن جھلک رہا تھا۔ جی میں آئی کہ منٹو، آغا حشر، دیا شنکر، قدرت اللہ، پریم ناتھ در اور پریم ناتھ پردیسی جیسے بیسیوں نام گنواؤں جنھوں نے کشمیری ہو کر بھی اردو میں نام کمایا ہے۔ مگر میں نے خود کو روک لیا اور صرف اتنا کہا۔ ”سر، آپ افسانہ پڑھ لیجیے، اچھا لگے تو چھاپ لیجیے۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے افسانہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انھوں نے میرے افسانے کے شروعاتی دو تین پیراگراف پڑھ لیے اور فوراً اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔ ”بھئی، یہ تو ’ماہِ نو‘ سے چوری کیا ہوا لگتا ہے۔“ میں حیران و پریشان کہ یہ ’ماہِ نو‘ کس چڑیا کا نام ہے؟ پوچھا۔ ”سر، ماہِ نو...؟ میں سمجھا نہیں...“ انھوں نے کہا۔ ”لاہور، پاکستان سے جو رسالہ شائع ہوتا ہے۔“ میں نے پھر مودبانہ عرض کی۔ ”جناب میں نے تو آج تک کوئی پاکستانی رسالہ دیکھا بھی نہیں ہے، چوری کرنا تو دور کی بات ہے۔ آپ کو پسند آئے تو شائع کر

لیجیے۔" انھوں نے افسانہ رکھ لیا۔ اس دن جب میں گھر لوٹ آیا، ایک عجیب سا اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ سوچنے لگا کہ کیا اردو زبان پر میری گرفت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ میری تحریر کسی معیاری پاکستانی رسالے کی تحریر جیسی لگ رہی ہے۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس کے بعد میرے کئی افسانے آفتاب میں تسلسل کے ساتھ چھپتے رہے۔ کچھ عنوانات جو یاد آ رہے ہیں یوں تھے۔ 'اڑن کھٹولہ'، 'ایک ہی خط'، 'یوم حساب'، 'ریزے'، 'آؤ کچھ اور لکھیں' وغیرہ۔

ان ہی دنوں میں نے ایک افسانہ بعنوان 'کینچلی' ہفتہ وار 'رفتار، جموں' کے مدیر اور مشہور افسانہ نگار موہن یاور کو بھیج دیا جو اسی مہینے چھپ گیا۔ افسانہ بہت اچھا تھا اور انھوں نے بڑے اہتمام سے چھاپا تھا۔ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور حوصلہ افزائی بھی۔ اسی طرح ایک مقامی ہفتہ وار، جس کا نام غالباً 'نشیمن' تھا، میں ایک اور افسانہ بعنوان 'ایک دو اور تین' شائع ہوا۔ اس افسانے پر ریاست کے تنقید نگار بشیر گاش نے کافی تنقید کی تھی اور افسانے کو فلمی کہانی کا ٹکڑا بتایا تھا۔ میں نے اس کا فوراً مدلل اور جذباتی جواب دیا تھا مگر بعد میں اس بات کا احساس ہوا کہ بحیثیت افسانہ نگار مجھے تنقید سے گھبرانا نہیں چاہیے اور نقاد کی باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے بعد میں نے ایک افسانہ 'آج جانے دو' کے عنوان سے ماہنامہ 'تحریک دہلی' کو بھیج دیا جو گوپال متل نے معذرت کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ کافی مایوسی ہوئی البتہ کئی برسوں کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ ماہنامہ 'تحریک' جدید طرز کے افسانوں کو ہی شائع کرتا ہے اور چونکہ میرے افسانے پر ترقی پسندی کی چھاپ تھی اور اس میں بھوک اور افلاس کی باتیں تھیں اس لیے ان کو پسند نہیں آیا ہوگا۔ کئی سال بعد بلراج کومل کی ادارت میں شائع ہونے والے میگزین 'تعمیر ہریانہ' میں میرا فکر انگیز افسانہ 'ادھورے چہرے' شائع ہوا جو کافی مقبول ہوا۔ ایمرجنسی کے دوران میں نے ایک علامتی کہانی 'جاگو' جدید انداز میں تحریر کی تھی جو سرینگر سے شائع ہونے والے رسالے 'تعمیر' میں شائع ہوئی تھی۔ اس افسانے میں ایمرجنسی پر تنقید کی گئی تھی۔

ریڈیو کشمیر یووانی اور جنرل سروسز سے میں کئی سال وابستہ رہا۔ وہاں مباحثوں اور دیگر پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ حالانکہ میں اکثر ریڈیو اور ٹی وی سٹیشن جاتا تھا مگر پروگراموں میں شرکت کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ دوستوں سے ملنے کی خاطر۔ دوردرشن میں میرے ایک دوست وجے ہنڈو کی

تقرری ہوئی تھی۔ اس نے کئی کوئز پروگراموں میں بحیثیت کوئز ماسٹر کے بلایا۔ اس کے لیے تو میں بھرتی کا آرٹسٹ تھا، جب کبھی اس کو پروگرام کے لیے کوئی کوئز ماسٹر یا اینکر حاضر نہیں ہوتا تھا تو وہ مجھے ٹیلی فون کر کے بلا لیتا اور میں کسی تیاری کے بغیر ہی اس کی ضرورت پوری کر لیتا۔ ایمرجنسی کے دوران یووانی کا پروڈیوسر، سی ایل کول، مجھ سے کافی مطمئن تھا اور میری تحریروں کو نشر ہونے سے پہلے پڑھتا نہیں تھا۔ یووانی کے لیے میں کشمیری زبان میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتا تھا۔ ایمرجنسی میں اس کی مجبوریوں کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن ایک روز اس نے مجھ سے یونہی پوچھ لیا کہ کیا تم کانگریسی ہو؟ مجھے ایسا لگا کہ اسے شاید میری تحریروں سے کانگریسی چمچہ ہونے کی بو باس آئی ہوگی۔ اس کے بعد جو تبصرہ ریکارڈ ہوا اسے پروڈیوسر نے نشر ہونے سے پہلے اچانک سن لیا اور خفگی سے مجھے مخاطب ہوا۔ ”دیپک، تم نے تازہ ترین تبصرے میں عورتوں پر جو تنقید کی تھی اس سے تو میری نوکری جا سکتی تھی، یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اس کو نشر ہونے سے قبل سن کر ایڈیٹ کر لیا۔“ میں نے اس کو وہ ڈائیلاگ یاد دلایا جس کے باعث یہ تبدیلی آچکی تھی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا بھروسہ دلایا۔ دراصل ایمرجنسی کے دوران سب لوگ ڈرے سہمے رہتے تھے اور کوئی بھی جوکھم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ ہر سو خوف و ہراس کا ماحول چھایا ہوا تھا۔

۱۹۷۴ء میں پروڈیوسر ظفر احمد کے چھٹی پر جانے کے سبب اس کا اسسٹنٹ قیوم وڈیرا قائم مقام بن گیا۔ میں نے ایک افسانہ ’ریزے‘ لکھا جس کو پڑھ کر قیوم نے مشورہ دیا کہ اس کو ڈرامائی روپ دے دو۔ ڈرامائی روپ دینے کے واسطے میں نے منظروں اور مناسب مکالموں کا اضافہ کر لیا۔ اس کو پروگرام ’ایک کہانی‘ کے تحت دوردرشن سرینگر سے ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ ان دنوں سرینگر مرکز کے ڈائریکٹر مظہر امام تھے۔ اس بہانے ان سے بھی رابطہ ہوا اور کئی بار ان کے ساتھ زیرو اِن ریستوراں میں بیٹھ کر افسانے کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ ان کے کئی مشورے آگے جا کر میرے لیے کافی مددگار ثابت ہوئے۔ افسانہ ’ریزے‘ ٹیلی وائز تو ہوا مگر پروڈکشن میرے من موافق نہیں تھی، اس لیے اطمینان کے بجائے میری حوصلہ شکنی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے پھر کبھی دوردرشن کو اپنا افسانہ ٹیلی وائز کرنے کے لیے نہیں دیا۔ بہت عرصہ بعد معروف افسانہ نگار نور شاہ کی وساطت سے ایک پرائیویٹ پروڈیوسر حسن خان نے، جو ہریش کھنہ کے نام سے بالی وُڈ میں کام کرتا تھا، مجھ سے ایک دو کہانیاں کسی ٹیلی سیریل کے لیے خرید لیں مگر اس کا

پروجیکٹ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

’جہان نو‘ کے دفتر میں میری ملاقات طاہر مضطر سے ہوئی جو وہاں پر اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کام کرتا تھا۔ بہت عرصہ بعد اس سے دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا اور وہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ اس کے گھر بھی کئی بار جانا ہوا جہاں اس کی نیک اور سگھڑ بیوی کے ہاتھ کا بنا ہوا لذیذ کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دفعہ اس نے مجھے اپنے گھر دعوت پر بلایا تھا۔ وہاں دو کشمیری پنڈت لکچرر بیٹھے تھے جن میں سے ایک علم الاعداد (Numerology) کا ماہر تھا اور مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرتا تھا۔ میں ان دنوں بہت مصیبت میں تھا، ایمپوریم کی نوکری چھوڑ دی تھی اور دوسرے دن نوکری کی تلاش میں دہلی جانا تھا۔ اس لیکچرر نے مجھے بتایا کہ تمھیں واپس آنا پڑے گا۔ میں حیران ہوا کیونکہ وہاں میرا انٹرویو کال آچکا تھا اور ایک سال پہلے اسی نوکری میں میرا نام میرٹ لسٹ میں دوسرے نمبر پر تھا۔ یوں بھی میں ایسی پیش گوئیوں پر یقین نہیں کرتا مگر اتفاق سے حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مجھے ہزار کوششوں کے باوجود واپس آنا پڑا۔

’جہان نو‘ میں کام کرنے سے قبل طاہر مضطر نے خود اپنے دو ہفتہ وار ’آہنگ‘ اور ’سلسبیل‘ یکے بعد دیگرے شائع کیے تھے۔ طاہر ایک بہت ہی سلجھا ہوا، سنجیدہ اور ذہین صحافی تھا۔ وہ قلم کا دھنی تھا اور بے باکانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ مارکس اور خلیل جبران سے کافی متاثر ہو چکا تھا اور سوشلزم و سیکولرازم پر اٹل وشواس رکھتا تھا۔ خلیل جبران کا تعارف مجھے اسی کی وساطت سے ہی ہوا تھا چنانچہ اس نے مجھے ’دی پروفٹ‘ کا اردو ترجمہ اور انگریزی میں جبران کے مکتوبات کا مجموعہ پڑھنے کو دیا۔ مطالعہ کے بعد میں خلیل جبران کا پرستار بن گیا۔ طاہر مضطر نے اپنے اخبار پولیٹکل ٹائمز میں میرا ایک متنازع مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا: ’جہیز کوئی لعنت نہیں، عورتوں کا جائز حق ہے‘۔ اس مضمون نے کچھ حلقوں میں ہنگامہ برپا کر دیا اور سنا ہے کہ ایک خاتون نے یونیورسٹی کے ڈبیٹ میں اسی مضمون کو اپنا بنا کر پڑھ لیا اور فرسٹ پرائز جیت لیا مگر میں اس واقعے کی صداقت کی توثیق نہیں کر پایا۔

طاہر مضطر کی شخصیت میں چند خامیاں بھی تھیں۔ وہ سیماب صفت تھا اس لیے ایک ہی جگہ پر نہیں ٹک پاتا تھا۔ کبھی ذاتی طور پر ’آہنگ‘ اور ’سلسبیل‘ کا اجرا کیا، کبھی پولیٹکل ٹائمز شائع کیا، کبھی جہان نو میں کام کرتا رہا، کبھی چنار میں اور کبھی نیشنل کانفرنس کے نوائے وقت میں، کبھی فاروق عبداللہ کا پولیٹکل

سیکریٹری بن گیا اور کبھی ذاتی بزنس کرنے کے لیے دہلی میں دکان کھولی۔ انگریزی کا مقولہ "A rolling stone gathers no moss" اس پر صادق آتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ اپنے فائدے کے بارے میں کم ہی سوچتا تھا۔ میرا ماننا ہے کہ اگر وہ مستقل مزاج اور زمانہ ساز ہوتا تو زندگی میں بہت نام آوری حاصل کر لیتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے رنگیلی طبیعت پائی تھی۔ شراب اور شباب کا رسیا تھا۔ جن دنوں فاروق عبداللہ کے ساتھ رہا کسی حسینہ کے چکر میں پھنس گیا اور اپنے گھر کی شانتی درہم برہم کر دی۔ اس وجہ سے زندگی کے آخری مرحلے پر اس کے گھر میں کافی تناؤ رہنے لگا۔ اس کی شاعری کا ایک مجموعہ بعنوان 'نیلام گھر' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ طاہر مضطر نے کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے بھی ایک مبسوط کتاب لکھی تھی مگر اس کی کاملیت پسندی اور سیمابی طبیعت آڑے آئی اور وہ کتاب ان کی حیات میں منظر عام پر نہ آسکی۔ ۲۷/مارچ ۲۰۱۳ء کو طاہر اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

جیسا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں جہانِ نو کے ساتھ میرا سمبندھ زیادہ دیر نہیں رہا۔ اس کے بعد ہفتہ وار 'نوجیون' اور 'ہمارا کشمیر' کے ساتھ بھی کچھ دنوں وابستہ رہا مگر ان کو بھی جلدی ہی الوداع کہہ دیا۔ ہفت روزہ 'نوجیون' کے مالک شری شمبھو ناتھ کاچرو تھے، جو میرے سکول ٹیچر بھی رہے تھے۔ مگر میں نے ان کو اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا بلکہ ایک روز یونہی شیتل ناتھ میں واقع نوجیون اخبار کے دفتر چلا گیا اور وہاں مدیر سے بات کی۔ انھوں نے مالک سے منظوری لے کر مجھے اخبار کے لیے کارٹون بنانے کی اجازت دی۔ دراصل میرا منشا صرف کارٹون بنانے کا نہیں تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ یونیورسٹی کی روزانہ ڈائری لکھا کروں اور اس طرح کالم نگاری بھی شروع کروں۔ کچھ روز کارٹون بنا کر میں نے مدیر سے اپنی خواہش کا اظہار کیا مگر اس نے آناکانی کر لی۔ نتیجے میں میں بدظن ہو گیا اور وہاں جانا چھوڑ دیا۔ کچھ وقفے کے بعد کاچرو صاحب اچانک راستے میں ملے اور میں نے ان کو سارا ماجرا سنایا۔ انھیں اتنا تو یاد تھا کہ انھوں نے کارٹون بنانے کی منظوری دی تھی اور مدیر سے کہا تھا کہ مبلغ ۵۰/- روپے ماہوار کارٹونسٹ کو بطور محنتانہ دیا کریں مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کارٹونسٹ میں تھا اور نہ ہی کالم نگاری کے بارے میں انھیں کوئی جانکاری تھی۔ وہ ہنس دیے اور کہنے لگے۔ ''اچھا تو وہ تم تھے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سر میں چاہتا تھا کہ میں جو کچھ بھی لکھوں اس کو آپ پہلے دیکھ لیں اور اس کی تصحیح فرمائیں تاکہ میری طرزِ نگارش سدھر جائے۔'' انھوں نے

مربیانہ انداز میں کہا۔ ''دیپک، جو کچھ من میں آتا ہے، لکھتے رہو اور اسے چھپواتے رہو لیکن جو کچھ چھپتا ہے اس کو کچھ وقفے کے بعد دوبارہ پڑھ لو اور کئی بار پڑھ لو۔ تمہیں خود ہی اپنی تحریروں میں غلطیوں کا احساس ہوجائے گا اور اگلی بار ان سے گریز کرو گے۔ اخبار میرا ہے، تمھیں جو لکھنا ہے لکھتے رہو۔ اس پر کوئی کارروائی ہوتی ہے تو بحیثیت چیف ایڈیٹر اور پبلشر میں ذمہ داری لوں گا تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' ان کی باتیں سن کر میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ مجھے وہی سکول کے دن یاد آئے جب وہ ہم کو بہادری، بے باکی اور آزاد فکری کی صلاح دیتے تھے۔ تاہم میں کچھ ذاتی مصروفیات کے سبب پھر کبھی نوجیون کے لیے کارٹون بنانے یا کالم لکھنے کے لیے نہیں جاسکا۔

اسی دور میں مجھے ایک ادیب سبھاش چندر ایمہ عرف پریمی، رومانی سے تعارف ہوا۔ وہ ریاست کے مشہور افسانہ نگار، محقق و ناقد ڈاکٹر برج پریمی کے فرزند ہیں۔ باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ میں خوش نویس ہوں اور کاربن لگا کر فونٹین پین سے چار کاپیاں لکھ سکتا ہوں۔ اس نے مجھ سے اپنے پتاجی کے مقالے کی کتابت کرنے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر برج پریمی نے کچھ برس پہلے سعادت حسن منٹو پر بہت ہی سیر حاصل مقالہ برائے پی ایچ ڈی قلم بند کیا تھا مگر ابھی تک اسے یونیورسٹی میں پیش نہیں کر پائے تھے۔ میں نے حامی بھر لی اور روزانہ ان کے گھر، جو نزدیک ہی تھا، جا کر آدھی رات تک چار پانچ صفحات لکھ کر لوٹ آتا تھا۔ قریباً ساٹھ فیصد کام ہوگیا تھا کہ میں خود آئی اے ایس امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اس لیے میں نے ان کے گھر جانا بند کر دیا۔ کچھ موڈ بھی نہیں بن رہا تھا۔ البتہ میں نے اس کا ایک اور طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ پریمی رومانی خود بھی خوشخط لکھتا تھا، اس لیے اس کو کاغذ رکھنے، کاربن استعمال کرنے اور اس پر بال پین سے لکھنے کی تکنیک سکھائی۔ اس طرح باقی ماندہ کام اس نے خود ہی مکمل کیا۔ بہر حال اختتام پر میں نے مقالے کے ہر سبق کے آغاز میں منٹو کے مختلف خاکے بنائے اور سبق کا عنوان جلی حروف میں لکھ دیا تاکہ مقالے کی تزئین ہو۔ اس طرح برج پریمی صاحب کو کچھ ہی مہینوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی اور ساتھ ہی ان کی تقرری بھی یونیورسٹی میں ہوئی۔ کچھ بد مزگی اس بات کی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے جہاں میرا تشکر مقالے کے پیش لفظ میں کیا تھا وہیں کتاب کے پیش لفظ میں یہ الفاظ حذف کیے گئے تھے۔ بدقسمتی سے مائیگریشن کے فوراً بعد ان کا جموں میں دیہانت ہوگیا اور تحقیق کا وہ سب کام جو وہ کرنا

چاہتے تھے، ادھورا رہ گیا۔ پریمی رومانی خود بھی شاعر، نقاد اور صحافی ہے اور کئی اہم تخلیقات کا مصنف و مرتب بھی۔ وہ اپنے پتا جی کے ادھورے کام کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم ڈاکٹر برج پریمی کی ناگہانی موت کے باعث منٹو اور دیگر ادبی شخصیات کے حوالے سے اردو ادب میں جو خلیج پیدا ہوگئی ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوگی۔

ایمپوریم، صحافت اور پھر ریڈیو ٹی وی کی وجہ سے کئی مقامی ادیبوں کے ساتھ جان پہچان ہوگئی جیسے بشیر شاہ، رفیق راز، قیوم ہمدم، اقبال فہیم، حسن ساہو، شاہد بڈگامی وغیرہ۔ چند ایک کے ساتھ اب بھی فیس بک پر رابطہ برقرار ہے۔ رفیق راز ایک بہت ہی سلجھے ہوئے کم گو شاعر ہیں جو جدیدیت کی سیڑھی چڑھ کر صوفی ازم کی جانب مائل ہوگئے۔ ان کے ساتھ ایمپوریم میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ایمپوریم کی وساطت ہی سے ایک اور جدیدیے قیوم ہمدم سے رابطہ ہوا۔ دونوں شب خون پر چھائے رہتے تھے اور کشمیر کو دونوں شاعروں پر ناز ہے۔

اسی زمانے میں میری ملاقات ہفت روزہ 'عقاب' کے مدیر منظور انجم سے ہوئی۔ اس نے اپنے کیرئر کی ابتدا کتابت سے کی تھی اور بعد میں اپنا ہفت روزہ اخبار شروع کیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے اخبارات عام طور پر گورنمنٹ سے سبسڈی والی ریٹ پر نیوز پرنٹ حاصل کرنے کے لیے نکالے جاتے تھے تاکہ اس کو کالے بازار میں بیچ کر منافع کمایا جاسکے۔ بات بات میں میں نے اخبار کو باضابطہ طور پر نکالنے کا منشا ظاہر کیا جو اس کو پسند آیا۔ اس طرح میں ہفتہ وار 'عقاب' کے ساتھ جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک ہوگیا۔ اس اخبار کو پاکستان نواز 'بکرا' پارٹی کے سربراہ میر واعظ مولوی محمد فاروق کی بالواسطہ سرپرستی حاصل تھی۔ لیکن سقوطِ پاکستان کے پس منظر میں انھوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم مُرار جی ڈیسائی کے اصرار پر جنتا پارٹی بنائی۔ منظور میرے گھر کے نزدیک ہی راجوری کدل میں رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں آدھی رات تک اس کے گھر میں بیٹھ کر اخبار کے لیے مضامین اور کالم لکھتا، کارٹون بناتا، ایکٹریسوں کی تصویریں بناتا اور موڈ بن جاتا تو اخبار کی سرخیاں بھی لکھ لیتا۔ منظور تب تک اخبار کی کتابت کرتا تھا۔ میں نے اخبار کی نئی وضع کاری (Layout) بھی کر لی تاکہ اس کی الگ پہچان بن سکے۔ عقاب آفسیٹ کے بجائے لیتھو گرافک پرنٹنگ پریس پر چھپتا تھا، اس لیے مخصوص زرد کاغذ پر مخصوص روشنائی سے کتابت کرنا پڑتی تھی۔ ان دنوں

میں ریاستی سرکار کے ادارے کشمیر ایمپوریم میں کام کرتا تھا، اس لیے فرضی نام 'ڈی کے سنتوش' اختیار کیا تھا۔ جب سے میں نے اخبار کی باگ ڈور سنبھالی، اخبار دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا اور ایک ہی سال میں وادی کے اہم اخباروں میں گنا جانے لگا۔ فخر کی بات یہ تھی کہ نئی دنیا دہلی اور نشیمن بنگلور جیسے ہفت روزہ اخباروں کو بھی ٹکر دینے لگا۔ اس مقبولیت کے پیچھے سنسنی خیزیت کا بہت بڑا ہاتھ تھا جس کو میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اخبار کی سرخیاں بلٹز کی طرح دلفریب ہوا کرتی تھیں۔ جو سرخی پڑھ لیتا اخبار خریدنے پر آمادہ ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنے زور قلم پر رشک آنے لگا تھا۔ علاوہ ازیں میں نے اس کی مارکیٹنگ کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ اخبار کو حکومت کے اشتہار نہیں ملتے تھے۔ بس دس روپے کے عوض مئوناتھ بھنجن سے چھوٹے موٹے 'نورانی تیل' جیسے اشتہارات ملتے تھے۔ میں نے ان سے رابطہ کر کے اشتہاروں کی قیمت بڑھانے کا فیصلہ کر لیا جو انھیں گوارا نہ ہوا اور انھوں نے اشتہار بھیجنا ہی بند کر دیا۔ میری نظر اب حکومت کے اشتہاروں پر تھی جس کے لیے اخبار کا تسلسل یقینی بنانا ضروری تھا۔ اسی طرح میں نے کئی سفارت خانوں سے رابطہ قائم کیا اور وہاں سے بہت سارا انگریزی اور اردو میں مواد آنے لگا جس کو میں تلخیص کر کے نیوز آئیٹم بنا لیتا تھا یا کوئی اہم موضوع ہوتا تو پورا مضمون ہی ترجمہ کر کے چھاپ لیتا تھا۔ دریں اثنا ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اخبار کا عید ایڈیشن شائع کر لیں۔ سعودی عرب سفارت خانے نے خانہ کعبہ کا ایک بہت ہی دلکش بلاک بھیج دیا جو ہم نے فرنٹ پیج پر استعمال کیا۔ اس سلسلے میں ہم دونوں مولوی فاروق صاحب کے پاس اس لیے گئے کہ شاید وہ کچھ مالی امداد کریں گے۔ انھوں نے اپنے گھر سے کچھ فرنیچر دینے کی آفر کر لی مگر روپے پیسے کی کوئی بات نہیں کی۔ اتنی دیر میں مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے ان سے ایک پوسٹ کارڈ سائز فوٹو کا بلاک اور ان کے دست مبارک سے لکھا ہوا پیغام مانگا جو انھوں نے فوراً دے دیا۔ چنانچہ وہ کشمیری مسلمانوں کے ایک مخصوص فرقے کے، جنھیں 'بکرا' کہتے ہیں، سربراہ تھے اور اس فرقے میں اکثر و بیشتر آسودہ حال طباخ، ہوٹل مالک اور بیکری والے شامل تھے، اس لیے میں اور منظور اگلے کئی روز تک اپنے ہاتھوں میں مولوی صاحب کا پیغام اور فوٹو لے کر ان سے ملتے رہے اور اخبار کے لیے اشتہار مانگتے رہے۔ میں ان سے صرف مواد کی درخواست کرتا اور یہ یقین دلاتا کہ اشتہار خوبصورت ہوگا جو میں خود ہی ڈیزائن کر لوں گا۔ اس طرح دو تین روز میں بارہ ہزار روپے جمع ہو گئے۔

رات دن محنت کر کے ایک ضخیم اور رنگین عید نمبر چھپ کر آ گیا جس نے سبھی کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایک ہزار پرچے چھاپنے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ چونکہ ہم نے پہلے ہی بارہ ہزار روپے کمائے تھے اس لیے اخبار کی قیمت صرف پچاس پیسے رکھ لی۔ لال چوک میں ایک ہاکر ہوتا تھا جس نے سرینگر ٹائمز کو مقبول بنانے میں کافی رول ادا کیا تھا لیکن اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اخبار تو بیچتا ہے مگر اس سے پیسے وصول کرنا بہت مشکل کام ہے۔ خیر میں نے عید نمبر کے بارے میں اس کو اطلاع دی اور اپنے ساتھ ریڈ کراس روڈ پر واقع عقاب کے دفتر لے گیا۔ اخبار دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کہنے لگا۔

”صاحب کتنی قیمت ہے اس کی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پچاس پیسے۔“ اس نے منہ میں انگلی دباتے ہوئے کہا۔ ”بس پچاس پیسے...! اور وہ بھی ۴۸ صفحات کے لیے...! یہ آپ نے کیا کر دیا...“ پھر دوبارہ بول اٹھا۔ ”میں اسے کسی بھی قیمت پر بیچوں آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”مجھے کیا اعتراض ہوگا، تم جتنے پرچے چاہو، پچاس پیسے کے حساب سے پہلے قیمت چکاؤ، باقی تمھاری مرضی۔ ایک ہاتھ دے اور دوسرے ہاتھ لے۔“ بات طے ہوئی۔ ہم نے میلنگ لسٹ اور اشتہار دینے والوں کے لیے دو سو اخبارات رکھ لیے اور اس کو چار سو روپے کے عوض آٹھ سو پرچے دے دیئے۔ جاتے جاتے میں نے ایک درخواست کی۔ ”بھائی میرا ایک کام بھی کرتے جاؤ۔ ایک پرچہ روزنامہ ’آفتاب‘ کے مدیر ثنا اللہ بٹ صاحب کو دے دینا۔“ ثنا اللہ بٹ نے اسی کے ہاتھ ایک چھوٹے سے کاغذ پر شکریہ کا نوٹ یوں لکھ کر بھیجا۔ ”بہت بہت شکریہ۔ ایسا عمدہ عید نمبر وادی میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔“ نوٹ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مگر میں نے ناتجربہ کاری کے سبب اس کو کوڑے دان میں پھینک دیا۔ آج جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ مجھے اس نوٹ کو فریم کروانا چاہیے تھا کہ وہ ہماری محنت کی سرٹیفکیٹ تھی جو وادی کے عظیم ترین صحافی نے دی تھی۔ اِدھر عید نمبر سے ملی رقم کو میں بزنس کے لیے وقف کرنا چاہتا تھا۔ میں نے منظور انجم سے اس بارے میں بات کی کہ تم اپنا ماہوار گھریلو خرچہ طے کر لو اور صرف اتنا ہی اٹھایا کرو اور باقی اپنے نام سے بنک میں جمع کر لو تاکہ یہ روپیہ جو ہمیں یک مشت ملا ہے بطور بنیادی سرمایہ (Seed capital) کے مستقبل میں میسر ہوتا رہے، نتیجے میں عقاب کی ترقی ہوگی اور ہم اس کو روزنامہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس نے سنی ان سنی کر دی اور دوسرے روز سے کیلاش میں ہم دونوں ان روپوں سے

چائے اور کباب کے مزے اُڑانے لگے جب تک کہ جیب خالی ہوگئی۔ اس طرح عقاب کے بارے میں میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

مولوی فاروق صاحب سے کئی بار ان کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ بہت ہی خوبصورت اور خوب سیرت کردار و گفتار کے مالک تھے۔ ایک بار یونہی منظور اور میں ان سے ملنے گئے، میں نے اپنی ڈاڑھی بڑھائی تھی اور بانڈی پورہ کی کالی کمبل اوڑھے اور پاؤں میں ہوائی چپل پہنے تھا، وہ دروازے کے پاس ہی ملے۔ انھیں محرم کے سلسلے میں منعقدہ نعتیہ مشاعرے میں ٹیچرس ٹریننگ کالج جانا تھا۔ ہم دونوں کو ساتھ لے گئے، کار میں منظور آگے بیٹھا اور مولوی صاحب اور میں پیچھے۔ ٹی ٹی کالج میں جب وہ دائیں سے اترے، تو ایک بڑے ہجوم نے ان کا استقبال کیا اور سبھی ان کو دیکھ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے رہے کہ ایسے معتبر آدمی کی زیارت ہوگئی۔ کار کی دوسری طرف میں اترا اور کچھ لوگ میری طرف بھی آئے اور یوں ہی دیوانے ہونے لگے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا اور نہ ہی آگے جانے کی ہمت ہو رہی تھی۔ بس وہیں ساکت کھڑا رہا۔ مولوی صاحب نے مڑ کر دیکھا تو شاید بھانپ گئے، ان لوگوں کو اپنی طرف بلایا اور اس طرح میری خلاصی ہوگئی۔ ان کے لکچر کے دوران میں اور منظور سٹیج پر بیٹھے رہے اور اہم نوٹس لیتے رہے۔

اُدھر عید کے بعد آنے والے محرم پر میں نے محرم نمبر نکالنے کی ٹھان لی۔ عید نمبر تو سُنّی مسلمانوں کے حلقے میں مقبول ہو چکا تھا، اب میرا خیال تھا کہ 'محرم نمبر' ایشو کر کے شیعہ طبقے کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مگر منظور انجم نے، جس پر پوری کتابت کا انحصار تھا، کچھ سستی دکھائی اور پرچہ نویں محرم تک تیار نہ ہوسکا۔ اس دن پرنٹنگ پریس میں جا کر چھپوالیا اور دسویں محرم کو مارکیٹ میں ڈال دیا۔ وہی ہاکر جو عید نمبر لے کر گیا تھا، اس روز بھی آدھا بنڈل اٹھا کر لے گیا مگر دو تین گھنٹوں میں ہی لوٹ آیا۔ اچانک شیعہ سنی فسادات رونما ہوگئے تھے اور محرم کے جلوس پر پتھر بازی ہوئی تھی۔ کئی لوگ زخمی ہوگئے تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ اس دن شیعہ لوگ ماتم کرنے میں مصروف تھے اس لیے اخبار خریدنے میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ ایک ہزار اخبارات میں سے سو اخبار بھی نہیں بک سکے۔ منظور انجم کے چہرے پر بل پڑ گئے۔ کہا تو کچھ بھی نہیں مگر لگ رہا تھا کہ وہ محرم نمبر نکالنے کے حق میں نہیں تھا۔ پہلے کتابت میں دیر کر دی

اور پھر ایک ہزار کا خرچہ۔ خیر میں نے اپنے ایک شیعہ دوست اسلامیہ کالج کے پروفیسر منظور حسین کو بلایا اور یوں طعنہ مارا۔ ''یار تم شیعہ لوگ کیسے ہو، ایک روپے کا محرم نمبر بھی نہیں خرید سکتے۔ ہم نے اتنا اچھا نمبر نکالا تھا۔ سارے کا سارا واپس آ گیا۔'' اس نے چپ چاپ پانچ سو کاپیاں اٹھالیں اور گھر گھر جا کر بیچ ڈالیں، پھر دو چار دن کے بعد ہمیں روپے تھما دیے۔ میں اس کی ہمت کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔

عقاب کے کئی شماروں میں میرے متنازع فیہ مضامین چھپ گئے تھے۔ ایک روز درجن بھر افراد، جن میں اکثر صحافی تھے، کافی ہاؤس میں بیٹھے اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ وادی میں آج کل کون سا ویکلی اخبار سب سے اچھا ہے۔ سب لوگوں نے شمیم احمد شمیم کے 'آئینہ' کو پہلا نمبر دیا جس میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جب دوسرے نمبر کی باری آئی تو کچھ لوگوں نے 'عقاب' کو دوسرے درجے پر رکھا۔ ایک آدمی نے، جس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ریاستی سی آئی ڈی میں اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے، مداخلت کی۔ ''یار آج کل تو کوئی مسلمان رائٹر کشمیری پنڈت کا نام اختیار کر کے عقاب میں نوجوانوں اور عوامی مفاد کے بارے میں لکھتا ہے اور حکومت کی پر زور مخالفت کرتا ہے، بہت تیز اور نوکیلا قلم ہے اس کا۔'' طاہر مضطر مسکرایا، پھر میری طرف دیکھنے لگا کیونکہ وہی ایک شخص تھا جو اس حقیقت سے آشنا تھا۔ وہ جھٹ بول پڑا۔ ''کیوں پنڈت نہیں لکھ سکتا ہے؟'' خفیہ پولیس کے آدمی نے کہا۔ ''ارے تم اس کی تحریروں کو پڑھ تو لو، کوئی کشمیری پنڈت ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔'' اس پر طاہر سے رہا نہ گیا اور اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے وہ کشمیری پنڈت، تمھارے سامنے بیٹھا ہے۔'' میری تو دل کی دھڑکنیں ہی رک گئی۔ سب میری جانب دیکھنے لگے مگر میں نے حامی بھرنا صحیح نہیں سمجھا۔ محفل ختم ہونے کے بعد خفیہ پولیس کے آدمی نے مجھے اپنے ساتھ آنے کی درخواست کی۔ میں سچ مچ گھبرا گیا کہ اب تک تو بچ گئے اب بچنا مشکل ہے۔ بوجھل قدموں سے میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے پلیڈیم سینما کی بغل میں 'فلورا' ریستوراں میں لے گیا اور وہاں چائے کباب کا آرڈر کر لیا۔ بیٹھنے سے پہلے وہ مجھ سے زور سے بغل گیر ہوا اور کہنے لگا کہ اگر کشمیر میں دو چار ہی تمھارے جیسے جیالے نوجوان پیدا ہوں تو آزادی ملنا کوئی مشکل بات نہیں۔ میں اس کے رویے پر حیران رہ گیا کہ انسان کے چہرے سے اس کی حقیقت عیاں نہیں ہوتی۔

جس زمانے میں شیخ محمد عبداللہ اور اندرا گاندھی کے درمیان مذاکرات چل رہے تھے، میرا ایک

مضمون عقاب میں شائع ہوا تھا جس میں شیخ محمد عبداللہ کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس مضمون کی وجہ سے مرکزی حکومت کی خفیہ ایجنسی حرکت میں آگئی تھی۔ میرے دو دوستوں نے، جو میرے ساتھ کلا نکیتن ڈرامہ کلب میں کام کر چکے تھے اور اب اسی خفیہ ایجنسی میں ملازمت کرتے تھے، مجھے ممکنہ سرکاری کارروائی سے آگاہ کیا کیونکہ میں خود ریاستی کارپوریشن میں ملازم تھا۔ تفتیش کرنے والوں نے پتا لگا یا تھا کہ یہ مضمون کس نے لکھا ہے حالانکہ اس پر ’ڈی کے سنتوش‘ کا نام درج تھا۔ میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر نوکری پیاری ہے تو کنارہ کشی اختیار کرلو اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا سب مواد جلا ڈالو۔

دوسری جانب منظور انجم کا رویہ کچھ مشکوک سا ہو رہا تھا۔ ہماری دوستی کے سرکل میں دو اور اشخاص تھے جو عید نمبر کی کامیابی دیکھ کر اخبار سے جڑنا چاہتے تھے۔ انھوں نے منظور انجم کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ اگلے شمارے میں اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی ان کے نام ادارتی بورڈ میں شامل کر دیے جبکہ اخبار کی اشاعت میں انھوں نے رتی بھر بھی امداد نہیں کی تھی۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ کہاں تو میں اور منظور رات رات بھر جاگ کر اخبار کو منظر عام پر لاتے تھے اور کہاں وہ لوگ جنھوں نے کبھی کوئی مدد نہیں کی، ادارتی بورڈ پر حاوی ہو گئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اس لیے میں نے دل برداشتہ ہو کر اخبار سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کے بعد ہفت روزہ عقاب کے صرف دو شمارے منظر عام پر آ گئے۔ پھر کئی برس عقاب مختلف ہاتھوں سے گزرتا رہا اور خود منظور انجم ٹھیکے داری میں کھو گیا۔ ۱۹۸۸ء میں جب میری پوسٹنگ واپس کشمیر ہوئی تو مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ عقاب دوبارہ منظور انجم کی ادارت میں باضابطہ بطور روزنامہ شائع ہو رہا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور واقع یاد آیا۔ میں اور منظور انجم لال چوک میں کیلاش ہوٹل کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے عبدالرشید صوفی ’شاہین‘ اور الیاس قریشی ملے۔ شاہین میرے ساتھ یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویشن کرتا تھا اور ہر وقت سیاست میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنی پارٹی میں شامل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاید حراست میں بھی کئی بار رہ چکا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کے بہت قریب تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنے دوست سے ہفت روزہ ’سیر بین‘ کا، جس کا وہ مدیر تھا، ایک پرچہ مانگا اور مجھے یہ کہہ کر دے دیا۔ ”یہ میرا اخبار ہے، شیخ صاحب کی پالیسیوں کو عوام تک پہنچاتا ہوں۔“ میں نے

مسکرا کر منظور سے عقاب کا پرچہ مانگ لیا اور شاہین کو یہ کہہ کر تھمایا۔ ''میں بھی اخبار نکالتا ہوں، شیخ صاحب کے حریف، مولوی فاروق صاحب کا، یہ لیجیے عقاب کا تازہ شمارہ۔'' وہ ہیڈ لائن پڑھ کر ہی چونک گیا۔ پھر ہم نے اپنی اپنی راہ لی لیکن اس کے ساتھ رابطہ اب بھی قائم ہے۔ ایک اور بار اس سے ایم ای ٹی سوپور میں ڈاکخانے کے افتتاحی پروگرام میں ملاقات ہوئی جہاں اس نے بے ارادہ مجھ پر طنز کیا جس کا میں نے اپنے لیکچر میں خاطر خواہ جواب دیا۔ شاہین نیشنل کانفرنس کی جانب سے ریاستی کابینہ کا وزیر بھی رہا اور بعد میں لوک سبھا کا ایم پی بھی بنا۔

ریاستی سرکار کے سابقہ یساری وزیر پیر غیاث الدین ایک میگزین 'علم و دانش' کے نام سے نکالتے تھے، ان سے ملاقات کے بعد کبھی کبھار ان کے رسالے کی ترتیب و تزئین میں مدد کرتا تھا۔ ایک روز میں اندر کمرے میں کام کر رہا تھا کہ باہر ان کے کئی پرانے ساتھی اور رفیق کار جمع ہو گئے۔ خوب بحث ہوتی رہی اور ایک دوسرے پر اس بات پر طعنے کسے جا رہے تھے کہ کابینہ وزیر کی کرسی پر بیٹھ کر کس کا کس کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ سے لے کر اس لمحے تک جتنے بھی کابینہ وزیر ہوئے تھے ان سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ انکشافات کیے گئے۔ میں اندر بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ اب میرے پوپھا شام لال صراف کا بھی نام اچھالا جائے گا مگر ان کا نام کسی نے نہیں لیا، نتیجتاً دل میں کافی بشاشت ہوئی۔

۱۹۷۶ء میں انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کر کے مجھے پروبیشن کے لیے لال بہادر شاستری اکیڈمی، مسوری جانا پڑا۔ وہاں میں نے کالج کے اِن ہاؤس میگزین 'چیتنا' کا اردو سیکشن پہلی بار نکالا۔ یہ میگزین زیراکس کر کے نکالا جاتا تھا۔ انگریزی اور ہندی کے لیے سٹینسل پر ٹائپ کر کے سائیکلوسٹائل کیا جاتا تھا لیکن اردو کے لیے سٹینسل پر ہاتھ سے کتابت کرنا پڑی۔ چنانچہ وفائی صاحب نے مجھے خطاطی سکھائی تھی اس لیے میرے لیے یہ کام آسان تھا۔ کچھ پروبیشنرس کی اچھی غزلیں، نظمیں اور افسانے اکٹھے کر کے اس میں شامل کر لیں۔ اپنا بھی ایک افسانہ 'راکھ کا ڈھیر' اس میں چھاپ لیا۔

مسوری کے بعد میں فیلڈ ٹریننگ کے لیے اتر پردیش کے شہروں اور قصبوں میں گھومتا رہا۔ فتح پور میں پوسٹ ماسٹری کی تربیت پا رہا تھا کہ شاعر ظفر اقبال ظفر سے ملاقات ہوئی اور وہ تب سے میرا اچھا دوست بن گیا۔ وہاں پر کبھی کبھار کچھ شعرا اور افسانہ نگار بھی میرے کاشانے پر آیا کرتے تھے۔ انہی دنوں

میرے افسانے ’پلاسٹک کے پھول‘ (اس افسانے کا عنوان بعد میں ’کالا گلاب رکھا گیا)، ’سپنوں کا شہر‘ اور ’راکھ کا ڈھیر‘ کانپور سے چھپنے والے رسالوں رگِ سنگ اور ’گنگ و جمن‘ میں چھپ گئے۔ چنانچہ مجھے اچھی نوکری ملی تھی اور میں کبھی کبھار اپنی کہانیوں میں سرکاری نظام کی نکتہ چینی بھی کرتا تھا، اس لیے میں اپنے نام سے افسانے چھاپنے کا رِسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیا معلوم کب کس عتاب کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لیے میں نے موہن نرمل اور دیپک نرمل بطور قلمی نام اختیار کیے مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ ۱۹۷۹ء میں ڈیپوٹیشن پر سینا ڈاک سیوا میں چلا گیا اور وہاں پر ایک افسانہ ’آج جانے دو‘ اے پی ایس میگزین ’میل ملاپ‘ اور دو ایک افسانے مثلاً ’کون سا نام‘ فوجی رسالے ’سینک سماچار‘ میں چھپ گئے۔

انڈین پوسٹل سروس جوائن کرنے کے بعد میرے ساتھ لکھنؤ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے اپنی قابلیت پر شک ہونے لگا۔ میں جب سرکل آفس لکھنؤ میں پروبیشنر تھا، اس وقت شمس الرحمن فاروقی صاحب ڈائریکٹر تھے۔ ایک روز میں نے ان کے تاثرات جاننے کے لیے اپنے افسانے پیش کیے۔ فاروقی صاحب چونکہ جدید تحریک کے بنیاد گزاروں میں سے تھے اس لیے بیانیہ و اظہاریہ افسانے پسند نہیں کرتے تھے، جس کا مجھے علم نہیں تھا، انھوں نے دو تین روز کے بعد میرے افسانے لوٹاتے ہوئے کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہیں کیا مگر ان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ انھیں میرے افسانے پسند نہیں آئے تھے۔ میرے اصرار پر انھوں نے صرف اتنا کہا۔ ’’ہاں ٹھیک ہیں۔ ان میں سے ایک افسانے ’جاگو‘ کا آخری پیراگراف غیر ضروری لگتا ہے۔‘‘ میں نے ان کی سرد روی کا غلط مطلب نکالا اور سوچا شاید میرے افسانے معیاری نہیں ہیں اس لیے انھوں نے کھل کر اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ اس بارے میں میں نے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ انھوں نے ناک بھوں چڑھائی تھی جو میری غلطی تھی کیونکہ انھوں نے کسی ردِ عمل کا اظہار کیا ہی نہیں تھا۔ اس مبالغہ آمیزی کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور افسانے لکھنے کا جو مجھے چاؤ تھا وہ دھیرے دھیرے کم ہو گیا۔ تاہم ایک دو افسانے کانپور رگ سنگ اور گنگ و جمن میں شائع ہوئے۔ پروبیشن کے بعد میری پہلی پوسٹنگ سرینگر ہوئی اور پھر ایک سال ہی میں آرمی پوسٹل سروس میں ڈیپوٹیشن پر چلا گیا جہاں افسانہ لکھنا اور اپنے خیالوں کا آزادانہ طور پر اظہار کرنا مشکل تھا۔ البتہ فوجی میگزینوں جیسے سینک سماچار اور اے پی ایس میل

ملاپ میں دو تین غیر متنازع افسانے شائع ہوئے۔ اس تناظر میں مجھے اپنی افسانہ نگاری پر شدت سے غور و خوض کرنا پڑا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے افسانے رقم نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ میرے اکثر و بیشتر افسانے موجودہ نظام کو بے پردہ کرنے اور معاشرے میں ہو رہی دھاندلیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانہ نگاری میں کوئی مستقبل تو تھا نہیں، پھر اتنی اچھی نوکری سے کھیلنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ اس طرح ۱۹۷۸ء کے بعد میرے قلم کی سیاہی یکسر سوکھ گئی۔

ابھی پانچ چھ سال ہی بیت گئے تھے کہ فوج میں میری پوسٹنگ شیلانگ ہوئی۔ وہاں التہاب زائدہ کا آپریشن ہوا اور ایک دو مہینے بستر پر پڑا رہا۔ چنانچہ مجھے سرمایہ کاری اور انکم ٹیکس میں بہت دلچسپی تھی اور سٹاک ایکسچینج پر بھی کافی فعال رہتا تھا، میں نے اس زمانے میں ایک کتاب ’سیونگس، انوسٹ منٹ اینڈ انکم ٹیکس فار سیلریڈ ایمپلائیز‘ (Savings Investment & Income Tax for Salaried Employees) قلم بند کی مگر پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے یہ کتاب بھی ضائع ہوگئی۔

غالباً سن ۱۹۸۴ء تھا، مجھے اپنی زندگی میں کچھ خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے تناؤ کا سبب ادب ہے جو مجھے سوچ و فکر کے لیے ہمیشہ اُکسا رہا ہے۔ اسی ذہنی انتشار کی زد میں آ کر میں نے ادب کے ساتھ سارے رشتے منقطع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سارے مسودہ جات، شائع شدہ افسانے اور میگزین جو میرے لیے اب بوجھ بنتے جا رہے تھے، نذرِ آتش کر لیے۔ اس کے بارے میں اب کبھی سوچتا ہوں تو بہت پچھتاتا ہوں۔ غصہ اور عجلت پسندی تو خیر ورثے میں ملی ہے۔

☆☆☆

جہد زیست

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ۱۹۷۱ء میں مجھے جموں و کشمیر ہینڈی کرافٹس (سیلز اینڈ ایکسپورٹس) کارپوریشن کی اکائی کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں پہلی نوکری ملی۔ اس کارپوریشن میں میرے پتا جی بھی ملازم تھے۔ میں تعلیم کے دوران مینیجنگ ڈائریکٹر کے بچوں کو پڑھاتا تھا جس کا ثمر یہ نکلا کہ مجھے جلدی ہی نوکری مل گئی۔ غیر محفوظ مستقبل آدمی سے کیا کچھ نہیں کرواتا ہے۔ پتا جی سبکدوش ہونے والے تھے اور کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر مفتی محمد مقبول ان سے بہت خوش تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں فرض شناس اور دیانت دار تھے۔ پتا جی کی تنخواہ بالکل قلیل تھی، کل ملا کر یہی کوئی دو ڈھائی سو کے قریب، میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ بیوی بہت سال پہلے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ کر بھگوان کو پیاری ہو چکی تھی۔ ایک بیوہ بہن تھی جو اپنی بہن کے پاس رہ کر والدین کی خدمت میں جٹی تھی مگر وقت کی نزاکت کو سمجھ کر ہماری نگہبانی کرنے کے لیے حاضر ہوگئی۔

مقبول صاحب آئی اے ایس افسر تھے جو ان کو ریاستی سرکار کی سفارش پر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر تحفتاً ملا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ اس سے پہلے دہلی میں ریذیڈنٹ کمشنر کے آفس میں کام کرتے تھے۔ ایک روز پتا جی سے کہنے لگے کہ کشمیر آنے کے سبب ان کے بچوں کی تعلیم پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے کیونکہ دہلی میں کشمیر کے مقابلے میں تعلیم کا اسٹینڈرڈ بہت اچھا تھا۔ پھر استدعا کی کہ ان کے لیے ایک اچھے استاد کا بندوبست کرلیں۔ باتوں باتوں میں پتا جی نے میرا نام تجویز کیا مگر پتا جی کو اس بات کا بھروسہ نہ تھا کہ میں یہ کام کرنے کے لیے راضی ہو جاؤں گا۔ ان دنوں میں خود یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا۔ پتا جی نے ایک آسان راہ نکالی۔ دو چار روز کے بعد عید آنے والی تھی۔ اس روز قریب گیارہ بجے پتا جی مجھ سے کہنے لگے کہ وہ اپنے افسر اعلیٰ کے گھر عید کی مبارک دینے کے لیے جا رہے

ہیں اور ان کی دِلی خواہش ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں۔ میرا موڈ اچھا تھا، یکا یک تیار ہو گیا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ مفتی صاحب نے ہمیں لنچ کرنے کی دعوت دی۔ اسی اثنا میں ان کی بڑی بیٹی کو معلوم ہوا کہ میں ایم ایس سی (بوٹنی) کا طالب علم ہوں تو اس نے اپنی پریکٹکل نوٹ بک میں ایک ڈائیاگرام (تصویر) بنانے کی درخواست کی جو میں نے چند ہی منٹوں میں بنا کر دے دی۔ میری بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ کر اسے اپنی ساری تصویریں پھیکی لگیں، اس لیے مجھ سے ساری تصویریں از سر نو بنانے کی التماس کی۔ میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کی نوٹ بک اپنے پاس رکھ لی اور دو دن کے بعد واپس لانے کا وعدہ کر لیا۔ دو روز کے بعد میں وہاں پہنچا۔ مفتی صاحب نے بڑی عزت سے بٹھایا، ان کی نیک اور نرم مزاج اہلیہ نے چائے اور کچھ ناشتہ سامنے رکھا اور باتوں باتوں میں مفتی صاحب نے مجھ سے بچوں کو پڑھانے کی درخواست کی۔ اپنے پتا جی کے ایکس ٹینشن اور گھر کی خستہ حالت کو دیکھ کر میں انکار نہیں کر سکا۔ تنخواہ وغیرہ کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ گھر جا کر پتا جی نے جب یہ بات سنی تو بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تنخواہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مفتی صاحب کے مجھ پر بہت سارے احسان ہیں۔ سال بھر میں با قاعدگی کے ساتھ چار بچوں کو پڑھاتا رہا اور کوئی تنخواہ نہیں مانگی۔ البتہ اس گھر میں مجھے بہت عزت ملی، مفتی صاحب اور ان کی اہلیہ بالکل اپنے بیٹے کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔

دوسرے سال مفتی صاحب نے کارپوریشن میں مینجروں اور اسسٹنٹ مینجروں کی کچھ اسامیوں کی بھرتی کا اعلان کر دیا اور میرے پتا جی کو ہدایت دی کہ میری درخواست بھجوا دیں۔ پتا جی نے جواب دیا کہ شاید مجھے اس کام میں دلچسپی نہیں ہوگی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ درخواست دینے میں کیا حرج ہے، بعد میں فیصلہ کرتے رہو۔ والد کے اصرار پر میں نے درخواست لکھ کر ان کے ذریعے دستی بھیج دی۔ پہلے تحریری امتحان ہوا اور پھر بالمشافہ زبانی امتحان۔ تحریری امتحان میں مجھے میرٹ لسٹ میں تیسرا مقام حاصل ہوا۔ مجھ سے پہلے دو اور امیدوار تھے، عبدالصمد اور کارپوریشن کے سیکرٹری کی دختر مس مدن۔ انٹرویو بورڈ میں مفتی صاحب کے علاوہ دو اور آدمی تھے جن میں ایک جے کے انڈسٹریز کے مینجنگ ڈائریکٹر، مسٹر تامبے (آئی اے ایس) تھے، پہلے کبھی محکمہ جنگلات سے وابستہ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے نباتات کے حوالے سے کئی سوالات پوچھ لیے۔ ''معتدل خطے کی نباتی زندگی بیان کرو (Describe the vegetation of temperate region.)‘‘۔ میں نے جواباً عرض کی کہ منطقۂ معتدلہ کی نباتی زندگی وروئیدگی کو بیان کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہوگا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ ’’ایگزاٹیک پودے (Exotic Plants) کیا ہوتے ہیں؟‘‘ میں نے فی الفور جواب دیا کہ وہ بدیسی نباتات جو اپنی دھرتی کی بجائے کسی دوسری جگہ پر منتقل کر دیے جائیں اور وہاں پر بخوبی نشو ونما پائیں انھیں ایگزاٹیک پودے کہتے ہیں۔ اس کے بعد پوچھنے لگے۔ ’’چنار کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے، کیا یہ ایگزاٹیک پیڑ ہے؟‘‘ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے گول گول جواب دیا۔ ’’یس یس، پلاٹنس اورینٹیلس (Platinus orientalis)۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پیڑ بنیادی طور پر چین میں پایا جاتا ہے، کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ اسے مشرق وسطیٰ سے کشمیر لایا گیا تھا جب کہ کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کشمیر ہی کی پیداوار ہے۔‘‘ مفتی صاحب جو خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہے تھے میرے استقلال کو دیکھ کر تامبے صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ’’یو کین آسک ہم سم مور کویسچنز (آپ اسے کچھ اور سوالات پوچھ سکتے ہیں)‘‘۔ انٹرویو ختم ہوا اور میں خوش ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ لیکن جب تقرری ہوئی تو فائنل میرٹ لسٹ کے مطابق مجھ سے نیچے کئی امیدواروں کو منیجر کی پوسٹ دی گئی جبکہ مجھے اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ آفر کی گئی جس کی بنیادی تنخواہ -/۱۴۰ روپے ماہوار تھی۔ ایک بار پھر وہی فرقہ وارانہ اور سفارشی جھمیلے سامنے آئے۔

پتا جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا مگر میں اس تقرری سے بالکل خوش نہ تھا۔ ایم ایس سی اور بی ایڈ دونوں کی تعلیم قریب قریب مکمل ہو چکی تھی اور کچھ ہی مہینوں میں مجھے ڈگریاں ملنے والی تھیں۔ مجھے ایسے تجارتی ادارے سے، جہاں اکثر و بیشتر ملازم ان پڑھ اور گنوار تھے، وابستہ ہونے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرا انکار سن کر پتا جی کا منہ اتر گیا مگر انھوں نے کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ فریادی بن کر صراف صاحب کے پاس پہنچ گئے کہ ان کو معلوم تھا کہ صراف صاحب کے کہے کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ صراف صاحب نے اپنے پاس بلایا سو میں چلا گیا۔ انھوں نے زندگی کی تلخ اور ترش حقیقتوں کو آئینہ بنا کر مجھے قائل کر دیا۔ کہنے لگے۔ ’’میں نے خود اپنا کیریئر دس روپے کی نوکری سے شروع کیا تھا‘‘۔ میں نے جواب دیا۔ ’’وہ زمانہ اور تھا۔ میں اس نوکری کے لائق نہیں ہوں۔ اس آرگنائزیشن میں کامرس یا بزنس منیجمنٹ والے امیدوار ہی موزوں

رہیں گے۔ میں جب تک منیجر بننے کے سٹیج پر پہنچ جاؤں گا، اس وقت تک بیسیوں ایم بی اے بازار میں دستیاب ہوں گے۔ اس لیے یہ قدم خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔'' میرا جواب سن کر صراف صاحب نے ناصح کا چولا پہن لیا۔ ''دیکھو، پتاجی سال بھر میں ریٹائر ہو رہے ہیں، کیا معلوم تب تک تمھیں دوسری جگہ نوکری ملتی بھی ہے یا نہیں۔ گھر میں کوئی اور کمانے والا نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہ نوکری کرلو اور جب کہیں اچھی نوکری مل جائے گی تو وہاں چلے جانا۔'' بات معقول تھی۔ میں فکرمند ہو گیا کیونکہ پتاجی ریٹائر ہونے والے تھے، گھر میں دو چھوٹی بہنیں اور ایک بیوہ پوپھی تھی۔ بڑی بہن کی شادی ایک ڈیڑھ برس پہلے ہو چکی تھی۔ دوسری جانب ریاست میں شدید بے روزگاری تھی۔ ایک اسامی کے لیے سیکڑوں درخواستیں دی جاتی تھیں۔ کیا معلوم نوکری ملے نہ ملے؟ سو میں نے غنیمت جان کر ایمپوریم کی نوکری قبول کر لی اور ایمپوریم کے چنڈی گڑھ برانچ میں بحیثیت اسسٹنٹ منیجر جوائن کر لیا۔ بنیادی تنخواہ ۱۴۰/- روپے ماہوار تھی اور کُل ملا کر قریباً ۲۵۰/- روپے مل جاتے تھے۔

پوپھاجی کے اصرار پر میں مان تو گیا تھا مگر ان کی سیکھ نے مجھے اس نوکری کے لیے ناکارہ بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی ایمان دار تھے اور دوسروں کو بھی ایمان داری اور راست بازی کا درس دیتے تھے۔ یہاں تک کہ پتاجی بھی ملازمت اختیار کر کے پہلے سال کی ناراستی کے بعد اسی راستے پر چل پڑے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے صراف صاحب کی ہر بات پر عمل کیا مگر ان کی اکثر باتوں نے مجھے متاثر کیا۔ کئی بار ان کی سیکھ سے روگردانی بھی کرتا رہا مگر انجام دیکھ کر واپس اسی ڈگر پر لوٹ آیا۔ ایمپوریم کا ماحول بہت ہی گندہ تھا۔ چنڈی گڑھ برانچ میں مجھے معلوم ہوا کہ دکان میں جتنی بھی اشیا برائے فروخت رکھی گئی ہیں ان سب کی قیمتیں خریداروں کو بڑھا چڑھا کر بتائی جاتی ہیں اور انھیں طرح طرح کی کہانیاں سنا کر رسید لینے سے باز رکھا جاتا ہے تاکہ بعد میں اس چیز کی اصلی قیمت فروخت کی رسید کاٹی جا سکے اور حساب میں لیا جا سکے جبکہ باقی ماندہ رقم مقررہ تناسب کے حساب سے آپس میں بانٹی جاتی ہے۔ اس کارروائی میں منیجر سے لے کر دفتر کے چپڑاسی تک سبھی پہلے سے طے شدہ تناسب کے حساب سے حصہ دار بنتے تھے۔ مجھے یہ غیر قانونی منافع خوری پسند نہیں آئی اور میں نے اس طریقہ کار کو بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ بدلے میں ملازمین مجھ سے خفا ہو گئے اور انھوں نے ترک موالات کا فیصلہ کر لیا۔ ساتھ ہی میرے خلاف سازشیں

کرنے لگے۔ اُدھر مینیجنگ ڈائریکٹر کی تمنا تھی کہ وہ ایمپوریم کے ریٹیل شوروم بیرونی ممالک میں بھی کھول دیں جس کے لیے انھوں نے کچھ تعلیم یافتہ مینیجروں کو غیر ملکی زبانیں سکھلانے کا پلان بنالیا۔ اس پلان کے تحت میرا تبادلہ سال بھر میں ہی نئی دہلی کے اشوکا ہوٹل برانچ میں کرلیا گیا۔

اشوکا ہوٹل برانچ میں بھی منافع خوری کی بدعت جاری تھی اور وہاں بھی میں نے بالائی آمدنی کمانے سے انکار کردیا۔ اس طرح -/۲۵۰ روپے کی ماہانہ آمدنی کے ساتھ بڑی مشکل سے گزارا کرتا رہا۔

بہرحال اشوکا ہوٹل میں نوکری کا اپنا ہی مزہ تھا۔ میری عمر بائیس سال تھی، ابھی دنیا دیکھی نہیں تھی اور عریاں عورتیں صرف تصویروں میں دیکھی تھیں۔ یہاں تو شوروم کے سامنے سوئمنگ پول تھا جہاں خوبصورت مرمریں دوشیزائیں سوئمنگ سوٹ پہن کر نہاتی اور ستاتی تھیں۔ ایسے نظارے پہلی بار دیکھنے کو مل رہے تھے۔ جس روز میں محض نئی پوسٹنگ کا مقام پتہ کرنے کے واسطے گیا تھا، سنگ مرمر جیسی ایک یورپی دوشیزہ سوئمنگ پول سے سیدھے اوپر چڑھ کر شوروم کے اندر داخل ہوئی۔ اس کے بدن پر بس ایک بڑا سا تولیا تھا اور بدن کی گولائیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ وہ شوکیس میں ٹنگے کرتوں کو ٹٹولنے لگی۔ پھر اپنی پسند کا ایک کرتا اٹھا کر ٹرائی روم میں چلی گئی۔ پردہ ادھورا ہی کھینچ لیا اور کرتا پہننے لگی۔ اوپر سے کرتا گلے کے نیچے اتر رہا تھا، نیچے سے تولیا کھسک رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ بالکل برہنہ ہوگئی اور میری آنکھیں یہ منظر دیکھ کر چندھیائیں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے لگا کہ ایسی خوبصورت جگہ پر پوسٹنگ مل رہی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ مینیجر سے بلا تاخیر اسی وقت چارج لے لوں۔ مگر کیا کرتا۔ رسم دنیا بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ تلخ گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بہرحال جب تک اشوکا ہوٹل میں تعینات رہا یہی امید کرتا رہا کہ کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور ملے گا مگر ایک سال نوکری کرنے کے باوجود پھر کبھی ویسی برہنگی دیکھنے کو نہیں ملی۔ البتہ ایک بار ایک سولہ سترہ سال کی امریکن دوشیزہ نے ایک ساڑی پسند کی اور ٹرائی روم میں جاکر اسے پہننے کی کوشش کی۔ پیٹی کوٹ تو بندھا نہیں تھا پھر ہندوستانی سٹائل کی ساڑی کیسے باندھ سکتی تھی۔ اس نے مدد کے لیے مجھے بلایا۔ میں پریشان ہوا۔ چپ چاپ ایک بار کمر کے اردگرد لپیٹ کر گانٹھ ماردی، پھر ساڑی کو ایک بار پھر ضابطے کے مطابق لپیٹ کر پلو کو اس کے سر پر رکھ دیا اور باقی بچے ہوئے حصے کو چنٹ ڈال دی۔ اس کے بعد ساڑی اور چنٹ کے اوپری حصے کو جانگھیے میں اُڑسنے کی کوشش کی۔ لمس سے بدن میں برقی روسی دوڑ گئی

اور دماغ میں سنسنی سی پھیل گئی تاہم جگہ اور پوزیشن کا لحاظ کر کے خود کو روکنا پڑا۔ ایک اور بار ایسا ہی تجربہ ہوا۔ تین سیاہ فام اور کسرتی ساخت کی عورتیں، جو کسی افریقی ایئر لائنز سے وابستہ تھیں، شوروم میں گھس آئیں۔ میں اکیلا ہی تھا اس لیے اٹھ کر کاونٹر پر انھیں ساڑیاں دکھانے لگا۔ ان کے میرے بیچ کا فاصلہ دو ڈھائی فُٹ کا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سامنے دہکتی ہوئی انگیٹھیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس حرارت سے سحر زدہ ہو کر میں بار بار ان کی آنکھوں کی جانب دیکھتا رہا کہ کوئی تو اشارہ کر دے مگر چونکہ وہ تین تھیں اس لیے کسی نے آگے بڑھنے کی پہل نہیں کی۔ دو تین ساڑیاں خرید کر وہ مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ گئیں۔

اشوکا ہوٹل میں مزید ایک دو واقعے پیش آئے۔ ایک روز سونیا گاندھی شوروم میں آئیں۔ میں اسے جانتا نہیں تھا، غیر ملکی عورت لگ رہی تھی۔ اس وقت بھی میں شوروم میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ کچھ ہی دیر میں اندرا گاندھی کی خادمہ، جس کو میں پہچانتا تھا، دوڑتی ہوئی چلی آئی اور مجھے باہر بلا کر کہنے لگی کہ یہ بہو جی ہیں، جو بھی سامان خریدے گی اس کے پیسے نہیں مانگنا، سامان اور بل گھر بھجوا دینا۔ میرا سر چکرا گیا، سوچنے لگا کہیں کوئی نازیبا حرکت سرزد تو نہیں ہوئی؟ جلدی سے چہرے کو سنجیدہ بنا لیا۔ اتنی دیر میں سونیا جی نے گلاسوں کے اوپر رکھنے والے پیپر ماشی کے دس ڈھکن (Coasters) چن کر میری میز پر رکھ دیے اور یہ کہہ کر چلی گئیں کہ انھیں گھر بھجوا دیں۔ ان کا رویہ اور بات کرنے کا ڈھنگ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا، بہت ہی متین اور بردبار عورت نظر آتی تھی۔ میں جب بھی ان کے بارے میں کبھی بات کرتا ہوں تو میرے منہ سے تعریفی کلمات ہی نکلتے ہیں۔

شوروم میں فلم ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی چلی آتیں تھیں۔ دلیپ کمار، دھرمیندر، شتروگن سنہا، ریحانہ سلطان وغیرہ سے ملاقات کا شرف یہیں پر حاصل ہوا۔ ایک روز فلم 'دستک' کی ہیروئن ریحانہ سلطان چلی آئیں۔ ساڑی میں ملبوس نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی بڑی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے کوئی ٹیپ ٹاپ والا بندہ تھا جس نے اپنے چیچک زدہ چہرے کو غازے سے پوتا تھا، چمک دار قمیص اور پینٹ پہنا تھا اور گلے میں رنگین مفلر باندھا تھا۔ اس روز بھی میں شوروم میں اکیلا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا رہا، پچھلگو نے مجھے 'شی شی' کر کے اشاروں سے کہا کہ اٹھو اور اس کی خاطر مدارات کرو۔ میں اٹھا اور الگ لے جا کر اسے پوچھا کہ محترمہ کون ہیں؟ یہ بات ریحانہ جی کے کانوں میں پڑ گئی۔ مڑ کر بولی۔ ''کیوں آپ

فلمیں نہیں دیکھتے؟'' میں کیا جواب دیتا، کُل دس بارہ فلمیں دیکھی تھیں۔ بولا۔ ''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں زیادہ تر انگریزی فلمیں دیکھتا ہوں۔ مجھے ہندی فلمیں دیکھنا پسند نہیں، سٹیریو ٹائپ ہوتی ہیں۔'' اندر سے سوچ رہا تھا کہیں وہ یہ نہ پوچھے کہ کون کون سی انگریزی فلمیں دیکھی ہیں تو میں کیا جواب دوں گا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ''اوہ، میں سمجھی۔ آپ میری فلم 'دستک' دیکھ لیجیے، آپ کو کوئی گلہ شکوہ نہیں رہے گا۔'' کچھ وقفے کے بعد میں نے دوبارہ پھلگو سے سوال کیا۔ ''جناب آپ کا تعارف؟'' جواب ملا۔ ''میرا نام جانی ہے۔'' میں اس کو حیرت سے تکتا رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے اور تعارف کا یہ کونسا طریقہ ہے لیکن چپ رہا۔ کچھ مہینوں کے بعد میں کرشن چندر کی کتاب 'فلمی قاعدہ' پڑھ رہا تھا جس میں لکھا تھا 'ج' سے ہوتا ہے 'جانی' اور پھر اس نے جانی کی تعریف دی تھی۔ تب جا کر مجھے اس 'جانی' کا صحیح تعارف حاصل ہوا۔

دلیپ کمار سے بھی یہیں پر ملاقات ہوئی۔ اشوکا ہوٹل میں جہاں ریسیپشن تھا اس کی سیدھ میں پہلی منزل پر ایک گیلری سی تھی جہاں سے ریسیپشن پر براہ راست نظر پڑتی تھی۔ وہاں پر انتظامیہ نے ٹیلی ویژن نصب کر رکھا تھا تاکہ مہمان اگر چاہیں تو ہندوستان پاکستان کرکٹ میچ دیکھ سکتے ہیں۔ میں بھی وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کرسی پر بیٹھا تھا کہ دلیپ کمار کی نظر مجھ پر پڑی اور نیچے سے ہی مخاطب ہوئے۔ ''بھائی سکور کیا ہوا؟'' میں نے روکھا سا جواب دیا۔ ''اوپر آ کر دیکھ لیں، میں آپ کا نوکر نہیں ہوں۔'' شاید اس نے خیالوں میں بھی ایسے جواب کی توقع نہیں کی ہوگی۔ مگر میرے اس رویے کی خاص وجہ تھی۔ کچھ روز پہلے شترگن سنہا اور ایک اور ادنیٰ سی ایکٹریس بینا نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ دلیپ صاحب خفا ہو کر نہ جانے کیا کچھ کہیں گے۔ مگر وہ مسکرا دیے اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''بھئی، میں نے تو اپنی پوری زندگی آپ لوگوں کو انٹرٹین (Entertain) کرنے میں صرف کی ہے، سوچا تھا کہ اتنا تھوڑا سا حق تو بنتا ہے۔ خیر معافی کا خواستگار ہوں!'' ان کا جواب سن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا اور مجھے اپنی حماقت پر بہت ندامت ہوئی۔ اس روز سے میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں۔

دہلی میں کشمیر ایمپوریم کا ایک نیا شوروم بابا کھڑگ سنگھ مارگ پر کھولا گیا جس کی تزئین آرکیٹیکٹ و انٹیریر ڈیکوریٹر، راجیو سیٹھی نے کی۔ راجیو اپنے کام میں ماہر تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس کا نیٹ ورک بہت اچھا تھا۔ سنجے گاندھی اور جموں و کشمیر کے گورنر ایل کے جھا کو قریب سے جانتا تھا اور شاید اس اثر د

رسوخ کو استعمال بھی کرتا تھا۔ اندرا گاندھی کے زمانے میں اس نے غیر وابستہ ممالک کے اجتماع (NAM) کے لیے ایئر پورٹ کی تزئین کی تھی۔ اس کے چہرے مہرے سے اس کا ادھوراپن صاف جھلکتا تھا۔ راجیو سے میری دوستی ہوگئی۔ اس کے ساتھ میں ایک روز سروجنی ابراہیم کے گھر چلا گیا۔ وہ اپنے باغیچے میں بید کی کرسی پر بیٹھی تھی، اس نے اپنا تعارف پیش کیا۔ اتنی دیر میں پوسٹ مین نے اس کی ڈاک میز پر رکھ دی۔ ایک خط پر لکھا تھا 'مسٹر ابو ابراہیم، کارٹونسٹ'۔ میں چونک گیا کیونکہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ مسز ابو ابراہیم ہے۔ چنانچہ میں خود کارٹون بنایا کرتا تھا اور ابو ابراہیم کا مداح تھا، اس لیے سروجنی سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے اپنا پورا تعارف نہیں دیا۔ یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ ابو ابراہیم صاحب کی بیوی ہیں۔'' وہ میری بات سن کر غصہ ہوگئی، بولی۔ ''میں سروجنی ہوں، ایک سوشولوجسٹ ہوں اور یہی میری پہچان ہے، میرا وجود ابو ابراہیم کے رہین منت نہیں ہے۔'' میں شرمندہ ہو کر خاموش ہوگیا کیونکہ میں نے عورت کی خود اعتمادی کا یہ روپ پہلی بار دیکھ لیا۔

ہسپانوی زبان سیکھنے کے لیے میں ہر روز بھارتیہ ودیا بھون جاتا تھا اور بڑے لگن سے زبان سیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ پہلے سیمسٹر میں مجھے اول پوزیشن حاصل ہوئی جبکہ انڈین فارین سروس کے دو طالب علم میرے بعد دوسرے اور تیسرے نمبر پر تھے۔ نتیجہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ان سے تعارف تو تھا ہی، میں نے موقع غنیمت جان کر ان سے انڈین سول سروسز کے بارے میں جانکاری حاصل کرلی۔ بہرکیف ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ اور ہی ہے۔ انھی دنوں پرگتی میدان میں ایشیا۷۲ کا انعقاد ہوا جس میں کشمیر ایمپوریم کا سٹال بھی تھا۔ میں اور میرا رفیق کار نثار حسین وہاں جانے لگے گو ہماری ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہاں میرا پہلا عشق جنون کی حد تک پروان چڑھا جو آخرش ناکام رہا۔ اس کے بارے میں آگے تفصیل سے لکھوں گا۔ یہاں اتنا لکھنا کافی ہے کہ عشق کی پرورش کوئی کھیل نہیں ہے۔ زرنیست عشق ٹیں ٹیں۔ اس کے لیے زرتوفیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس عشق کے چکّر میں مجھے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنا پڑا۔ تنخواہ اتنی کم تھی کہ اس میں کمرے کا کرایہ، رہنا سہنا، کھانا پینا بھی پورا نہیں ہو پاتا تھا۔ ایمپوریم میں ملازموں کی تنخواہیں کم وقلیل ہوتی تھیں مگر بالائی آمدنی کی گنجائش بہت رہتی تھی جو برانچ پر منحصر ہوتی تھی۔ اس لیے ملازم اپنی پوسٹنگ کے لیے متعلقہ افسروں کی مٹھیاں گرم کرتے تھے۔ میں غلط ذرائع سے آمدنی کمانے کے حق میں

نہیں تھا۔ اس قلیل آمدنی میں چنڈی گڑھ اور دہلی میں کیسے گزر بسر ہوئی وہ میں ہی جانتا ہوں۔ مگر حالات نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ والد کی مسلسل خاموشی نے مجھے دہلی کے سرکاری سکول میں پی جی ٹی کی نوکری کرنے سے روک لیا، انجام کار میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر موجودہ ادارے ہی میں کام کرنا ہے تو بہتر ہے کہ دوسرے ملازموں کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ اتفاق سے عشق کا بھوت بھی سر پر سوار ہوگیا۔ اس لیے میں نے بھی دوسرے سیلز سٹاف کی طرح نہ صرف شوروم کا مال اونچے داموں پر بیچنا شروع کیا بلکہ فارین کرنسی کو بلیک مارکیٹ میں ایکسچینج کرنے لگا۔ دو ایک بار مجھے اس حوالے سے مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ ایک گاہک کو اٹھارہ سو کا قالین تین ہزار چھ سو میں بیچ دیا۔ جب میں نے ان کے حکم کے مطابق قالین ان کے گھر بھجوادیا تو اس کے ساتھ بل نہیں بھیجا۔ اس نے ٹیلی فون پر بل مانگا۔ میں نے کہا کہ بل چاہیے تو اس میں مزید دس فیصد ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ اس نے غصے میں جواب دیا۔ ’’تمھیں نہیں معلوم تم کس سے بات کر رہے ہو؟ میں ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو میں ہندوستانی سفارت خانے میں ٹریڈ (تجارت) سے وابستہ ہوں۔ ہاتھوں سے بنائے ہوئے قالینوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔‘‘ میرے تو پسینے چھوٹ گئے مگر ہمت سے کام لے کر گویا ہوا۔ ’’سر میں نیا نیا اپائنٹ ہوا ہوں۔ ہیڈ آفس سے پتا کر کے ابھی آپ کو بل بھیج دوں گا۔‘‘ انجام کار میں نے بل بنا کر بھیج دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پرتھوی راج روڈ پر واقع ہمارے بڑے شوروم میں چلا گیا اور وہاں ویسا ہی قالین نظر آیا۔ میری خوش قسمتی یہ رہی کہ انھوں نے اس کی قیمت چار ہزار بتادی جو چار سو روپے زیادہ تھی۔ اس نے سوال اٹھایا کہ میں نے تو اشوکا ہوٹل میں تین ہزار چھ سو کا ہی خرید لیا تو یہاں اتنا مہنگا کیوں ہے۔ وہاں کا سیلز مین تو گھاگ تھا، جواب دیا۔ ’’سر، ایکسپورٹ کی خاطر ہم نے اشوکا ہوٹل میں قیمتیں کم رکھی ہیں۔‘‘ کچھ دیر بعد مجھے پرتھوی راج برانچ سے ٹیلیفون آیا۔ ’’بدکی صاحب!.....آپ بھی... یہ کام کرنے لگے ہیں کیا.....؟‘‘ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا اس نے روداد سنائی۔ بہر حال یہ معاملہ زیادہ دیر نہ چل پایا کیونکہ میرا ذہنی سکون درہم برہم ہو رہا تھا۔

دوسرا قصہ سینی گال کے ایک گاہک ابوبکر کیبکی کا ہے۔ اس نے میرے شوروم میں چیتے کی ایک لمبی کھال دیکھ لی جو دوسری پوستین سے بنی ہوئی اشیا کے ساتھ ایک سمور فروش (Furrier) نے ایمپوریم

میں برائے نمائش رکھی تھی۔ ان چیزوں کی بکری پر ایمپوریم کو کمیشن ملتا تھا۔ جہاں تک اس کھال کا تعلق تھا اس کی بکری پر سرکار نے روک لگائی تھی۔ سمور فروش کا اپنا سیلز مین تھا جو میری سختی کے سبب ناراض ہو کر لمبی چھٹی پر چلا گیا تھا۔ شوروم میں ایک لہراتی ہوئی کالی زلفوں والی، گیہواں رنگ کی امریکن لڑکی داخل ہوئی۔ اس نے آتے ہی مجھے کچھ پمفلٹ تھما دیے۔ وہ بال یوگیشور مہاراج کی مرید تھی۔ میں نے جونہی پمفلٹوں پر سوامی جی کے فوٹو دیکھ لیے تو اسے مخاطب ہوا۔ ’’مجھے بھگوان اور ان ڈھونگی سادھو سنتوں پر کوئی وشواس نہیں ہے۔ انھیں رکھ لیجیے، مجھے یہ سب چیزیں دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔‘‘ وہ حیرت سے بولنے لگی۔ ’’اوہ نو، آپ نے تو ہمارے سوامی جی مہاراج کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ ان سے ایک بار ملیں گے تو بھگوان پر خود ہی وشواس کریں گے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے اسے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ انھیں لے کر کبھی آجائیے۔‘‘ وہ مجھے اپنی خوبصورت کالی متوالی آنکھوں سے گھورنے لگی اور پھر گویا ہوئی۔ ’’ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ اتنے بڑے مہاتما ہیں۔ یہاں کیوں کر آئیں گے۔ آپ کو ہی ان کے پاس جانا پڑے گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’چلیے اگر وہ نہیں آسکتے ہیں تو ایسا کرتے ہیں کہ وہ آدھا راستہ طے کرلیں اور میں آدھا راستہ طے کرلوں گا۔ کسی ہوٹل میں ملیں گے۔ مگر میری شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ کوئی چیلا ویلا نہیں ہونا چاہیے۔ ہوٹل میں صرف وہ اور میں ہوں گے۔ ویسے بھی مجھے خوشنما لڑکے پسند ہیں۔‘‘ وہ میرا مطلب سمجھ گئی اور اشتعال واستعجاب کے ملے جلے جذبات سے مجھے دوبارہ گھورنے لگی۔ میں نے یہ شرطیں اس لیے رکھی تھیں کیونکہ اگر میں اس کے پاس جاتا تو نفسیاتی طور پر پہلے ہی اپنے آپ کو کمتر مان لیتا اور اس کی برتری تسلیم کرتا۔ میں اس کو کسی بھی صورت میں خود سے بڑا اور ذی عزت نہیں سمجھنا چاہتا تھا کیونکہ جہاں برابری نہیں رہتی وہاں ٹکر بھی یکساں نہیں رہتی۔ دوسری شرط اس لیے لگائی تھی کہ چیلے چپاٹے ایسے سادھو سنتوں کے اردگرد حلقہ سا بنا دیتے ہیں اور ایک ہوّا سی کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ سامنے والا اگر کچھ کہنا بھی چاہے تو کہہ نہ پائے۔ میری شرطیں وہ کہاں منظور کرلیتی البتہ اس مکالمے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مجھے شام کو اشوکا کے بار میں مدعو کرلیا۔ اس کے بعد وہ شوروم میں اپنے لیے سامان چننے میں مصروف ہوگئی۔ شومئ قسمت کہ تھوڑی ہی دیر میں سینی گال کا ایک لمبا چوڑا، کالا بھجنگ حبشی ابو بکر کبکی سفید اغبادہ گاؤن (چوغہ) پہنے ہوئے شو روم میں داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اس نے ریک کے اوپر رکھی ہوئی چیتے کی کھال کی طرف نظر ڈالی اور اس

کی قیمت پوچھ لی۔ وہ ٹائیگر کی کھال شوروم میں تو تھی مگر بیچ نہیں سکتے تھے۔ میں نے احتراز کے طور پر اس کی قیمت دس ہزار کے بدلے چودہ ہزار بتادی تاکہ وہ انکار کردے۔ مگر اس نے تیرہ فٹ لمبی چیتے کی کھال نیچے فرش پر بچھوائی اور اس پر بیٹھ کر سامنے کھڑی امریکی لڑکی کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچوائیں۔ لڑکی تو تیز طرّار تھی ہی، سمجھ گئی کہ آدمی پیسے والا ہے، اس نے سفید اغبادہ کی جم کر تعریف کی۔ حبشی نے اس کو بھی ایسا چوغا گھر پہنچتے ہی بھیجنے کا وعدہ کیا۔ مختصر یہ کہ لڑکی اس کے دام میں پھنس گئی اور میرا پتا مکمل طور پر کٹ گیا۔ ویسے بھی کہاں میں، ڈھائی سو ماہانہ تنخواہ دار ملازم، اور کہاں وہ کروڑوں کا مالک....! خیر اس نے کھال اور دیگر سامان کی قیمت ڈالروں میں ادا کرلی جس میں وہ سامان بھی تھا جس کا انتخاب اس امریکی لڑکی نے اپنے لیے کیا تھا۔ ڈالر دیکھ کر میں یہ بھی بھول گیا کہ شام کے وعدے کے بارے میں اس لڑکی سے دوبارہ پوچھ لوں۔ حبشی نے مجھے بتایا کہ سینی گال کے سفارتی عملے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اسے امنیت (Diplomatic Immunity) حاصل ہے اور اس کا سامان کوئی چیک نہیں کرسکتا تاہم مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ ہوائی اڈے پر پکڑا نہ جائے۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میں دیر رات تک اس کے دہلی سے روانہ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ سودا خوب منافع بخش رہا، قریباً بارہ ہزار روپے کمالیے اور میں خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ چند روز بعد اکاونٹنٹ حساب لکھنے کے لیے آیا، اس کو پانچ سو روپے دے دیے۔ بات ہر جگہ پھیل گئی کہ بدکی نے بہت بڑا ہاتھ مارا ہے۔ سنتے ہی سمور فروش کا سیلز مین دوڑا چلا آیا اور بڑی حجت کی کہ میں نے اس کا ممنوعہ مال کیسے بیچ دیا مگر جونہی میں نے تین ہزار روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے تو اس کے منہ پر تالا لگ گیا۔ تعجب کی بات یہ ہوئی کہ تین چار مہینے بعد وہی سینی گالی گاہک دوبارہ دہلی چلا آیا مگر تب تک برانچ سے میری تبدیلی ہوچکی تھی گو میں ابھی دہلی ہی میں اقامت پذیر تھا۔ اس نے دو اور چھوٹی چھوٹی کھالیں خریدلیں لیکن چونکہ سیلز سٹاف نے کھالوں کی قیمت پہلے زیادہ بتائی اور بعد میں کم کردی، اسے ان کی ایمانداری پر شک ہوا اور ناراض ہوکر چلا گیا۔ اتفاق سے دوسرے روز میں رخصت لینے کے لیے اشوکا ہوٹل برانچ چلا گیا تو خبر ملی کہ کیبکی شہر میں ہے اور مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے ملنے کی خاطر میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ کیبکی میرے لیے پیرس سے ایک خوبصورت سوٹ بطور تحفہ خرید کر لایا تھا اور مجھے دینے کا خواہاں تھا۔ سوٹ لے کر میں نے اظہار تشکر کرلیا۔ گھر جا کر

دیکھا جیسے ناپ لے کر بنایا گیا تھا۔ بعد میں آئی اے ایس انٹرویو میں یہ سوٹ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ عجیب سی بات یہ ہوئی کہ وہ سارا کمایا ہوا روپیہ محبوبِ اوّل کے وار پھیر میں نچھاور ہوا۔

دہلی میں یہ میری پہلی پوسٹنگ تھی۔ اس سے پہلے جب میں ایم ایس سی کے دوران بوٹینکل ٹور پر اوٹاکمنڈ (تمِل ناڑو) گیا تھا تو یہاں چار پانچ دن ٹھہرا تھا۔ یہاں میرے ماما جی شری شمبھوناتھ نہرو رہتے تھے جو کسی سرکاری سکول کے پرنسپل تھے مگر ٹور سے پہلے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی اور بیوی دونوں سے اتنے اکتا چکے تھے کہ خلوت اور مجرد زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ رشتے داروں سے کوئی لین دین نہیں تھا۔ بس وہ تھے، ان کی وہسکی تھی اور ان کی گرل فرینڈ تھی جو کسی اور سکول میں کام کرتی تھی۔

میرے آنے سے پہلے بھی ان کو میرے خاندان سے واسطہ پڑا تھا۔ بات یوں تھی کہ میری ماں کے مرنے کے بعد ان کی لاولد بیوی میری سب سے چھوٹی بہن کو، جو ابھی دو سال کی بھی نہیں تھی، لے پالک بنا کر دہلی لے گئی تھی مگر ماما جی کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ انھوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری بہن واپس چلی جائے اور انت میں ایسا ہی ہوا۔ انہی دنوں صراف صاحب دہلی میں ممبر پارلیمنٹ بن کر آئے تھے اور جن پتھ کے پاس سرکاری بنگلے میں رہتے تھے۔ ماما جی نے ڈرامائی انداز میں میری بہن کو ان کے یہاں چھوڑ دیا اور پھر کبھی واپس نہیں لے گئے۔ نتیجے میں صراف صاحب اس کو اپنے ساتھ سرینگر لے گئے اور وہاں میرے والد کے حوالے کر دیا۔ اس کا ایک برا نتیجہ یہ نکلا کہ میری بہن دوبارہ کشمیری ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پائی۔ اس تلخ واقعہ کے باوجود میں نے اوٹی سے واپسی پر دہلی میں رکنے کا ارادہ کر لیا تھا، ماما جی کو سٹیشن پر آنے کے لیے اطلاع بھی دی تھی مگر وہ نہیں آئے۔ ہڑبڑی میں میں گاڑی سے اتر گیا اور رات کے تقریباً نو بجے میں تنہا دہلی سٹیشن پر ان کا انتظار کرنے لگا۔ اُدھر گاڑی روانہ ہوگئی۔ مرتا کیا نہ کرتا، ہمت جٹا کر میں نے آئی اے آر آئی، پوسا کے لیے ایک تانگہ یہ سوچ کر کرائے پر لیا کہ ٹیکسی والے کا کیا بھروسہ کہاں لے جائے کم سے کم تانگے سے کود تو سکتا ہوں۔ اجنبی شہر، شیطان کی آنت کی طرح لمبا راستہ، اس پر رات کا سناٹا، کہیں کوئی دکان بھی کھلی نہ تھی، سب کچھ ویراں ویراں سا نظر آ رہا تھا۔ پورے سفر کے دوران دل دھک کر رہا تھا۔ کرتا کیوں نہیں، پہلی بار جو کشمیر سے باہر نکلا تھا اور وہ بھی بالکل اکیلے۔ راستے میں دکانوں کے سائن بورڈ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ پتہ چلے کہ کون سی جگہ ہے۔ جونہی ایک

بورڈ پر پوسا روڈ لکھا ہوا دیکھا تو کچھ تسلی ہوئی لیکن آگے جا کر تانگہ انسٹی ٹیوٹ کے جنگل نما کیمپس میں داخل ہو گیا تو دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہو گئیں۔ آخر کار تانگے والے نے مجھے منزل مقصود تک پہنچا دیا اور میں نے ماما جی کے گھر پر دستک دی۔ نہا دھو کر کھانا کھایا اور کچھ دیر ماما اور مامی سے باتیں کرتا رہا اور پھر نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ چند روز خوشی سے بیت گئے۔ دریں اثنا میں نے خط لکھ کر پتا جی سے کچھ روپے مانگ لیے۔ انھوں نے مجھے منیجر ایمپوریم، کناٹ پلیس دہلی سے رجوع کرنے کو کہا جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے ماما جی سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بھی بہت ناراض ہو گئے۔ انھیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا بہانہ مل گیا۔ جو کچھ بھی من میں تھا سب اگل دیا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا مگر زبان گنگ تھی۔ چپ چاپ اندر کمرے میں سونے چلا گیا۔ دوسرے روز جب وہ دفتر چلے گئے تو میں کنسیشن فارم لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ یہ فارم پٹھانکوٹ سے تصدیق کر کے لانا چاہیے تھا۔ میں ریزرویشن دفتر کے اندر چلا گیا، سامنے کرسی پر بیٹھی ایک عورت نظر آئی، اس کے پاس جا کر اپنا دکھڑا رویا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں کالج ٹور سے واپس آیا تھا، یہاں دہلی میں ایک قریبی رشتے دار سے ملنے کے لیے اترا مگر ان کے گھر جا کر معلوم ہوا وہ یہاں پر نہیں ہیں، اس لیے یہ سوچ کر واپس سٹیشن چلا آیا کہ کنسیشن فارم تو ہے، اس کو استعمال کر کے جموں چلا جاؤں گا۔ میری جیب میں صرف بیس روپے ہیں جبکہ جموں تک کا کرایا بتیس روپے ہے۔ اس لیے مجھے کسی بھی طریقے سے سٹوڈنٹ کنسیشن پر ٹکٹ دلوا دیں۔ میرے رونے بسورنے سے اس کی ممتا جاگ اٹھی، اس نے جلدی سے چائے منگوائی اور مجھے دلاسہ دے کر کہیں چلی گئی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ اسی رات کی ٹرین سے آدھے کرایے پر میرا ریزرو ٹکٹ لے کر آ گئی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایک کشمیری کہاوت کا مطلب سمجھ میں آیا۔ ”آسہِ تہ جنگلہِ کس ہاپتس سآت، آسہِ نہ تہ گھرِ کس بآڑس سآت تہ آسہ نہ۔“ (اگر ستارے اچھے ہوں تو جنگل کا ریچھ کام آ جاتا ہے، اچھے نہ ہوں تو اپنی شریک حیات بھی منہ موڑ لیتی ہے)۔ میں نے نم آنکھوں سے اس فرشتہ صفت عورت کا شکریہ ادا کیا اور پھر دوڑتا ہوا پہلے صراف صاحب کی بیٹی، جو ان دنوں موری گیٹ میں رہتی تھی، سے رخصت لینے کے لیے چلا گیا۔ اس کو اپنی بپتا نہیں سنائی صرف اتنا کہا کہ میں آج جموں جا رہا ہوں۔ وہ سن کر حیران ہوئی۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے تحفتاً دس روپے دے دیے۔ اس طرح میرے پاس اب چودہ روپے رہ گئے۔

بس میں پوسا پہنچا، اپنا سامان پیک کر لیا اور ماما جی کے گھر آنے سے پہلے ہی وہاں سے اسٹیشن کے لیے چل پڑا جہاں مجھے ٹرین کے لیے چار پانچ گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ جموں سے سرینگر کی بس ٹکٹ یونیورسٹی والوں نے دے رکھی تھی۔

پوسا میں ایک ہم عمر پڑوسی سے ملاقات ہوئی جو پوسا ہوٹل مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ میں مینجمنٹ کی ٹریننگ کر رہا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کو فرسٹ ٹی ڈی سی کے انگریزی پرچے میں مجھ سے دُگنے نمبر ملے تھے۔ وہ مجھے اپنے کالج لے گیا، وہاں ایک اور کشمیر پنڈت دوست سے ملوایا۔ دونوں کلاس کی لڑکیوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے یاد آیا کہ سرینگر میں بھی وہ کالج جانے سے پہلے ویمنز کالج کے گیٹ پر حاضری دیا کرتا تھا۔ جب وہ دو بار فیل ہوا تو اس کی بھولی بھالی ماں نے مجھ سے پوچھا تھا ''میرا بیٹا پاس کیوں نہیں ہوتا؟'' میں نے جواب دیا۔ ''پاس کیسے ہوگا۔ وہ تو ویمنز کالج کے گیٹ کے پاس لڑکیاں دیکھنے میں ہر وقت مصروف رہتا ہے۔'' ماں مسکرا کر گویا ہوئی۔ ''اس کو لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔'' اس بات پر مجھ سے رہا نہ گیا، فوراً جواب دیا۔ ''آنٹی، ہمیں لڑکیاں کونسی بُری لگتی ہیں؟'' اتنے برسوں کے بعد اب یہاں بھی وہی لڑکیوں کا چکّر چل رہا تھا۔ اس کا داخلہ اس کی ماں کی التجا پر اس کے سوتیلے ماما نے کرایا تھا جو اس زمانے میں ریاست کی طرف سے دہلی میں اعلیٰ پوسٹ پر تعینات تھا۔ اس کے باوجود ماں کو یہ بھروسہ نہیں تھا کہ اس کا بیٹا کوئی ڈھنگ کی تعلیم پا رہا ہے۔ لوگ اس کو چڑھاتے تھے کہ اس کا بیٹا باورچی کی ٹریننگ کر رہا ہے۔ جب میں دہلی سے واپس سرینگر پہنچا اور اس کو خبر ہوئی کہ میں اس کے بیٹے سے ملا تھا تو لوگوں کی نظریں بچا کر وہ میرے گھر آئی اور پوچھنے لگی۔ ''دیپک بیٹے، کیا میرا بیٹا باورچی کی ٹریننگ کر رہا ہے؟'' اس کے دل میں یہ شک گھر کر گیا تھا۔ چنانچہ اسے مجھ پر کافی وشواس تھا اس لیے میں نے بیٹے کی ٹریننگ اور اس کے روشن مستقبل کے بارے میں پوری جانکاری دی۔ تب وہ اطمینان سے واپس گھر چلی گئی۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد اس لڑکے کا دوسرا سوتیلا ماما، جو بی بی سی میں کام کرتا تھا اور برطانیہ میں کسی ہوٹل کا مالک تھا، سرینگر آیا اور اس کو اپنے ساتھ لے جا کر وہاں ہوٹل میں ملازم لگا دیا۔ میں جب بھی کبھی اس بارے میں سوچتا ہوں اور اس کے سوتیلے ماما اور اپنے ماما کا تقابل کرتا ہوں تو دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قسمت کے کھیل ہی نرالے ہوتے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں جب میں چنڈی گڑھ سے ٹرانسفر ہو کر دہلی پہنچا تو ماضی کی تلخیوں کو بھول کر بطور خوش اخلاقی سیدھے ماماجی کے ہاں چلا گیا۔ سوچا کہ اب تو اس پر بوجھ نہیں ہوں۔ دو چار روز ان کے پاس رہوں گا پھر اپنے لیے رہائش ڈھونڈ کر وہاں شفٹ کروں گا۔ اگر جاؤں گا نہیں تو بعد میں کہیں وہ گلہ نہ کریں۔ متوسط طبقے کی متوسط سوچ......! مگر وہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ پھر وہی سرد مہری اور روکھا پن دیکھنے کو ملا۔ ایک بار پھر اپمان جھیلنا پڑا۔ ماماجی کو شاید یہ اندیشہ ہوا کہ میں وہاں رہنے کے لیے آیا ہوں۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایسا رویہ اختیار کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ہم دونوں ناشتہ کر رہے تھے کہ انھوں نے اس روز کا اخبار پڑھ کر اس کو کونوں کونوں ملایا اور پھر تہہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ میں نے اخبار پڑھنے کے لیے اٹھایا اور سرسری نظر ڈال کر یوں ہی واپس میز پر رکھ دیا کیونکہ مجھے اخبار پڑھنے کی عادت نہیں تھی صرف سرخیاں پڑھ لیتا تھا۔ انھوں نے پھر اخبار کو قرینے سے تہہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے پھر اخبار اٹھایا اور پہلے کی طرح ہی ورق گردانی کر کے واپس میز پر رکھ دیا۔ ماماجی نے دوبارہ خاموشی سے اسے قرینے سے رکھ دیا۔ جب میں نے تیسری بار وہی حرکت دہرانے کی کوشش کی تو انھوں نے خشمگیں آواز میں بہت کچھ کہہ دیا جو میری برداشت سے باہر تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید انھیں میرا وہاں رہنا پسند نہیں ورنہ سمجھا بھی تو سکتے تھے۔ وہ اُدھر دفتر نکلے اور میں اِدھر کمرے کی تلاش میں بچپن کے دوست شبن کول کے پاس پہنچ گیا جو اب آر کے پورم سیکٹر ۴ میں رہتا تھا۔ وہ دہلی میں ملازمت کر رہا تھا اور اپنی بہن کے پاس رہتا تھا۔ دونوں کمرہ ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکل پڑے۔ باہر بس سٹاپ پر ہم اس بارے میں گفتگو کر ہی رہے تھے کہ نزدیک ہی کھڑا ایک کشمیری پنڈت، بھوشن لال بخشی، ہم سے مخاطب ہوا۔ ''پریشان کیوں ہو رہے ہو، کمرہ مل جائے گا۔ تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ میں دفتر جا رہا تھا مگر تمھاری پریشانی دیکھ کر واپس گھر جاؤں گا۔ میرے گھر کے سامنے ایک کمرہ خالی ہے۔ دراصل میں خود وہاں رہتا تھا مگر اب فیملی آنے کی وجہ سے پاس ہی پورا سیٹ لیا ہے۔'' مجھے تو ایسا لگا جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ اتر آیا ہے۔ ہم دونوں بخشی صاحب کے ہمراہ چل دیے۔ انھوں نے میری گارنٹی دی۔ مکان مالک نے ساٹھ روپے ماہانہ کرایے پر کمرہ دینے کی منظوری دے دی۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں دوڑتا بھاگتا ماماجی کے گھر پہنچا، اپنا بوریا بستر اٹھایا اور آر کے پورم اپنے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور کھانا پکانا،

سب کچھ اسی کمرے میں ہوتا تھا البتہ واش روم مشترکہ تھا۔ مالک مکان بہت ہی اچھے تھے، میرے لیے صبح دودھ کا پیکٹ لے کر آتے تھے۔ علیک سلیک کے علاوہ ہماری آپس میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ بخشی صاحب بھی سامنے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اچھا ٹائم گزر گیا۔ میری شادی کے بعد بخشی صاحب سے میرا رشتہ بھی جڑ گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی میرا ساڑھو بن گیا۔ خیر سال بھر معاملہ یوں ہی چلتا رہا اور میں اشوکا ہوٹل، چانکیہ پوری میں واقع کشمیر ایمپوریم برانچ میں نوکری کرتا رہا۔

قریب سال بھر بعد صراف صاحب کا بھانجا، کیپٹن جواہر لال رازدان عرف موتی لال رازدان، جو فوج کی نوکری چھوڑ کر آیا تھا میرے پاس چلا آیا اور مہینے بھر کے لیے میرے ساتھ رہنے کی التماس کرلی۔ جان نہ پہچان میں تیرا مہمان والا معاملہ ہو گیا۔ اس نے صراف صاحب کا واسطہ دیا پھر انکار کیسے کرسکتا تھا۔ میں نے مکان مالک سے اجازت لے لی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں مصیبت مول لے رہا ہوں۔ رازدان کی شخصیت غیر معمولی اور دلکش تھی، لمبا تڑنگا، کشادہ چھاتی اور جاذبِ نظر وجاہت۔ فوج میں کپتان رہ چکا تھا، پینے پلانے کا شوقین تھا، شام کو اکثر بوتل اور مختلف چبینے جیسے بادام، کاجو وغیرہ لے کر گھر آجاتا۔ بدلے میں مجھے بھی رعایتاً کئی بار گوشت پکانا پڑتا تھا جو ڈھائی سو روپے کی تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔ اخراجات کافی بڑھ گئے۔ اس کی نوکری پرائیوٹ کمپنی میں لگ گئی اور کمپنی کی طرف سے موٹر سائیکل بھی مل گئی۔ ایک روز ماما جی کے ہاں یونہی تفریحاً چلے گئے کہ راستے میں مجھے موٹر سائیکل سکھانے لگا اور جب ماما جی کے یہاں سے واپسی کی تیاری تھی تو سنسان جگہ دیکھ کر اس نے کہا کہ لے جاؤ اور ایک راؤنڈ مار کر آجاؤ۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرلی، گیئر بدل دی، موٹر سائیکل تیزی سے بھاگنے لگی یہاں تک کہ پٹیل نگر چوک تک پہنچ گئی۔ چوک پر گاڑیوں کی بھیڑ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کو کیسے روک لوں۔ خیر ہمت کر کے اسی سپیڈ سے چوک پر موٹر سائیکل واپس گھما لی۔ نصیب اچھا تھا کہ ڈی ٹی سی بس سے نہیں ٹکرایا ورنہ کب کی ارتھی نکل گئی ہوتی۔ سر پر ہیلمٹ بھی نہیں تھی۔ واپس پہنچا، تب تک ایکسیلریٹر چھوڑنے کی وجہ سے خود ہی موٹر سائیکل دھیمی پڑ کر رک گئی۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

دو تین مہینوں کے بعد کیپٹن جواہر لال نے میرے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ ایک روز رات کو گھر میں شراب پی کر مدہوش ہو گئے۔ پیشاب کرنے کے واسطے مشترکہ باتھ روم کی طرف جانے

لگے کہ سامنے سے مکان مالکن باتھ روم سے نکل رہی تھی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر باتھ روم کا دروازہ ٹٹولنے لگا مگر اس کی بجائے مکان مالکن کا سینہ ٹٹول لیا۔ مکان مالکن کے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ بہت ہنگامہ ہوا۔ نتیجے میں مجھے دوسرے مہینے سے کوئی نئی جگہ ڈھونڈنے کا الٹی میٹم مل گیا۔ میں نے سیکٹر ۸ میں الموڑا، اُتراکھنڈ کی ایک فیملی کے فلیٹ میں کمرہ کرایہ پر لے لیا جبکہ اس نے مالویہ نگر میں اپنا بندوبست کرلیا۔ سامنے ہی میری ممیری بہن کی سسرال بھی تھی۔ مکان مالک گوسوامی صاحب سیدھا سادہ، نیک اور مخلص پہاڑی تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں کبھی تالا لگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرے ہی میں ٹیبل پر کھانا بناتا تھا۔ صفائی والی دن میں آکر خود ہی برتن صاف کر کے چلی جاتی تھی۔ کبھی پانی نہ ہوتا تو میں خود ہی جا کر ان کے کچن سے پانی بھر لاتا۔ کبھی دودھ ختم ہو جاتا تو آنٹی سے مانگ لیتا۔ ان کی دو کمسن بیٹیاں تھیں جو گاہے بگاہے میرے لیے انڈے اور ڈبل روٹی لا کر دیتیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس فیملی کا ہی ایک رکن ہوں۔

اتوار کے روز کبھی کبھار گوسوامی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں اس لیے بہت عزت کرتے تھے مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میری تنخواہ بہت کم ہے تو متفکر ہو گئے۔ کئی بار اس حوالے سے گفتگو بھی ہوئی اور میں نے نہ صرف اپنے اضطرار کا اظہار کیا بلکہ نوکری تبدیل کرنے کا منشا بھی ظاہر کیا۔ میری پریشانی دیکھ کر وہ مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ ایک روز بولے۔ ”دیپک جی، آپ پریشان نہ ہوں، میرے بڑے بھائی صاحب نے دنیا تیاگ دی ہے اور سنیاس لے چکے ہیں۔ بڑے بڑے افسر سوامی جی کے مرید ہیں۔ ان سے میں آپ کے بارے میں بات کرلوں گا۔ وہ کچھ نہ کچھ سبیل ضرور نکالیں گے۔“ بہت دنوں کے بعد سوامی جی آئے، شام کو بیٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی اور ایک دو مریدوں کے ساتھ رم کا سیون کرنے لگے۔ مجھے بھی آفر کی گئی مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر بات چیت ہوئی اور گوسوامی صاحب کا اشارہ پاتے ہی میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”بہت دنوں سے میں اپنے مریدوں کو امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس دلاتا رہا ہوں کیونکہ کمشنر صاحب میرے بھکتوں میں سے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچ لیا کہ کیوں نہ میں اپنی بیٹی کے نام سے ایک چھوٹا سا ایکسپورٹ ہاؤس کھول دوں جس کے لیے مجھے آپ جیسے ہونہار آدمی کی ضرورت پڑے گی۔“ مجھے اس

بات کا تو اندازہ ہو گیا کہ یہ خدا کے بندے اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر کرنے میں ماہر ہیں اور اپنی نیٹ ورک کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ان کی ایک چھوٹی بیٹی بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں سوامی جی مجھے پھنسانے کے لیے دانہ تو نہیں ڈال رہے ہیں؟ کہیں وہ اس لڑکی کے ساتھ مجھے باندھنا تو نہیں چاہتے ہیں؟ شکل وصورت تو دیکھی ہی نہیں، نہ جانے کیسی لڑکی ہو گی؟ اس لیے روکھا سا جواب دیا۔ ''سوامی جی، دراصل مجھے تجارت میں رتی بھر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو یہاں پھنس گیا ہوں۔ میں اگر نوکری کروں گا تو صرف سکول یا کالج میں اور کہیں نہیں۔'' اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی اور اس کے بعد سوامی جی سے کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی۔

اسی زمانے میں امریکا کی الینوائے یونیورسٹی کے ہسٹکون ڈیپارٹمنٹ کا ایک پروفیسر ہمارے شوروم میں داخل ہوا اور باتوں باتوں میں میرا دوست بن گیا۔ اس کی وساطت سے میں نے دہلی کا قطب مینار، دلی میوزیم اور چند اہم تاریخی مقامات دیکھ لیے۔ ہر مقام پر وہ ان کے آرکیٹکچر کی خصوصیات کے بارے میں وضاحت کرتا چلا گیا۔ دہلی میوزیم میں اس نے مجھے ہندوستانی پینٹنگ سکولوں سے متعارف کرایا۔ بہت سیدھا سادا آدمی تھا جو بڑی قناعت اور سادہ لوحی سے جینے کا عادی تھا۔ اتوار کے روز جب ہم مختلف جگہوں کا دورہ ختم کر کے فارغ ہوئے تو وہ رات بھر میرے کمرے ہی میں فرش پر دری بچھا کر سو گیا۔ چنانچہ اس روز صفائی والی نہیں آئی تھی اس لیے میں پریشان ہو گیا کہ کھانا کیسے بنائیں اور کس میں کھائیں۔ اس نے میری پریشانی کا بھی حل نکالا۔ اس نے پریشر کوکر میں دو کٹوری چاول اور ماپ کر پانی ڈال دیا اور ساتھ ہی کٹے ہوئے آلو اور پیاز مع تیل اور مصالحے ڈال دیے۔ پھر مخصوص وقت کے لیے پریشر دے دیا۔ اس کے بعد دو اخبار کے پنّے فرش پر بچھا دیے اور ان پر کھانا پروس دیا۔ ہم نے کھانا ہاتھ سے کھالیا، اس لیے بہت مزہ آ گیا۔ اس کے رویے کو دیکھ کر میں حیران ہو گیا اور سوچنے لگا کہ امریکیوں کی ترقی کا شاید یہی راز ہو گا۔ کہاں تو یہ امریکی پروفیسر اور کہاں ہندوستانی یونیورسٹی کا پروفیسر جو خود کو خداوند سے کم نہیں سمجھتا!

دہلی میں نوکری کرنے کا ایک فائدہ یہ رہا کہ مجھے مطالعہ کرنے کے لیے کافی وقت مل جاتا۔ میں برٹش لائبریری کا ممبر بن گیا اور وہاں سے کتابیں پڑھنے کے لیے گھر لے آتا۔ لائبریری میں کتابوں کا

بہت ہی اچھا ذخیرہ تھا۔ وہاں پر ایک کتابوں کا سیٹ ملا ، عنوان تھا ’انگلش فار فارین سٹوڈنٹس‘ (English for Foreign Students)۔ ان کتابوں میں بتدریج انگریزی سکھائی جاتی تھی اور گرامر کا استعمال ہر سبق کا جزو لازم تھا۔ میں نے ان سبھی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان میں دیے گئے مشقی سوالات کو حل بھی کرتا رہا۔ اس طرح میں نے اپنی انگریزی میں سدھار لانے کی کافی کوشش کی۔ اتنا ہی نہیں، عمر بھر دوسروں کی نقل کرتے کرتے میری ہینڈ رائٹنگ خراب ہوگئی تھی۔ میں نے کیلی گرافی کی کتاب اور فور لائن کاپی خرید کر اس میں روزانہ خوشخط انگریزی لکھنے کی شعوری کوشش کی اور اس طرح اپنی ہینڈ رائٹنگ بھی سدھار لی۔ برٹش لائبریری سے مختلف موضوعات پر کتابیں ملتی تھیں اور جب میری پوسٹنگ واپس سرینگر ہوئی میں برٹش لائبریری کا پوسٹل ممبر بن گیا، وہ ایک طرف کا ڈاک محصول دیتے تھے اور میں دوسری طرف کا۔ سنا ہے یہ سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک روز یو ایس آئی ایس لائبریری کی ممبر شپ لینے کے لیے چلا گیا۔ انھوں نے مجھ سے ایک کارڈ سائز فارم بھروالیا اور جب میں نے بھر کر واپس دے دیا تو کاونٹر منیجر نے مجھ سے کہا۔ ”آپ جا کر اپنے لیے کتابوں کا انتخاب کیجیے۔“ میں حیران ہوا۔ نہ کوئی جانچ پڑتال اور نہ ہی کسی کی گارنٹی۔ پوچھا۔ ”کیا آپ میرے بارے میں کسی سے جانکاری حاصل نہیں کریں گے؟“ اس نے جواب دیا، ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ہنس کر کہا ”پھر تو یہ لائبریری زیادہ دیر نہیں چل سکے گی۔“ اس کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں میں شرارت مچل گئی، پھر گویا ہوا۔ ”سر، جو علم کا جویا ہوتا ہے وہ کتابیں چوری نہیں کرتا۔“ واپسی پر اگر لائبریری بند ہوتی تو کتابیں لائبریری کے ڈراپ باکس میں ڈالی جاتی تھیں، نہ کوئی رسید اور نہ کوئی پوچھ گچھ۔ بہر حال کچھ سالوں کے بعد جب لائبریری کستور با گاندھی روڈ منتقل ہوئی، سارا نظام بدل گیا، اب وہ گارنٹی بھی مانگتے ہیں اور فارم کی جانچ پڑتال بھی کرتے ہیں۔

دہلی میں اقامت کے دوران میں ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ مجھے کسی تعلیمی ادارے میں کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ عرب کی سرائے کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں نام درج کروایا۔ ایک انٹرویو لیٹر اپی جے سکولز فرید آباد سے آیا۔ بورڈ کے چیئر مین نے میری سند ہی پر سوال کھڑے کیے۔ کہنے لگے۔ ”آپ نے کشمیر یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن اور بی ایڈ کیا ہے؟“ میں نے اقرار کیا۔ پھر طنزیہ لہجے میں

بولے ’’اوہ، مجھے اس یونیورسٹی کا بہت ہی تلخ تجربہ ہے۔ انھوں نے کچھ سال پہلے مجھے ایم اے کے جوابی پرچے جانچنے کے لیے بھیجے تھے۔ دو مہینے کے بعد میں نے انھیں لکھا کہ میں جوابی پرچے تبھی بھیجوں گا جب آپ پہلے مجھے اس کی رقم بذریعہ چیک بھیج دیں گے کیونکہ میں نے سنا تھا کہ وہ لوگ چیک بھیجنے میں بہت تاخیر کرتے ہیں۔ کافی دیر خط و کتابت چلتی رہی۔ نہ انھوں نے رقم بھیجی اور نہ میں نے جوابی پرچے بھیجے۔ پھر معلوم ہوا کہ انھوں نے دوسرے مضامین کی اوسط نکال کر طلبا کے نتیجوں کا اعلان کر دیا تھا۔‘‘ انٹرویو بورڈ کے دوسرے ارکان اس کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ مجھے کچھ حد تک احساس کمتری نے اپنی گرفت میں لے لیا مگر ہمت نہ ہاری اور پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ’’سر، آپ مجھے پرکھنے آئے ہیں یا میری یونیورسٹی کو۔ آپ کو جو سوالات پوچھنے ہیں مجھ سے پوچھیے، میرے ساتھ میری یونیورسٹی کو کیوں جوڑ رہے ہیں۔‘‘ اس کے بعد بورڈ کے اراکین نے علم نباتات کے حوالے سے کئی سوالات پوچھے جن کا میں نے صحیح جواب دیا۔ جب انھوں نے کہا کہ آپ جا سکتے ہیں اس وقت میں نے ان سے پوچھ لیا۔ ’’سر کیا میں جان سکتا ہوں کہ میرا انتخاب ہوا یا نہیں؟‘‘ ’’یہ ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ بوٹنی کے پندرہ امیدوار ہیں۔ دس کا ہی انٹرویو ہوا ہے۔ پانچ امیدوار ابھی باقی ہیں۔‘‘ میں نے عاجزانہ گزارش کی۔ ’’سر میں باہر انتظار کروں گا۔ میں سرینگر سے اپنے خرچے پر آیا ہوں۔ دہلی میں زیادہ سمے کے لیے رہ نہیں سکتا۔ ایک بار واپس گیا تو دوبارہ آنا مشکل ہوگا۔ ایک بے روزگار کے لیے آنے جانے کا خرچہ برداشت کرنا کہاں ممکن ہے۔‘‘ چیئرمین نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے تم انتظار کر لو۔‘‘ جب سبھی امیدواروں کا انٹرویو ہو گیا تو کچھ وقفے کے بعد میں اندر چلا گیا اور چیئرمین سے درخواست کی۔ ’’سر، اب تو آپ بتا سکتے ہیں کہ میرا اسلیکشن ہوا یا نہیں؟‘‘ اس نے پھر اپنی مجبوریوں کا بکھان کیا۔ ’’نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ ابھی تو اس پر اپوائنٹنگ اتھارٹی کا دستخط چاہیے۔ اس کے بعد ہی ہم اس کا اعلان کر سکتے ہیں۔‘‘ میں نے مودبانہ طریقے سے پھر عرض کی۔ ’’سر، انتخاب تو آپ لوگوں کو کرنا تھا سو اب تک کیا ہوگا، دستخط تو ہوتے رہیں گے۔‘‘ وہ کچھ غصے میں آ کر بولے۔ ’’نہیں نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ ضابطہ عمل بھی تو ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ اصولوں کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ پوری کارروائی مکمل کر کے ہی آپ کو اطلاع دی جائے گی۔‘‘ اب میرے ردِ عمل کی باری تھی، بولا۔ ’’سر، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی تابعِ ضابطہ پرستی ہیں اور اس سے گریز نہیں کر سکتے۔ سر، یہی بتانے کے لیے میں اتنی دیر انتظار

کرتا رہا۔ کشمیر یونیورسٹی حکام کے لیے بھی ایک دستور العمل مقرر ہے۔ وہ جانچے ہوئے جوابی پرچے ملنے کے بعد ہی پے منٹ کر سکتے ہیں، اس سے پہلے وہ آپ کو رقم نہیں بھیج سکتے تھے۔ آپ نے اپنی ہٹ دھرمی کے باعث ان کو نتیجوں کا اعلان کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ خیر اب آپ مجھے سلیکشن لیٹر بھیج بھی دیں، میں سفر خرچ کے بغیر نہیں آ پاؤں گا۔ شکریہ!'' دراصل مجھے اس وقت کشمیر ایمپوریم میں سرکاری نوکری تھی اس لیے اتنی دور فرید آباد میں پرائیوٹ نوکری کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ہفتے بھر کے بعد مجھے اپائنٹ منٹ لیٹر مل گئی اور میں نے جوابی پوسٹ کارڈ میں یہی لکھ دیا کہ میں بغیر سفر خرچ کے آپ کی آفر منظور نہیں کر سکتا۔

مئی میں دہلی ایڈمنسٹریشن سے پوسٹ گریجویٹ ٹیچر کے انٹرویو کے لیے بلاوا آ گیا۔ پرانی دہلی میں سیکریٹریٹ میں انٹرویو تھا۔ انٹرویو کے چیئرمین کوئی کشمیری پنڈت مسٹر وانچو تھے مگر میری یہ بدنصیبی کہ بُدکی، سرنیم کشمیری پنڈتوں میں عام نہیں اور ان کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ میں کشمیری ہوں۔ خیر جب نتیجے آئے میرٹ لسٹ میں میرا نام تیسرے نمبر پر تھا۔ اسی دوران مجھے خالصہ سکول آرگنائزیشن کی جانب سے خالصہ سکول، امر کالونی، لاجپت نگر میں انٹرویو کے لیے حاضر ہونے کی اطلاع ملی۔ میں سکول کے دفتر پہنچا، وہاں ایک ریش دراز قوی الجثہ سردار جی، جو شاید ہیڈ کلرک یا آفس سپرانٹنڈنٹ تھا، سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے مجھے صلاح دی کہ ''تم آج شام کو میرے گھر پر آ جاؤ اور ہم وہاں سے چیئرمین کے پاس جائیں گے۔ آپ سمجھ لو کہ آپ کی نوکری پکی ہو گئی۔'' میں اسے خواہ مخواہ ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے حامی بھر لی۔ اندر جا کر میرا انٹرویو ہوا۔ چیئرمین بھی سردار تھے، انھوں نے میری اسناد کا معائنہ کیا اور کہا کہ یہ ترتیب کچھ سمجھ میں نہیں آتی، بی ایس سی... بی ایس سی (آنرس)... ایم ایس سی (بوٹنی)... بی ایڈ.. اور پھر ادیب ماہر...؟'' میں نے جواب دیا۔ ''سر، پہلے والدین کی آنکھوں سے ڈاکٹری کے خواب دیکھے جو مذہبی کوٹا اور اقربا پرستی کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے، پھر بی ایس سی آنرز کر کے مائیکرو بائیولوجی اور بائیو کیمسٹری میں پوسٹ گریجویشن کرنا چاہا، وہاں بھی ایسی ہی اڑچنیں آئیں، ایم ایس سی کر کے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے استاد بننا چاہیے، سو بی ایڈ کر لیا۔'' انھوں نے پھر سوال پوچھ لیا۔ ''اوہ، مگر تم استاد کیوں بننا چاہتے ہو؟'' وہ شاید امید

کررہے تھے کہ میں کہہ دوں گا کہ میں قوم کی سیوا یا بچوں کی سیوا کرنا چاہتا ہوں مگر میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔ بہت ہی نرم لہجے میں جواب دیا۔ ’’سر، یہ میری دروں بین شخصیت (Introversion) کا تقاضا ہے۔‘‘ وہ مجھے ایسے گھورنے لگا جیسے ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ مجھے جونہی اس بات کا احساس ہوا تو اپنے کہے کی وضاحت کی۔ ’’سر، دراصل شخصیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک آرٹسٹک یا دروں بین اور دوسری ایتھلیٹک یا بیروں بین۔ میں پہلے زمرے میں آتا ہوں۔ اور ایسی پرسنلٹی کے لیے ٹیچنگ پروفیشن اچھا رہتا ہے۔‘‘ وہ پھر گویا ہوئے۔ ’’تمھارا مطلب ہے کہ تم آرٹسٹ ہو؟‘‘ میں نے پھر وضاحت کی۔ ’’سر، یہ ضروری نہیں کہ اگر آپ کی شخصیت انٹروورٹ یا آرٹسٹک ہو تو آپ آرٹسٹ ہوں گے۔ اس کے باوجود میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک اَمیچور آرٹسٹ ہوں اور مجھے نہ صرف ڈرائنگ و پینٹنگ میں دلچسپی ہے بلکہ اردو میں کہانیاں بھی لکھتا ہوں۔‘‘ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہنے لگے۔ ’’اوہ آئی سی۔‘‘ پھر دوسرے ارکانِ بورڈ نے بوٹنی کے حوالے سے کچھ سوالات کر لیے جن کا میں نے خاطر خواہ جواب دیا۔ آخر میں چیئرمین کہنے لگے۔ ’’تم باہر انتظار کرلو، کچھ امیدوار اور ہیں، ان کو نپٹ لیں گے پھر تمھارے ساتھ اور گفتگو ہوگی۔‘‘ میں باہر جاکر پھر اسی سردار جی کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ پوچھنے لگا۔ ’’کسی کا انتظار کر رہے ہو کیا؟‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’جی ہاں، انھوں نے ہدایت دی کہ باہر انتظار کرلو۔‘‘ جب باقی امیدواروں کا انٹرویو مکمل ہوا تو چیئرمین مجھ کو ڈھونڈتے ہوئے کمرے میں چلے آئے اور مجھے وہاں دیکھ کر دوبارہ اندر بلایا۔ پھر کچھ غیر رسمی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے امر کالونی لاجپت نگر سے چائے اور سموسے منگوائے اور مجھے بھی دعوت دی۔ پھر چیئرمین ٹھیٹ پنجابی زبان میں بول اٹھے۔ ’’بھئی تم تو بہت کم عمر کے ہو۔ اس سکول میں مخلوط تعلیم ہے۔ یہاں کی لڑکیاں تم سے بڑی ہیں۔ وہ تمھیں انگل... (آگے لکھنا مناسب نہیں)۔‘‘ میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ دوسرے ممبران اس کے بول سن کر سکتے میں آ گئے۔ ان کے چہرے دیکھ کر چیئرمین بھی چوکنا ہو گئے۔ اس لیے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور انگریزی میں بولنے لگے۔ ’’تمھیں پنجابی سمجھ آتی ہے؟‘‘ میں نے ان کی عزت بچانے کے لیے انکار کر دیا۔ انھوں نے چین کا سانس لیا اور دوبارہ گویا ہوئے۔ ’’میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر مخلوط تعلیم ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں تمھیں پڑھانے میں کوئی مشکل تو نہیں آئے گی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’سر، ابھی تک تو

میں نے صرف تھیوری پڑی ہے۔ اب اس پر عمل کروں گا۔ کامیاب ہوا تو اچھا، ناکام ہوا تو تھیوری والے غلط۔" میرے کلام میں ایہام تھا جو شاید ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے بعد وہ پوچھنے لگے۔ "تم نے کہیں اور بھی درخواست دی ہے جیسے دہلی ایڈمنسٹریشن وغیرہ؟" میں نے اعتماد سے جواب دیا۔ "سر، درخواست تو دی ہے مگر وہاں کا ابھی کچھ نہیں معلوم۔ دراصل میں تین سال پڑھا کر ایم ایڈ کرنا چاہتا ہوں اور پھر ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینا چاہتا ہوں۔ اس لیے نوکری پرائیویٹ ہو یا گورنمنٹ کی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں پہلے مل جائے گی وہاں جوائن کرلوں گا۔" وہ خوش ہوئے، بولنے لگے۔ "تو ٹھیک ہے آج شکر ہے، تم سوموار کو جوائن کرلو۔ میں خود تمھارا لیکچر سننے آجاؤں گا۔" اس نے بیل بجا کر اسی سردار جی کو بلوایا اور میرا آرڈر ٹائپ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے روک لیا۔ "سر مجھے جوائن کرنے کے لیے کم سے کم دس دن کی مہلت چاہیے، سرینگر سے سامان وغیرہ بھی تو لانا پڑے گا۔ آپ آرام سے مجھے دہلی کے ایڈریس پر اپوائنٹ منٹ آرڈر بھجوادیں۔" یہ کہہ کر میں اطمینان سے وہاں سے نکل گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے دہلی ایڈمنسٹریشن میں آرڈر ملنے کی پوری امید تھی اس لیے جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا اور دہلی ایڈمنسٹریشن کا آرڈر میرے گھر پہنچ گیا۔ خوش ہونے کے بدلے میری پریشانیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ میں نے پتا جی کو خط پر خط لکھا کہ میں موجودہ نوکری چھوڑ کر پوسٹ گریجویٹ ٹیچر کی نوکری کرنا چاہتا ہوں مگر انھوں نے پراسرار خاموشی اختیار کرلی۔ ان کو سکول ٹیچر کی نوکری سے کچھ ایلرجی سی تھی جس کا مجھے علم نہ تھا۔ ان کے ذہن میں استاد کا تصور ایک ایسے آدمی کا تھا جو بخیلی میں زندگی بسر کرتا ہے، دمڑی دمڑی جوڑتا رہتا ہے، گندہ اور مریضانہ طبیعت کا مالک ہوتا ہے اور ساری عمر ایک ہی کوٹ اور پینٹ میں گزارا کرتا ہے۔ انھوں نے نہ ہاں لکھا نہ ناں۔ ممکن ہے اگر میں نے پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (پی جی ٹی) کے بدلے خط میں جونیئر لیکچرر لکھا ہوتا تو شاید ان کا ردِ عمل مثبت ہوتا۔ اِدھر میری ایک اور مصیبت گلے پڑی تھی۔ اشوکا ہوٹل ایمپوریم میں دو ہی آدمی تھے، ایک میں اور ایک سیلز مین۔ گرمیوں کا موسم تھا، سیلز مین چھٹی لے کر سرینگر چلا گیا تھا اور ایمپوریم کا سارا مال، جس کی قیمت تقریباً تین چار لاکھ تھی، میرے حوالے کر کے گیا تھا۔ دہلی ایڈمنسٹریشن نے ایک مہینے کی مہلت دی تھی مگر استعفیٰ اتنی جلدی منظور ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ پردیس میں تھا اور پھر کوئی تجربہ بھی نہ تھا۔ خیر ہونی کو کون

ٹال سکتا ہے۔ پتا جی نے کوئی فیصلہ سنایا نہ ہی کوئی مدد کی۔ میں پردیس میں خود کو بے بس ولاچار محسوس کر رہا تھا۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ پھر اسی ماما جی کی ڈیوڑھی پر دستک دی کیونکہ وہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے تحت کسی سکول میں پرنسپل تھے۔ ان کو ساری روداد سنائی، وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر غور و فکر کر کے کہنے لگے ’’ابھی وقت ہے، میں دو دن کے بعد کشمیر جا رہا ہوں، تمھارے پتا جی سے اس بارے میں بات کرلوں گا۔‘‘ میری مامی جی نے بھی مقامی طور پر کافی دوڑ دھوپ کی۔ ایک کشمیری پنڈت بی این رینا سے، جو انڈریوز گنج میں ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے، ان کی رہائش پر ملیں۔ اتفاق سے مجھے انڈریوز گنج ایریا ہی میں الاٹ منٹ ہوگئی۔ میں خود بھی اپنا آرڈر لے کر ان سے دفتر میں ملا اور انھوں نے میری پوسٹنگ آر کے پورم سیکٹرے کے گورنمنٹ سکول میں کردی جو میرے گھر کے بالکل سامنے پڑتا تھا۔ ماما جی جب کشمیر سے لوٹ آئے تو انھوں نے بڑی سنجیدگی سے بتایا ’’تمھارے پتا جی کے ہونٹوں پر ایک بات ہے اور دل میں دوسری۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان کو مینجنگ ڈائریکٹر پر بہت اعتماد ہے کیونکہ اس نے تمھارے باپ کو تمھارا مستقبل سنوارنے کا بھروسہ دلایا ہے۔ اس لیے وہ ایمپوریم کو چھوڑ کر تمھارے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ جوائن کرنے کے حق میں نظر نہیں آتے۔‘‘ یہ سن کر میں بہت مایوس ہوگیا اور مجھے زندگی میں اپنا نصب العین پانے کا ایک سنہری موقع ہاتھ سے چھوٹتا دکھائی دیا۔ اب جب بھی کبھی اپنی بدبختی پر سوچتا ہوں تو ان سب نوجوانوں پر ترس آتا ہے جن کے والدین لاعلمی، ناخواندگی، ناسمجھی یا پھر خودغرضی کے سبب اپنے بچوں کے پَر کترتے ہیں اور ان کو اپنے حساب سے اڑان بھرنے نہیں دیتے۔ مجھے ایسا بھی شک ہوا کہ چونکہ میں پتا جی کا اکلوتا بیٹا تھا شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے ماما کی طرح دہلی کا ہو کر رہ جاؤں اور اپنی جڑوں کو فراموش کردوں حالانکہ ہم دونوں کے درمیان قطبین کا فرق تھا اور میرا اپنے ماما جی کے نقش قدم پر چلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ عام کشمیری پنڈتوں کی مانند میرے پتا جی چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بڑا افسر بنے اور سوٹ ٹائی میں گھومتا پھرے نہ کہ اپنے کپڑوں پر چاک کی گرد لگا کر بچاریوں کی طرح گھر گھر ٹیوشن کرتا پھرے۔ متوسط طبقے کے محدود خواب......!

خیر وجہ جو بھی تھی، میں قربانی کا بکرا بن کر قربان گاہ میں ذبح ہو چکا تھا۔ میرا دل حد سے زیادہ اُکتا گیا۔ اس لیے میں نے اسی روز اپنے پتا جی کو ایک طویل خط لکھا جس میں میں نے اس بات کا اعادہ

کرلیا کہ اب میں اپنے منشا کو پانہیں سکتا اس لیے منیجر کا لبادہ پہن کر ہی باقی عمر جیوں گا۔ اس طرح میں نے جھوٹ، فریب اور مکاری کی دنیا میں قدم رکھ لیا۔ میں نے دوسرے ملازمین کی طرح بالائی آمدنی کمانا شروع کیا، اشیا کی قیمتیں بڑھا چڑھا کر ان کو فروخت کرنے لگا اور چونکہ اشوکا ہوٹل میں زیادہ تر غیر ملکی خریدار آتے تھے اور فارین کرنسی میں پے منٹ کرتے تھے، اس لیے دوسرے برانچوں کی تقلید میں ڈالر، پونڈ، ین اور مارک بلیک مارکیٹ میں بیچنے لگا۔ چند ہی دنوں میں میرا حلیہ بدل گیا اور میرے رہنے سہنے کا ڈھنگ بھی بدل گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب ایشیا ۷۲ میں میری ملاقات ایک مراٹھی لڑکی سے ہوئی اور میں خود کو پیگاسس پر سوار محسوس کر رہا تھا۔

۱۹۷۲ء کے اواخر میں منیجنگ ڈائریکٹر دہلی آئے اور میرے بدلے تیور دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ اس سے پہلے بھی ان کے کانوں میں میری شخصیت کی تقلیب کاری کی بھنک پڑ چکی تھی۔ ان کے پرائیویٹ سیکریٹری اور میرے ایک رفیق کار نے، جو اشوکا ہوٹل برانچ میں خود پوسٹنگ کا خواہاں تھا، انھیں اطلاع دی تھی کہ میں بہت ہی اچھا مہمان نواز ہوں اور دوستوں پر کھل کر روپیہ پیسہ لٹاتا ہوں۔ مفتی صاحب نے لوٹتے ہی میرے پتا جی کو، جو ایمپوریم میں ایکسٹینشن پر ملازمت کر رہے تھے، میری بے راہ روی کے بارے میں آگاہ کیا۔ مزید براں انھوں نے مجھے فوراً سرینگر تبادلہ کر دیا۔ سرینگر ہیڈ آفس میں مجھے اسٹیٹسٹکل اور ریویو افسر کے پوسٹ پر تعینات کیا گیا مگر تنخواہ وہی اسسٹنٹ منیجر کی مل رہی تھی۔ آمدنی کے سب سوتے سوکھ گئے۔ کچھ مہینوں تک میرے بانکپن اور خوش لباسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کوئی نئی ملازمت ڈھونڈنے کی تگ و دو دوبارہ شروع ہوئی۔ اس کے لیے اکثر صدر ڈاک خانے جانا پڑتا تھا جہاں ایک کشمیری لڑکی سے جان پہچان ہوئی اور وہ میرا کام لائن میں کھڑے رہنے کے بغیر ہی کر لیتی تھی۔ اسی زمانے میں دہلی کی ایک دوشیزہ اپنی ماں کے ساتھ سرینگر آئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آئے۔ یہ معاشقہ برسوں چلتا رہا یہاں تک کہ باہمی ارتباط آج تک برقرار ہے۔

دہلی محکمۂ تعلیم میں ملی ناکامی کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری۔ گو میرا ٹرانسفر سرینگر ہوا تھا مگر میرا نام دہلی ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں بدستور درج تھا اور وہاں کے خطوط میرے دوست نثار حسین کے ایڈریس پر آتے تھے۔ دوسرے سال پھر دہلی ایڈمنسٹریشن سے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ نثار حسین نے ٹیلی

فون پر مجھے اطلاع دی کہ دوسرے دن انٹرویو ہے۔ میں نے اسی دم کیژول چھٹی کی درخواست دفتر میں دی اور خود فلائٹ سے دہلی پہنچ گیا۔ بدقسمتی سے دو چار روز کے بعد بورڈ میٹنگ تھی جس کی ساری تیاریاں میرے ذمہ تھیں۔ مینیجنگ ڈائریکٹر کو جب معلوم ہوا وہ بہت ناراض ہوئے۔ میرے ماتحتوں نے مجھے بچانے کے لیے بہت کوشش کی اور کہا کہ میری صحت اچانک بگڑ گئی تھی، اس لیے فوری طور ہسپتال جانا پڑا۔ اصلیت کہاں چھپنے والی تھی، مقبول صاحب کو پتہ چلا کہ میں دہلی پہنچ گیا ہوں۔ تیسرے دن میں انٹرویو دے کر واپس سرینگر آ گیا۔ بورڈ میٹنگ کا کام ہونے کے بعد مفتی صاحب نے اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بہت لعن طعن کی جو میری برداشت سے باہر تھا۔ اشوکا ہوٹل برانچ کی بکری کم ہونے کا ٹھیکرا میرے سر پر پھوڑ دیا حالانکہ وہاں ہمارے شوروم کے سامنے ہوٹل کی اعلیٰ منیجمنٹ نے تجدیدکاری شروع کی تھی اور دھول وغیرہ کی وجہ سے سیاح اس طرف قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ الزام بھی لگایا کہ میں دفتر دیر سے آتا ہوں اور دفتر کا کام ڈھنگ سے نہیں کرتا۔ بقول ان کے مجھ سے بہتر تو دفتر کے پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ کا میٹرک پاس کلرک ہے جس نے وہ کام، جو مجھ سے مکمل نہیں ہوا، فٹافٹ کر کے سامنے رکھ دیا حالانکہ میرے حساب سے وہ کام فالتو تھا اور اس کے اعداد و شمار اکٹھا کرنا فضول تھا۔ جو کچھ اس کلرک نے کیا تھا سب جھوٹ اور فریب تھا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ میں جس عہدے پر کام کرتا تھا اس کی کارکردگی میں میں نے بہت ساری تبدیلیاں لائی تھیں جن کی تعریف نہ صرف بورڈ ممبران نے کی تھی بلکہ چیئرمین نے بذاتِ خود ایک میٹنگ کے دوران اس کا اظہار کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے بنائے ہوئے ہسٹوگرافک چارٹس بورڈ روم کی زینت بن چکے تھے۔ مفتی صاحب کی باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان کے کمرے سے باہر نکلا، وہیں پر اپنا استعفیٰ قلم بند کیا اور ان کے پرائیویٹ سیکریٹری کے ہاتھ سونپ دیا۔ استعفیٰ کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔

> ”محترم مینیجنگ ڈائریکٹر صاحب، آداب!
>
> مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ کی آرگنائزیشن میں ایک کم پڑھا لکھا کلرک ایک تعلیم یافتہ منیجر سے زیادہ اچھا کام کرتا ہے، نتیجتاً میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر میری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے میں اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں

تاکہ کسی اور کم پڑھے لکھے نوجوان کے لیے نوکری دستیاب ہو جائے۔ امید ہے کہ میرا استعفیٰ فوراً منظور ہوگا۔ آرگنائزیشن کو میرا الوداع.....!

نیاز مند
دیپک کمار بُدکی

مایوس ہو کر باہر نکلا تو صدر دروازے کے پاس پتاجی کو کھڑا پایا۔ ماجرا سن کر وہ بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے ''ایک تو مقبول صاحب نے تمھیں نوکری دی پھر اس کے ساتھ ایسا برتاؤ....! میرے بارے میں بھی کچھ سوچا ہوتا۔ ہاتھ تو بٹا نہیں سکتے، مگر ہاتھ کاٹنے سے دریغ نہیں کرتے۔ جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی جب تجھے یہ معلوم ہے کہ میں ایکسٹینشن پر چل رہا ہوں۔'' ان کی بات مجھے زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی۔ ویسے بھی کب سے بھرا بیٹھا تھا، اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ ''کس کو نوکری دی۔ نوکری تو میری اپنی محنت کا ثمر ہے۔ اس کے چار بچوں کو سال بھر پڑھایا ہے۔ اگر آج بھی بل بھیج دوں بیس ہزار سے کم رقم نہیں بنے گی۔ اور پھر آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میری اس محنت کی وجہ سے آپ کو بھی ایکسٹینشن مل رہا ہے۔'' میں ذہنی تلاطم میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا اور پھر وہاں سے رخصت ہوا۔ دو روز کے بعد میں دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ دہلی میں تو انٹرویو دے رکھا تھا، اس لیے کبھی بھی آرڈر ملنے کی امید تھی۔ گزشتہ برس تو یہی نوکری ملی تھی جو میں جوائن نہیں کر سکا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس برس میرا نام میرٹ لسٹ میں نہ ہو۔ دوسری طرف جو فوجی کپتان میرے پاس دہلی میں چند مہینے رہ کر گیا تھا اس کے ساتھ میری سرینگر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں انجینئر بن چکا تھا۔ اس نے مجھے بھروسہ دلایا تھا کہ دہلی میں جب تک میری کہیں نوکری لگ جاتی ہے، وہ عارضی طور پر مجھے کسی کنٹریکٹر کے پاس مَسٹر رول بنانے کے لیے نوکر رکھوا لے گا۔ دہلی پہنچا، اس کو ٹیلی فون کیا، تین چار دن کے بعد کیپٹن جواہر لال رازدان کو فرصت ملی، نثار کے دفتر میں مجھے ملنے کے لیے چلا آیا اور لگا لمبا چوڑا لیکچر دینے کہ مجھے اس طرح نوکری چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ جاتے ہوئے اتنا کہہ گیا کہ کبھی شام کو گھر چلے آنا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی دوسرے روز اس کے گھر ٹیگور گارڈن شام آٹھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا جس میں رات بسر کرنے کے لیے ایک نائٹ سوٹ رکھا تھا۔ وہاں وہ کسی کنٹریکٹر سے محوِ گفتگو تھا اور شراب کا دور

چل رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ کنٹریکٹر کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اس کی بیوی بچوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ جب دیر ہوگئی تو میں اٹھ کر جانے لگا۔ اس نے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی، صرف رسماً کہا کہ کھانا تو کھا کر جاؤ جس کے جواب میں میں نے کہا کہ کھانا تو میں کھا کر ہی نکلا تھا۔ وہاں سے نکلا، رات کے دس بج چکے تھے، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ جیب میں صرف ایک ڈیڑھ روپیہ تھا۔ اس وقت بس ملنا بھی مشکل تھی۔ پھر اچانک یاد آیا کہ پاس ہی موتی نگر میں میرے دوست کی ایک بہن رہتی ہے جس سے میں کئی بار مل چکا تھا۔ سیدھے وہاں پہنچ گیا۔ اس کے پتا جی ممبئی میں نوکری کرتے تھے۔ ماں اور بچے سبھی سو رہے تھے۔ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی، اس کی ماں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ پوچھا اتنی دیر سے کیسے آنا ہوا، سب خیریت تو ہے؟ میں نے کچھ قابل یقین بہانہ بنا لیا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھے بغیر اپنی بیٹی کو ایک پیالہ چاول بنانے کا حکم دیا اور فریج میں رکھا کالا موٹھ (وارِ مُٹھ) گرم کرنے کو کہا۔ کھانا کھاتے ہی میں لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رات بھر اپنی تقدیر اور انسانی رویے کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک طرف وہ کپتان تھا، جس کے باعث میں نے تین مہینے کشٹ جھیلا تھا اور گھر سے بے گھر ہوا تھا اور دوسری طرف یہ دوست کی بہن تھی جس کی فیملی کو میں زیادہ قریب سے جانتا بھی نہ تھا مگر اس نے مجھے اپنے بھائی سے بھی زیادہ گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس دن سے میں نے اس کو اپنی بہن بنا لیا اور اپنی بہنوں سے زیادہ عزت کرنے لگا۔ آشا کی ایک بڑی بہن اور ایک چھوٹا بھائی بھی تھا، سبھی مجھے اپنے بھائی سمان ہی مانتے تھے۔ جب آشا کی شادی کا پروپوزل آیا، لڑکا بوٹنی پوسٹ گریجویشن کا طالب علم تھا اور مجھ سے ایک سال جونیئر تھا۔ اس کا نام سن کر ہی میں نے حامی بھر لی اور ان کی شادی ہوگئی۔ دونوں بڑی خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آشا کا شوہر ڈاکٹر کیرتی کول حال ہی میں جیواجی یونیورسٹی، گوالیار سے بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہوگئے۔ بدقسمتی سے اس گھرانے پر مصیبتوں کے کئی پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ پہلے والدین اور پھر بڑی بہن اور اس کے خاوند کی ایک کے بعد ایک رحلت ہوگئی۔ چھوٹا بھائی انل کینیڈا میں سیٹل ہو چکا ہے۔

کچھ دن تو یوں ہی یہاں وہاں گزر گئے، پھر اپنے دوست شبن کول کے پاس جنک پوری میں رہنے لگا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں رہتا تھا۔ بہن نے اس کو برساتی والا کمرہ دیا تھا۔ شبن کول عرف کتال میرا

پڑوسی تھا، اس کی اور میری دوستی بچپن سے چلی آ رہی تھی۔ آٹھویں تک ہم دونوں ساتھ میں سکول جاتے تھے، سکول کے بعد کھیلتے کودتے تھے، کبھی کبھار سینما دیکھنے بھی چلے جاتے نیز خرافات میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے۔ وہ یتیم تھا مگر اس کو سوتیلے بھائی نے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ تاہم غربت کے سبب اس کے پاس حسب ضرورت گرم کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ جیسے تیسے تھرڈ ڈویژن میں بی اے پاس کیا اور دہلی اپنی بہن کے پاس چلا گیا۔ بہت ہی ذہین تھا مگر حالات نے اس کو اِدعا پسند بنایا تھا۔ کسی ضرورت مند کو دیکھتا جھٹ سے اپنی قمیص اتار کر دینے کو تیار ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دوستوں کا دائرہ بہت بڑا تھا اور وہ بھی اس کی وقتِ ضرورت مدد کرنے کو تیار ہو جاتے۔ شبن دن بھر نوکری کرتا تھا، کچھ روپیہ بہن کو تھما دیتا تھا اور اس کے گھر کا سارا کام کر کے اسے خوش رکھتا تھا۔ میری بدنصیبی نے یہاں بھی مجھے نہیں چھوڑا۔ انہی دنوں اس کے بہنوئی کے آفس میں سٹرائک ہوئی جو کافی دیر تک چلتی رہی۔ نتیجے میں اس کی تنخواہ بند ہو گئی۔ گھر میں میاں بیوی تھے، چار بچے تھے، بوڑھے والد تھے اور اس پر شبن اور اب میرا بھی خرچہ۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ ہنس راج ماڈل سکول، پنجابی باغ میں بوٹنی کے استاد کے لیے انٹرویو ہو رہے ہیں۔ میں پہنچ تو گیا مگر میں نے پہلے سے درخواست نہیں دے رکھی تھی۔ ان دنوں 'واک ان' انٹرویو کا چلن نہیں تھا۔ میں پرنسپل سے ملا اور انھیں درخواست کی کہ اگر آپ کو حاضر ہوئے امیدواروں میں سے کوئی پسند نہ آیا تو برائے مہربانی میرا بھی انٹرویو لے لیں۔ یہ بات اس نے منظور کر لی اور آخر میں میرا ہی انتخاب ہوا۔ ایک ہفتے کے بعد وہاں والدین کا دن منایا گیا جس میں سبھی بچوں کے والدین آ گئے۔ چنانچہ میں نویں جماعت کا فارم ٹیچر تھا اس لیے میں نے بھی بچوں کے والدین سے خیالات کا تبادلہ کیا گو مجھے ابھی ان کا پورا تعارف نہیں تھا۔ میرے سامنے ایک معمر بزنس مین فلم آرادھنا کا راجیش کھنہ والا کرتا زیب تن کیے اپنی سادہ اور متین بیٹی کے ہمراہ کھڑا ہو گیا اور اپنے بیٹے کا رپورٹ کارڈ میری میز پر پھینکتے ہوئے یوں مخاطب ہوا۔ ''آپ لوگ بچوں کی طرف دھیان نہیں دیتے ہیں۔ دیکھیے کتنے کم نمبر لایا ہے میرا بیٹا۔ اس لڑکے کا کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔ آپ لوگ اس کا ہر روز کام چیک نہیں کرتے ہیں کیا؟ میں نے تو اس کو گھر میں کبھی سکول کا کام کرتے دیکھا ہی نہیں۔ سکول سے چھٹی ہو جاتی ہے اور گھر پہنچتے ہی کار لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے اور پھر رات کو دیر سے لوٹتا ہے۔'' مجھے تعجب ہوا کہ ایک نویں جماعت کا نابالغ لڑکا کار

لے کر کیسے چلا جاتا ہے۔ گھر میں کیا کوئی روک ٹوک نہیں؟ میں نے بچے کی ڈائری دیکھی۔ اساتذہ نے تقریباً ہر دن اس کی شکایت ڈائری میں درج کی تھی اور اس پر وہ گھر سے والد کے دستخط کروا کر لاتا تھا۔ میں نے ڈائری سامنے رکھ کر اس کی نشاندہی کی اور پھر ان کو بتایا۔ ''دیکھیے آپ تو اس پر روزانہ دستخط کرتے ہیں۔'' جواب میں وہ کہنے لگا۔ ''اجی یہ میرے دستخط تھوڑے ہی ہیں۔ یہ لڑکا تو اپنے دادا سے دستخط کرواتا ہے کیونکہ میں تو دن بھر دُکان پر ہوتا ہوں۔ بہت دیر سے لوٹتا ہوں تب تک یہ مہاشے سو چکے ہوتے ہیں۔'' میں نے بڑے احترام کے ساتھ جواب دیا۔ ''سر آپ بچے کے پتا جی ہیں۔ آپ کو اس کی ڈائری دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ایک نویں کلاس کے بچے کو بلا روک ٹوک کار کی چابیاں ملتی ہیں۔ لگتا ہے گھر میں اس کو ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کو سکول میں ڈال کر آپ اس کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ اس سے بہتر تھا کہ اس کو اپنی دکان پر کام میں لگاتے، کم سے کم تجارت کا ہنر تو سیکھ لیتا۔'' ہماری گفتگو سکول کے پرنسپل نے سن لی جو کچھ ہی دور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بلا کر تنبیہ کی۔ ''دیکھو تم نے جو کہا وہ صحیح تھا مگر اس طرح سکول نہیں چل سکتا۔ شاید تمھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ سکول ایسے ہی کرم فرماؤں کے سرمائے پر منحصر ہے۔ اس طالب علم کے پتا جی نے گزشتہ برس ہمیں سب سے زیادہ ڈونیشن دیا ہے۔ اگر تم اس کو ایسے مشورے دو گے تو ہمارا سکول بند ہو جائے گا۔'' اس دن میری آنکھیں کھل گئی کہ کچھ لوگ سکول کو اپنی زندگی کی عبادت گاہ سمجھتے ہیں اور کچھ تفریح گاہ۔

اس سکول میں ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ پوسٹ ٹی جی ٹی کا تھا اس لیے ہندی میڈیم کے ذریعے پڑھانا پڑتا تھا، جو میرے لیے بہت مشکل تھا۔ پندرہ دن یوں ہی گزر گئے۔ میں بچوں کو جو کچھ بھی پڑھاتا تھا، ساتھ میں آڈیو ویژول ایڈس اور مائکرسکوپ بھی استعمال کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم بولا۔ ''سر آپ پڑھاتے تو بہت اچھا ہیں مگر آپ کو ہندی نہیں آتی، اس لیے ہمیں ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آتا۔ ہمیں تو پہلے والے سر نوٹس لکھایا کرتے تھے جنھیں ہم امتحان کے لیے یاد کیا کرتے تھے۔'' میں اس کی دُبدھا سمجھ گیا۔ کلاس ختم ہوتے ہی میں نے مائکروسکوپ لیبارٹری میں جمع کیا، سیدھے پرنسپل کے کمرے میں چلا گیا اور سارا واقعہ سنا کر کہہ دیا۔ ''سر، مجھے لگتا ہے میں بچوں کو دھوکا دے رہا ہوں۔ اس لیے کل سے سکول نہیں آؤں گا۔'' پندرہ دن کی تنخواہ چھوڑ کر میں وہاں سے مستعفی ہو گیا۔

دہلی ایڈمنسٹریشن میں نوکری لگنے کی امیدیں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں۔ اس لیے میں اور شبن کول عرب کی سرائے میں واقع ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں نام درج کرانے کے لیے دوبارہ پہنچ گئے۔ وہاں میرے ایک جانکار آدمی ایمپلائمنٹ افسر تھے مگر پرابلم یہ تھی کہ میں نے اس کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا اس لیے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ کر بدلہ نہ لے۔ شبن نے دلاسہ دیا کہ تم اس بارے میں چنتا مت کرو۔ لنچ ٹائم کے قریب ایمپلائمنٹ افسر اپنی کار میں بیٹھ کر شاید گھر چلے گئے اور ہم کلرک کے پاس رجسٹریشن کرنے اندر گئے۔ شبن کول نے اسے کہا کہ ہم کشمیری پنڈت ہیں اور کاک صاحب ہمارے رشتے دار ہیں۔ اس بیچارے نے فٹافٹ ہمارا سارا کام کر دیا اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ میں شبن سے خفا ہوا کہ تم نے ایسا کیوں کہا، کہیں وہ اپنے افسر سے پوچھے گا تو مصیبت آجائے گی۔ وہ بولا ”یار تو بھی کتنا پاگل ہے، اس کلرک کی اتنی ہمت کہاں کہ وہ اپنے باس سے پوچھے گا کہ کیا آپ نے کسی رشتے دار کو رجسٹریشن کے لیے بھیجا تھا؟ اس کے تو من کے لڈّو پھوٹ رہے ہوں گے کہ اس نے کاک صاحب کا کام کیا اور وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ دہلی میں مجھے دو اور آدمیوں سے جانکاری تھی۔ ایک صنعت کار تھا، دہلی میں پینٹ کی دُکان تھی اور دہرہ دون میں انڈسٹری جبکہ دوسرے کے ساتھ اشوکا ہوٹل میں جان پہچان ہوئی تھی، فلم ڈسٹری بیوٹر تھا، موتی سینما چاندی چوک کے اندر اس کا دفتر تھا۔ دونوں سے ملا اور کچھ کام دینے کی خواہش ظاہر کی۔ میری تو ایسی حالت تھی کہ موتی سینما میں ٹکٹ بیچنے کا کام کرنے کو بھی تیار تھا۔ دونوں نے خوش اسلوبی سے پہلوتہی کی۔

میں نثار کے ساتھ اس کے لودھی روڈ والے میس میں شفٹ ہو گیا۔ رہتا نثار کے کمرے میں تھا مگر کھانے پینے کے لیے دو سو روپے ماہوار دینے پڑتے تھے۔ آٹھ سو روپے گرل فرینڈ سے اُدھار لیے اور کچھ مہینے کام چلاتا رہا۔ دن بھر نوکری کی تلاش میں چلا جاتا مگر زیادہ تر وقت نثار کے دفتر میں کاٹ لیتا۔ نثار حسین کے ساتھ میری دوستی کشمیر ایمپوریم میں ہوئی گو ہم دونوں ایک ہی سال میں پوسٹ گریجویشن کرتے تھے، وہ معاشیات میں اور میں نباتات میں۔ ہماری دوستی اتنی گہری ہوگئی کہ کوئی کہہ نہیں پاتا تھا کہ یہ لوگ سگے بھائی نہیں ہیں۔ دہلی میں گھومنا، پرگتی میدان میں ایشیا ۷۲ کے دوران عشق لڑانا، ایک ہی ڈیزائن کے کپڑے پہننا اور تفریح کے لیے ایک ساتھ چلے جانا۔ نثار حسین شیعہ مسلک کے ہیں مگر لبرل ہیں۔ ایک بار

اس نے عیدِ غدیر پر مجھے اپنے گھر دعوت پر بلایا تھا۔ ان کے والد صاحب نے، جو پولیس میں ڈپٹی ایس پی ہوا کرتے تھے، ان مضحکہ خیز اور بے بنیاد باتوں کے بارے میں جانکاری دی جن کی رو سے شیعہ لوگوں پر یہ تہمت لگائی جاتی تھی کہ اس روز وہ کھانے میں انسانی خون ملاتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر ایمپوریم کے اسٹیبلشمنٹ افسر کو بھی، جو ان کا ہمسایہ تھا، دعوت پر بلایا تھا۔ ہم دونوں میں آپس میں نہیں بنتی تھی، اس لیے وہ ثالثی کرنا چاہتے تھے۔ دراصل تین سال سے میری انکریمنٹ بند کر دی گئی تھی اور مجھے طرح طرح سے پریشان کیا جا رہا تھا۔ اسی حوالے سے میں نے ایک روز بہانا بنا کر اس کو ایک منزل اونچے برآمدے سے نیچے پھینکنے کی کوشش کی تھی جس کا خوف اس پر چھا گیا تھا۔ خیر دونوں میں مفاہمت ہو گئی اور اس نے چند دنوں ہی میں نہ صرف میری انکریمنٹ پاس کروائی بلکہ مجھے دو مہینے کے لیے نہ جانے کون سی چھٹی دلوا دی کہ میں دہلی جا کر آئی اے ایس کی تیاری کر پایا۔ دعوت سے لوٹتے وقت وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور مجھے ایک ٹرپل ایکس رم کی بوتل اور ڈن ہل سگریٹ کی ڈبیا تحفتاً دے دی۔ گھر پہنچ کر میں نے دونوں پتا جی کے سرہانے رکھ دیے۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگے اور پوچھنے لگے، ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ میرا 'ہفتہ' ہے جو مجھے اسی بندے نے دیا ہے جس کے بارے میں آپ کہتے تھے کہ سبھی لوگ اس کو خراج دیتے ہیں اس لیے مجھے بھی دینا چاہیے۔'' پھر ان کو ساری روداد سنائی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے مگر کچھ نہ بولے۔

جن دنوں میں دہلی میں نوکری کی تلاش کر رہا تھا نثار کا ایک رشتہ دار سرینگر سے آ ٹپکا کیونکہ وہ عمرہ کرنے اور کربلا کی زیارت کرنے جا رہا تھا۔ نثار کو اسی روز کسی کام سے کشمیر جانا پڑا اس لیے میرا نام 'غلام محمد' رکھ کر مجھے اس کا استقبال کرنے اور میس میں اپنے ساتھ ٹھہرانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ تو بہت ہی کٹر قسم کا روایتی شیعہ تھا، ہندوؤں سے اپنی بیزاری کھلے عام ظاہر کرتا تھا، اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں کوئی راز افشا نہ ہو۔ اپنی ساری کتابیں الماری میں بند کر دیں اور ان پر تالا لگا دیا۔ پہلے روز اس کو ریلوے سٹیشن سے میس تک لے آیا، وہاں سب سے تعارف کرایا، پھر معذرت چاہی کہ میرا ماما بیمار ہے (جو سچ بھی تھا) اس لیے میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا مگر روزانہ حاضری دیا کروں گا۔ دو روز کے بعد جب اس کو رخصت ہونا تھا تو میں نے اس کے ساتھ ہی لنچ کر لیا۔ لنچ کرنے کے بعد وہ کہنے لگے کہ حمد

باجماعت کریں یا اکیلے اکیلے۔ حمد سے تو میں واقف تھا مگر یہ اکیلے اور باجماعت کا فرق معلوم نہیں تھا۔ ٹرین کا وقت ہو رہا تھا، وہ کچھ اونچا سنتا تھا، میں نے اشاروں سے دکھایا کہ آپ چلو میں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں۔ وہ حمد پڑھ کر اٹھ گیا اور میں تھوڑی دیر بعد فارغ ہوا۔ اس کو نئی دہلی سٹیشن پر ٹرین پر چڑھا دیا اور اترتے وقت توبہ کر لی۔ مگر عجیب بات تو تب ہوئی جب وہ عمرہ کر کے لوٹ آئے تو میرے لیے تبرک لانا نہیں بھولے تھے۔ اس تبرک کو اس نے کشمیر میں نثار کے گھر والوں کو یہ تاکید کر کے سونپ دیا کہ غلام محمد تک ضرور پہنچائیں۔

انٹرویو کا نتیجہ نکلا۔ اس سال میرا نام دسویں نمبر پر تھا اور اسامیاں بس تین چار ہی تھیں، اس لیے نوکری نہیں ملی۔ کسی خیر خواہ نے بتایا کہ این ڈی ایم سی کے اپنے الگ سکول ہوتے ہیں اور وہاں ایجوکیشنل افسر ایک کشمیری پنڈت ہے جس کا نام ٹی این بٹ ہے۔ میں ان کے پاس قریب چار بجے پہنچ گیا اور اپنا تعارف پیش کیا۔ میرے ساتھ نثار بھی تھا۔ انھوں نے سامنے کرسی پر بٹھایا اور اپنے کام میں مشغول ہوئے۔ اس طرح ایک گھنٹہ بیت گیا پھر انھوں نے مجھ سے کہا۔ ''ہاں، بتاو، تم کیوں آئے ہو؟'' میں نے اپنی پوری رام کہانی سنائی۔ تب تک ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور سکول بند ہو چکے تھے۔ اس لیے اس نے مجھے ایک ہفتے بعد یعنی دوسرے سوم وار کو آنے کو کہا۔ میں دوسرے اور پھر تیسرے سوم وار بھی حاضر ہوا مگر ہر بار اسی عمل سے گزرنا پڑتا تھا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا۔ ایک دو بار اس نے ٹیلیفون پر کچھ لوگوں سے اس بارے میں بات چیت بھی کر لی مگر بے فائدہ۔ چوتھے سوم وار کو جب شام کے وقت وہ کچھ لوگوں کو ٹیلی فون ملا رہے تھے، کسی این ڈی ایم سی سکول کا فزکس ٹیچر تقریباً ساڑھے پانچ بجے حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ این ڈی ایم سی کے سیکریٹری نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کل اس کی بیٹی کا بیالوجی کا امتحان ہے، اس لیے کسی ٹیچر کو بھیج کر اس کا ریویژن کرا دیں۔ بھٹ صاحب کی حالت غیر ہو گئی، فوراً چاروں طرف فون ملانے لگ گئے۔ کوئی استاد مل ہی نہیں رہا تھا۔ اسی درمیان میں نے عرض کی۔ ''سر اگر آپ ٹھیک سمجھیں تو میں چلا جاؤں گا۔ میں نے بوٹنی میں ایم ایس سی کی ڈگری لی ہے۔'' فزکس ٹیچر نے تائید کی ''ہاں سر ان کو ہی بھیج دیں۔ کچھ تو کام بن جائے گا۔'' بھٹ صاحب کا پارہ چڑھ گیا اور فزکس ٹیچر سے مخاطب ہوئے۔ ''تم وقت کی نزاکت کو نہیں سمجھتے۔ میری نوکری کا کچھ سوچا بھی ہے؟'' فزکس ٹیچر نے جواباً کہا۔ ''سر سم تھنگ از بیٹر

دین نتھنگ۔ میں اس کو لے جا کر سنبھال لوں گا'' اور پھر فزکس ٹیچر اور میں چلے گئے۔ جاتے جاتے بھٹ صاحب نے کہا کہ وہاں سے سیدھے لودھی روڈ میں میرے گھر پر رپورٹ کرنا۔

میں نے سیکریٹری صاحب کی لڑکی کو شکلوں اور خاکوں (Diagrams) کی مدد سے حیاتیات کے تقریباً سارے اہم سوالات سمجھائے۔ چونکہ مجھے تصویریں بنانے میں مہارت ہے اس لیے اس کی نوٹ بک اس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پوری کی پوری بھر گئی۔ وہ مطمئن ہوگئی اور اس کے بعد فزکس ٹیچر اور میں بھٹ صاحب کے گھر چلے گئے۔ اندر آتے ہی فزکس ٹیچر نے کہا۔'' سر دس بوائے از اے جینئس۔ اس نے تو سیکریٹری صاحب کی بٹیا کو بیالوجی ایسے سمجھائی کہ میں بھی سب کچھ سمجھ گیا۔'' بھٹ صاحب کو یہ تعریف ہضم نہیں ہوئی، کہنے لگے۔'' ارے معلوم نہیں کیا پڑھایا ہوگا۔ اب تو کل ہی پتہ چل جائے گا۔ خیر اب تم لوگ جاسکتے ہو۔'' دوسرے دن مجھے کشمیر ایمپوریم میں نوکری واپس ملنے کی اطلاع ملی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ دوڑا بھاگا سرینگر پہنچ گیا۔ ادھر ہفتے بھر کے بعد نثار نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ بھٹ صاحب تم کو بہت ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کا باس چاہتا ہے کہ تم اس کی بیٹی کو سال بھر ٹیوشن پڑھاؤ۔ کہہ رہا تھا کہ اب اس کی نوکری بھی پکی ہوجائے گی۔ مگر اب میرا کشمیر چھوڑ کر جانا ناممکن تھا۔ میں پھر سے کوئی جوکھم اٹھانے کو تیار نہ تھا اس لیے انکار کردیا۔

ایشیا ۷۲ میں ایک لڑکی رتنا مکھرجی سے تعارف ہوا تھا جس کو میں نے کچھ عرصہ پہلے شادی کے لیے ایک ایمبرائیڈری کیا ہوا کشمیری گاؤن دلوایا تھا۔ اچانک راستے میں مل گئی، اس کے پتاجی ساتھ میں تھے، میں نے اپنی پریشانی بتلادی، رتنا کے پتاجی نے ایک کشمیری پنڈت پی کے کول، جو انڈین ٹورزم میں کام کرتے تھے اور کئی پیڑھیوں سے لکھنؤ میں رہتے تھے، کا پتہ بتا دیا۔ کول صاحب نے میری نوکری کی خاطر بہت تگ و دو کی۔ مجھے تعجب اس بات کا ہو رہا تھا کہ جن کے ساتھ جانکاری تھی انھوں نے تو منہ موڑ لیا اور جو اجنبی تھے وہ حوصلہ افزائی کرتے رہے اور میرے لیے آسمان زمین ایک کرتے رہے۔ کول صاحب نے مجھے ایئر فورس سینٹرل سکول سبرتو پارک کے پرنسپل ہیری ڈینگ کے پاس بھیج دیا۔ پی این کول کا نام سنتے ہی وہ مجھ سے بہت ہی تپاک اور گرم جوشی سے ملے جس کی چھاپ آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس نے ایک مہینہ پہلے ہی سکول میں بیالوجی ٹیچر کی تقرری کی تھی تاہم اس نے مجھے یقین دلایا کہ فی الحال

وہ مجھے بحیثیت انگریزی ٹیچر کے تقرری کرے گا اور پہلی فرصت میں مجھے بیالوجی شعبے میں شفٹ کرے گا۔ نیز انھوں نے مجھے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کی ایک انگریزی پروفیسر صاحبہ کے پاس بھیج دیا تا کہ میں ان سے انگریزی پڑھانے کے بنیادی گُر سیکھ لوں۔ میں وہاں چلا گیا۔ پروفیسر صاحبہ کسی کانفرنس میں مصروف تھیں۔ انھوں نے مجھے اپنے کمرے کی چابیاں دے دیں اور کہا کہ ان کی الماری سے جو کتاب پسند آئے اسے تب تک پڑھ لوں جب تک میں فری ہو جاؤں گی۔ ساتھ ہی کینٹین کا نمبر بھی دیا اور وہاں سے چائے اور سموسے منگوانے کا حکم دیا۔ جاتے جاتے اس بات پر بھی اصرار کیا کہ چائے کا بل میں خود ادا کروں گی۔ ان کی اپنائیت اور خلوص کو دیکھ کر میں جذبات سے مغلوب ہوا۔ آنے کے بعد ان سے خوب باتیں ہوئیں۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ غیر شادی شدہ ہونا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ ان کی زندگی کا نصب العین صرف اور صرف تعلیم حاصل کرنا اور اس کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے مجھے ایک کتاب 'اے سٹرکچرل اپروچ ٹو انگلش ٹیچنگ' (A Structural Approach to English Teaching) بطور تحفہ یہ کہہ کر دی کہ اس کتاب پر عمل کرنے سے میں بہت اچھے طریقے سے انگریزی پڑھا سکوں گا۔ اُدھر ڈینگ صاحب نے انگریزی ٹیچر کی اسامی بھرنے کے لیے اخبار میں اشتہار دیا مگر افسوس میں تب تک تھک ہار کر واپس سرینگر جا چکا تھا جس کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے۔

اسی دوران میں میرے ماماجی کا دل کا دورہ پڑ گیا اور آر ایم ایل ہسپتال میں بھرتی ہو گئے۔ میں اور مامی جی ان کی تیمارداری میں جٹ گئے۔ دن بھر میں نوکری کی تلاش کرتا اور رات بھر ہسپتال میں گزارتا۔ ایک طرف کوئی آمدنی نہیں تھی اور دوسری طرف ہسپتال آنے جانے کا خرچہ۔ پھر میس میں کھانے کا خرچہ الگ۔ ممبئی سے جواہر کول اور سرینگر سے مکھن لال نہرو اور ان کی رفیقۂ حیات چلے آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ماماجی کے گھر میں رہوں۔ خود بڑے ماماجی نے بھی بستر علالت پر مجھے گھر میں رہنے کے لیے اصرار کیا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ نثار حسین سرینگر گیا ہوا تھا، جب واپس آیا تو مجھے جلد از جلد سرینگر واپس جانے کی ہدایت کی کہ وہاں دوبارہ سابقہ نوکری جوائن کرنے کو کہا گیا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ دوسرے ہی روز تھرڈ کلاس جنرل کمپارٹمنٹ میں ٹائیلٹ کے پاس لیٹ کر جموں تک کا سفر طے کر لیا اور ایک روز بعد بس میں سرینگر پہنچ گیا۔ اگلی صبح کو میں نے اپنا استعفیٰ واپس لے کر ایمپوریم میں پھر

سے بحیثیت اسسٹنٹ منیجر کے جوائن کرلیا اور سٹیٹسٹکل افسر کے طور پر دوبارہ چارج لیا۔ دراصل میری غیر حاضری میں پتا جی اور منیجنگ ڈائریکٹر کے درمیان بات ہوچکی تھی اور پتا جی نے اپنے باس کے دل کی کدورت دور کی تھی۔ انجام کار مجھے واپس نوکری مل گئی اور جلدی ہی پرموشن دے کر منیجر بنایا گیا۔ انھی دنوں ایمپوریم کی ایک انٹیریئر ڈیکوریٹر سے میرے مراسم بڑھ گئے مگر زیادہ دور تک نہیں جا پائے۔ قسمت کی ٹھکرائی ہوئی لاچار عورت تھی، عمر ڈھلنے کی وجہ سے اپنے بناو سنگھار کا خاص خیال رکھتی تھی اور تیز عطروں (Scents) کو کثرت سے استعمال کرتی تھی۔

کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم کی نوکری میں نے اپریل ۱۹۷۱ء سے جون ۱۹۷۶ء تک کرلی۔ درمیان میں جیسا کہ ظاہر ہے میں نے دوبارا استعفیٰ دے دیا مگر واپس جوائن کرنے کے لیے مجبور ہوگیا۔ انھی دنوں گلمرگ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف فارین ٹریڈ کا ایک کورس منعقد ہوا جس کے لیے منیجنگ ڈائریکٹر نے مجھے نامزد کیا۔ عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ دوسرے روز پڑوس میں رہنے والی اس لڑکی کی شادی تھی جس کو میں چاہتا تھا۔ آگ برابر کی لگی ہوئی تھی۔ خیر میں نے طے کرلیا تھا کہ کم سے کم شادی میں تحفے کے طور پر اس کے لیے رنگولی (ویوٗگ) تو بنالوں گا اور اپنے دل ٹوٹنے کا اظہار کرلوں گا۔ مگر قسمت میں لکھا کچھ اور ہی تھا۔ ایک دن پہلے ہی گلمرگ جانا پڑا۔ فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہاں پورے ہفتے رہنا پڑا۔ البتہ اس دوران میں صرف اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کورس گلمرگ ہائی لینڈ پارک ہوٹل میں چل رہا تھا جو نیڈوز کا برانچ تھا اور گلمرگ کا سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کورس میں ٹاٹا، برلا جیسے بڑے بڑے اداروں سے منیجر آئے ہوئے تھے جن کی تنخواہ غالباً تیس چالیس ہزار تھی اور ایک میں تھا جو چار سو پچاس کا تنخواہ دار تھا اور ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بحث کے دوران سبھی نے اپنی اپنی کمپنی کی سالانہ بکری (Annual turnover) کے اعداد و شمار سب کے سامنے رکھ دیے۔ کوئی سو کروڑ کہہ رہا تھا تو کوئی تین سو کروڑ۔ ایمپوریم کی ملک بھر (۱۵ر برانچز) کی کل بکری پچاس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ کیا کرتا۔ اعداد کے آگے ہر جگہ دو زیرو بڑھاتا چلا گیا یعنی جہاں ایک لاکھ تھا وہاں ایک کروڑ کردیا جس کے بغیر عزت بچانے کا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ عزت تو خیر کیا بچ جاتی، میری حالت ہی میرا بڑا اشتہار تھی۔ جس دن مجھے آرڈر ملا تھا کہ دوسرے روز گلمرگ میں رپورٹ کرنا ہے، میں پریشان ہوگیا۔ نہ اس ہوٹل کے

موافق کپڑے تھے، نہ جوتے اور نہ ہی سوٹ کیس۔ ان دنوں چمڑے کے سوٹ کیس ہوا کرتے تھے۔ میرے سوٹ کیس کا چمڑا جگہ جگہ ادھڑا ہوا تھا۔ گھر میں کسی کے پاس اور کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے اسی میں اپنا سامان بھر لیا۔ گلمرگ میں بس سے اتر کر بوجھل قدموں سے ہوٹل تک پہنچ گیا۔ ریسپشن پر نام کا اندراج کروایا اور انھوں نے ایک خدمت گار کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس نے سوٹ کیس دیکھ کر میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا، آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ کمرے کے اندر جاتے ہی خدمت گار نے پہلا مکالمہ یوں ادا کیا۔ ”سر، آپ بہت خوش نصیب ہیں۔“ میں نے استفسار کیا۔ ”بھلا کیوں؟“ خدمتگار نے جواب دیا۔ ”سر، جو کمرہ آپ کو الاٹ ہوا ہے، اس میں ڈمپل کپاڈیا رہتی تھی۔ بغل والے کمرے میں رشی کپور رہتا تھا۔ اور وہ جو سامنے والا کمرہ ہے ناں صاحب۔ وہاں پر فلم ’بوبی‘ کا وہ گیت ’ہم تم اک کمرے میں بند ہوں‘ فلمایا گیا تھا۔“ میں ہوں ہاں کرتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ میں نے وہ فلم نہیں دیکھی تھی۔ مجھے ڈمپل کپاڈیا کے بدلے اپنے پھٹے ہوئے سوٹ کیس، کپڑوں اور جوتے کی فکر ستا رہی تھی۔

جس دن واپس جانا تھا، ہم صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ ریستوران میں سامنے ایک میز پر دو تین لڑکیاں اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ فیملی میرے بغل میں ہی رہتی تھی اور میں نے کئی بار انھیں دیکھا تھا۔ دولتمند باپ خلیج کا حبشی تھا اور ماں گوری کاکیشیائی۔ بڑی بیٹی دونوں کا مکسچر تھی۔ گیہواں رنگ جو مجھے بہت پسند ہے اور لمبے لمبے بال۔ وہ ناشتہ آدھا ہی چھوڑ ہوٹل سے باہر نکل کر نیچے میدانوں میں چلی گئی۔ شاید یہ سوچ کر کہ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا آؤں گا۔ میں نے ناشتہ تو آدھا ادھورا چھوڑ دیا مگر باہر جا کر نیچے میدان میں اترنے کی جسارت نہیں کی۔ سامنے سرینگر جانے والی بس کھڑی تھی جس کا انتظام ہوٹل والوں نے کیا تھا۔ مجھے اندیشوں نے گھیر لیا۔ سوچا کہ اگر اس نے دو چار دن اور ٹھہرنے کے لیے کہا تو میں کیا کروں گا، میرے پاس تو کفن کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ اس کی نظر جونہی مجھ پر پڑی تو میرا دھیان اپنی طرف کھینچنے کے لیے مردانہ وار انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹیاں بجاتی رہی مگر میں تھا کہ خوف سے پیچھے ہی پیچھے کھسک رہا تھا یہاں تک کہ کمرے سے اپنا سوٹ کیس منگوایا اور بس میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ چند روز بعد اس نے پرتاپ چوک سرینگر میں مجھے دیکھ کر اپنا منہ حقارت سے دوسری جانب پھیر لیا۔

نوکری تو واپس جوائن کر لی مگر جذبات کی رو میں بہنے سے اب گریز کرتا رہا۔ میرے رکھ رکھاو

میں سنجیدگی اور بردباری عود کر آگئی۔ من میں ٹھان لی کہ اب مجھے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا اور اپنے لیے کوئی نئی راہ تلاش کرنا پڑے گی ورنہ یہ زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔ معلّمی کا فتور میرے ذہن سے کافور ہو گیا، بھارتیہ ودھیا بھون کے آئی ایف ایس افسروں کی رہنمائی یاد آئی اس لیے سِول سروسز کی تیاریاں شروع کر لیں۔ نیز ایک ذاتی تجربے نے مجھے تحریک دی۔ ہوا یوں کہ ہمارے اور ہمارے چار پڑوسیوں کے درمیان مشترکہ صحن تھا۔ ان سے ہمیشہ ناچاقی رہتی تھی اور چنانچہ ہماری ماں نہیں تھی، وہ ہمارے گھر کے معاملات میں دخل اندازی کرتے تھے۔ میں نے اپنے حصے کے اردگرد دیوار کھڑی کر کے اسے علیٰحدہ کر دیا۔ جب تک یہ کام ہوتا رہا ہمارے پڑوسی نگرانی کرتے رہے کہ کہیں میں اپنے حصے سے آگے تجاوز نہ کروں، مگر میرا منشا امن قائم کرنے کا تھا جھگڑے کا نہیں، یہاں تک کہ میں نے اپنے حصے کی زمین کا کچھ حاشیائی حصہ ان کے لیے چھوڑ دیا جو میرے والد کو پسند نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس چھوٹے سے صحن کو صحنِ چمن میں تبدیل کر لوں۔ کچھ مزدور لگا کر زمین سے پتھر اور کنکر نکلوائے اور پھر کچھ درخت و موسمی پیڑ لگا دیے۔ پتاجی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ زمین بنجر ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں اُگ سکتا مگر میں نے ان کے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا۔ ایک دو برس ہی میں یہ قطعہ زمین ہرا ابھرا ہو گیا اور اس میں مختلف اقسام کے پھول کھلنے لگے۔ ایک روز میں اپنی کھڑکی سے اس پھلواڑی کو نہار رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس بنجر زمین میں ہریالی ہو سکتی ہے تو میرا ذہن کمپیٹشن امتحانات کے لیے تیار کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہی وجہ تھی کہ میں نے ۱۹۷۴ء میں آئی اے ایس اور سول سروسز کا امتحان دیا جس میں پچاس فیصد نمبرات ملے مگر انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ میں میرٹ میں آنے کے بہت قریب ہو سکتا تھا، اس لیے مجھے ایک اور کوشش کرنی چاہیے۔ نتیجے میں میں نے دوسرے سال پھر سے امتحان دینے کی ٹھان لی۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ سبجیکٹس کیا لوں۔ ان دنوں آئی اے ایس اور آئی ایف ایس کے لیے آٹھ پیپر لینا پڑتے تھے جبکہ الائیڈ سروسز کے لیے چھ پیپر مطلوب تھے۔ پولیس سروسز کے لیے صرف پانچ پیپر لینا پڑتے تھے۔ ان سب میں تین سبجیکٹس مشترکہ ہوتے تھے، انگلش ایسے (Essay)، جنرل انگلش اور جنرل نالج۔ باقی اختیاری مضامین تھے۔ اختیاری مضامین کے طور پر میں نے علم نباتات، تاریخِ ہندوستان اور

اردو زبان کا انتخاب کیا جبکہ آئی اے ایس کے لیے دو ہائر سبجیکٹس 'قدیم ہندوستانی تاریخ' اور 'عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ' کا انتخاب کرلیا۔ پولیس کے لیے تو صرف دو ہی اختیاری مضامین لینے تھے، اس لیے علم نباتات اور تاریخِ ہندوستان کا انتخاب کرلیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے بوٹنی پانچ برس قبل، زولوجی و کیمسٹری سات برس قبل اور فزکس نو برس قبل چھوڑی تھی۔ باقی کسی بھی مضمون پر میری اچھی پکڑ نہ تھی۔ اردو تو حال ہی میں سیکھ لی تھی مگر کوئی فارمل تعلیم حاصل نہیں کی تھی، نہ شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور نہ نثری اصناف کا، صرف اردو لکھنے میں مہارت تھی اور سال بھر صحافت سے جڑا رہا تھا۔ تاریخ کے ساتھ کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ ٹوٹل کنفیوژن...! رہنمائی کرنے کے لیے کوئی اغل بغل میں نہیں تھا۔ اس لیے جو سمجھ میں آیا فارم پر لکھ دیا۔ چونکہ کرپشن سے کنارہ کشی کا عزم کیا تھا اس لیے انڈین پوسٹل سروسز کو ترجیح دی۔ فارم کو آفس کے ذریعے آگے بھجوا دیا تا کہ بعد میں کوئی پرابلم نہ ہو۔ امتحانات سے پہلے مہینے بھر چھٹی لے کر دہلی اپنے دوست نثار حسین کے پاس چلا گیا۔ وہاں راؤز آئی اے ایس سٹڈی سرکل سے رابطہ کیا، منتظم کو مجھ سے ملنا گوارا نہ ہوا، اندر ہی سے کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیا کہ اپنے بارے میں ایک مختصر مضمون لکھو۔ مجھے جو سمجھ آیا لکھ کر بھیج دیا۔ پھر اندر سے حکم موصول ہوا کہ تمھیں یہاں داخلہ نہیں مل سکتا ہے۔ جو کوئی بھی پیغام لے کر آیا تھا میں نے اسی کے ہاتھ واپس پیغام بھیج دیا کہ راؤ صاحب سے کہہ دو کہ میرا نام نوٹ کر لے اور رزلٹ کے وقت لسٹ میں میرا نام ضرور ڈھونڈ لیں۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے چل دیا۔ پھر پوسا روڈ پر ایس این داس گپتا کالج میں کوچنگ حاصل کی۔ کوچنگ کیا تھی امیدواروں کو بے وقوف بنایا جا رہا تھا جن میں میں بھی شامل تھا۔ خیر مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد واپس سرینگر چلا گیا اور امتحان میں شرکت کی۔ میں ہر روز امتحان دے کر صراف صاحب کے پاس چلا جاتا اور ان کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کرتا۔ وہ میری برابر حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ رزلٹ کے دن پی آئی بی آفس پہنچا اور وہاں اپنا رول نمبر ۲۰۵۰/ ڈھونڈتا رہا۔ جب وہاں اپنا رول نمبر چھپا ہوا پایا تو اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہ ہوا، جیب سے رول نمبر سلپ نکالا اور وہاں کے منیجر سے التجا کی کہ ذرا اس رول نمبر کو دیکھ لیں۔ اس نے تصدیق کر لی۔ میں فوراً اپنے پتا جی کے پاس لال چوک میں واقع ایل آئی سی دفتر چلا گیا کیونکہ وہ ایمپوریم سے ریٹائر ہو کر بطور لائف انشورنس ایجنٹ کے کام کرتے تھے۔ پتا جی آفس کے نیچے ہی ٹی سٹال کے پاس کھڑے تھے۔ سن کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ سائیکل

اٹھائی اور میرے ساتھ واپس پی آئی بی آفس چلے گئے اور وہاں اپنی آنکھوں سے میرا رول نمبر دیکھ لیا۔ واپسی پر مجھے کہنے لگے کہ صراف صاحب سے بات کرلو تاکہ انٹرویو کے لیے کسی سے رابطہ کرلیں۔ میں نے جواب دیا۔ ”پاپا، آپ میری توہین کررہے ہیں۔ یہاں تک میں اپنے بل بوتے پر پہنچا ہوں، آگے بھی پہنچوں گا۔ میں کسی کے پاس نہیں جاؤں گا۔“ گھر پہنچ کر میں نے ان کو اس بارے میں یو پی ایس سی کی ہدایات دکھائیں مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ بعد میں جب ہم لوگ مسوری اکیڈمی میں زیرتربیت تھے تو معلوم ہوا کہ ان ہدایات کو نظرانداز کرکے علی گڑھ یونیورسٹی نے اپنے امیدواروں کا پہلے ہی سے بین تعامل انٹرویو بورڈ کے دوارا کین اے آر قدوائی اور اے جے قدوائی سے کرایا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد انٹرویو کے لیے دہلی جانا پڑا۔ سینی گال کے ابوبکر کیبکی کا تحفے میں دیا ہوا سوٹ کام آیا۔ پہن کر انٹرویو دینے چلا گیا۔ اندر جاتے ہی چیئرمین اے آر قدوائی نے سوال کیا کہ اردو، بوٹنی اور ہسٹری کا کمبی نیشن میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے بے خوف ہوکر کہا کہ بوٹنی میں ایم ایس سی کیا ہے، اردو کا قلم کار ہوں (ان کے ہاتھ میں میرے بھیجے ہوئے وہ اخبارات تھے جن میں میری کہانیاں چھپی تھیں) اور جب کوئی چوائس نہیں ملی تو انڈین ہسٹری کا انتخاب کیا۔ پھر انھوں نے میری افسانہ نگاری کے بارے میں پوچھ لیا۔ میں نے اسی افسانے کے حوالے سے بات کی جوان کے ہاتھ میں تھا۔ جب ان کو لگا کہ میں حاوی ہوتا جارہا ہوں، جھٹ سے ضیائی تالیف (Photosynthesis) کے بارے میں سوال داغ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے کیمسٹری میں اسی مضمون پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے رکھی تھی۔ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ایک اور بورڈ ممبر نے تاریخ ہند کے حوالے سے ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کشمیر اور مرکز کے درمیان رشتوں کے بارے میں پوچھ لیا۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا جس کا میں نے اعتراف کیا۔ پھر اے جے قدوائی کی باری آگئی، انھوں نے اردو کے حوالے سے چند سوالات پوچھ لیے جن کے میں نے کچھ حد تک تسلی بخش جوابات دیے۔ پھر ایک خواتین ممبر کی باری آگئی، انھوں نے زبان کی بنیاد پر ریاستیں بنانے کے بارے میں میرے خیالات پوچھ لیے اور میں نے تسلی بخش جوابات دیے۔ یہ لوگ میری بائیں جانب بیٹھے ہوئے تھے اور پھر دائیں جانب بیٹھے ہوئے ممبروں کی باری آئی۔ اگلے ممبر نے رقبے کے حساب سے گرین لینڈ اور آسٹریلیا کا موازنہ

کرنے کو کہا۔ اس بارے میں بھی مجھے زیادہ جانکاری نہیں تھی حالانکہ مرکیٹرس پروجیکشن کے حوالے سے کہیں کچھ پڑھا تھا مگر اس وقت یاد نہیں آ رہا تھا۔ اگلے ممبر نے فردوسی کا ایک فارسی شعر سنا کر اس شعر سے وابستہ قصے کے بارے میں سوال کیا اور جب میں نے یہ کہا کہ میں اردو کا طالب علم ہوں فارسی کا نہیں تو خود ہی فردوسی کی زندگی کے المیاتی انجام پر روشنی ڈالی۔ باہر جا کر انٹرویو کا خلاصہ (Resume) لکھتے وقت ایسا لگا جیسے میں اکثر سوالوں کا صحیح جواب نہیں دے پایا تھا۔

آخر کار نتیجے آئے اور میں صرف الائیڈ سروسز کی فہرست میں پانچویں نمبر پر تھا اور چونکہ میں نے انڈین پوسٹل سروس پہلی چوائس دی تھی اس لیے اسی سروس کو الاٹ ہوا تھا۔ آئی اے ایس اور پولیس سروس میں میرا انتخاب نہ ہو سکا کیونکہ آئی اے ایس میں آٹھ پیپر تھے اور دو ہائر سبجکٹس میں میرے مارکس کم آئے تھے جبکہ پولیس سروسز میں میں نے جن دو اختیاری مضامین کا انتخاب کیا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ اگر میں نے بوٹنی اور ہسٹری کی بجائے بوٹنی اور اردو کا انتخاب کیا ہوتا تو پولیس سروسز کی فہرست میں بہت اوپر ہوتا مگر ہسٹری میں بہت کم نمبر ملنے کی وجہ سے فائنل لسٹ میں میرا نام نہیں تھا۔

یہاں پر ضمنی طور پر امتحان میں اپنی کارکردگی کا بھی کچھ ذکر کرتا چلوں۔ دہلی سے کوچنگ لینے کے بعد، جو مجھے فضول لگی، میں ایکسچینج روڈ پر جا رہا تھا کہ کشمیر یونیورسٹی کے انگریزی شعبے کے پروفیسر جے رمن ملے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے میری یوں رہنمائی کی۔ ''ایسے (Essay) لکھتے وقت کبھی ہمیں 'الف' اور 'بے' کا تقابل کرنا پڑتا ہے، آدھے سے زیادہ مضمون میں ہم 'الف' کی نمایاں خصوصیات بیان کرتے ہیں، پھر نہ جانے کیوں سب کچھ پلٹ دیتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ چنانچہ 'بے' کی چند خصوصیات، جن کا ہم بعد میں ذکر کرتے ہیں، 'الف' سے قدرے بہتر ہیں اس لیے اسے 'الف' پر فوقیت حاصل ہے، انجام کار ہم 'بے' کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تمھیں 'بے' کی طرف داری کرنا مقصود ہے تو اول سے آخر تک کرو۔'' جے رمن صاحب نے ماضی میں کئی بار آئی اے ایس کے انگریزی مضمون کے پیپر جانچ لیے تھے۔ ان کی دس منٹ کی یہ گفتگو میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ میں نے انگریزی ایسے کے امتحان میں جو موضوع چن لیا اس کا عنوان تھا 'امریکا اور روس کے بیچ ہمارا انتخاب'۔ نتیجتاً مجھے کُل ۱۵۰ر نمبرات میں سے ۱۰۷ر نمبر مل گئے۔ اردو پیپر میں بھی کچھ عجیب سی بات ہوئی۔ چھ سوالوں کے جوابات

لکھنے تھے جس میں سے پہلا سوال مضمون نگاری کا تھا۔ ۵۰ رنمبروں کا سوال تھا اور لازمی تھا۔ باقی ماندہ پانچ سوالوں کے لیے ۳۰ رنمبرات مختص کیے گئے تھے یعنی کُل ۲۰۰ رنمبرات کا پرچہ تھا۔ میں نے جونہی سوالنامے پر سرسری نظر دوڑائی تو مضامین کی چوائس دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، 'تعلیم کے مقاصد' کو چن لیا کیونکہ بی ایڈ میں یہ میرا پسندیدہ موضوع تھا اور اس پر میں سوڈیڑھ سو صفحات لکھ سکتا تھا۔ وقت کی پرواہ نہ کر کے میں مضمون لکھتا چلا گیا جب تک آدھا ٹائم ہو گیا اور قریباً ۹۰۰ رالفاظ لکھ چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اختتام کو پہنچنے والا ہوں ذرا دیکھ تو لوں اور کچھ باقی تو نہیں رہ گیا۔ مذکورہ سوال دوبارہ غور سے پڑھا۔ وہاں لکھا تھا کہ مضمون تین سو الفاظ سے زائد نہ ہو۔ میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ دراصل میں نے تاریخی پس منظر میں ہندستانی نظامِ تعلیم کی ارتقائی منزلوں، نئے نئے منظرناموں اور بدلتے ہوئے مقاصد پر روشنی ڈالی تھی۔ دل مسوس کر میں نے گورُوکُل سسٹم، مدلیار کمیشن، ہنٹر کمیشن، رادھا کرشنن کمیشن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن وغیرہ کی سفارشات پر لکھے اپنے خیالات اور ان کی سفارشات پر تنسیخی لکیر کھینچ دی اور تازہ ترین کوٹھاری کمیشن سے آگے جوں کا توں رہنے دیا، نیز پچاس الفاظ لکھ کر مضمون کو ختم کر دیا۔ باقی سوالوں کے جوابات جلدی جلدی لکھ ڈالے اور بہت ہی مایوس ہو کر گھر لوٹا۔ جب نتیجہ نکلا تو مجھے اردو میں ۲۰۰ رمیں سے ۱۳۳ رنمبرات مل چکے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ ممتحن نے وہ پورا مضمون پڑھ لیا ہوگا، جس پر میں نے لاچاری میں ایک ترچھی لکیر ڈالی تھی اور سوچا ہوگا کہ یہ تو کسی مستند ماہر تعلیم کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ بہر حال تاریخ ہند نے کہیں کا نہ رکھا۔ صرف ۷۷/۲۰۰ نمبر مل گئے۔ مسوری میں جب کسی سے رائے طلب کی تو معلوم ہوا کہ برٹش یا یورپی تاریخ میں نمبر حاصل کرنا آسان ہے بہ نسبت تاریخ ہند کے۔ ہندوستانی تاریخ کے تین گروہ ہیں، ایک داہنے بازو کے، دوسرے بائیں بازو کے اور تیسرے مرکزی سوچ کے۔ اس سال چنانچہ ایمرجنسی لگی ہوئی تھی اور یساری قوتیں حاوی ہو چکی تھیں، اس لیے سوالنامہ جے این یو، نئی دہلی میں سیٹ ہوا تھا اور وہیں پر جانچا بھی گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے جوابات میں ان کی خوشنودی کے لیے کوئی تحریر نہیں تھی۔ خیر علم نباتات میں بہت اچھے نمبرات (۱۳۷/۲۰۰) مل چکے تھے۔ بہر حال آخر کار میں انڈین پوسٹل سروس میں الاٹ ہوا اور اکیڈمی میں میری کئی کوششوں کے باوجود مجھے سروس بدلنے کی اجازت نہیں ملی۔

مسوری جانے سے پہلے پولیس جانچ رپورٹ کا مسئلہ سامنے آیا۔ ایک پولیس والا گھر پر اچانک آیا۔ اس وقت میں اور میرے پتا جی دونوں صحن میں کھڑے تھے۔ اس نے اپنے آنے کی غرض و غایت بیان کی اور مجھ سے کچھ سوالات پوچھے، آخر میں شوشہ چھوڑ دیا۔ ’’آپ مولوی فاروق کے گھر کیوں جایا کرتے تھے؟‘‘ میرا تو دل ہی بیٹھ گیا مگر پتا جی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ’’بھئی ہم تو ان کے مریدوں میں سے ہیں۔‘‘ پھر اس کو الگ لے جا کر جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال لیا اور اسے یہ کہہ کر دیا ’’خوشی کا موقع ہے، گھر میں میری طرف سے مٹھائی کھلا دینا۔ میرا لڑکا آئی پی ایس افسر بننے والا ہے کل کو تمھارے بھی کام آئے گا۔‘‘ پولیس والے نے سو روپے کا نوٹ جیب میں رکھ لیا اور سوال بھول کر رخصت ہوا۔ سو روپے کے نوٹ نے تیسری بار کمال کر دیا۔

میرے ساتھ دو اور کشمیری پاس ہوئے تھے۔ شبن لال بٹ اور کوروکھشیتر کا ڈاکٹر اشوک بھان۔ آئی اے ایس اور آئی پی ایس میں بالترتیب الاٹ ہوئے تھے۔ چونکہ مسوری اکیڈیمی سے بلاوا نہیں آرہا تھا، شبن لال بٹ میرے گھر آیا اور اپنی پریشانی ظاہر کی۔ میری شادی ۲۳؍جولائی اور میری چھوٹی بہن کی شادی ۲۴؍جولائی کو طے تھی، اس لیے اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ اس کی ملاقات کے بعد کچھ فکر مند ہو گیا۔ مگر شادی کے روز ہی مسوری کا لیٹر بھی آ گیا۔ ۲۵؍تاریخ کو ہوائی جہاز سے دہلی کی اڑان بھر لی، پھر ریل اور ٹیکسی کا سفر کر کے ۲۶؍کو مسوری پہنچ گیا اور ۲۷؍جولائی کو بحیثیت پروبیشنر مسوری اکیڈیمی میں جوائن کر لیا۔

ضمنی طور پر یہ بھی عرض کروں کہ دریں اثنا صراف صاحب نے اپنے طور پر آل انڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ کے منتظم مسٹر مینگی سے میرے بارے میں بات کی تھی اور میں دہلی میں ان سے ملا بھی تھا۔ مگر انھوں نے مجھے فیلڈ افسر کی نوکری آفر کی جبکہ اپنے بھتیجے کو اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی پوسٹ پر تعینات کیا۔ جب فیلڈ افسروں کی لسٹ شائع ہوئی اس میں میٹرک پاس اور گریجویٹ لوگ بھرے ہوئے تھے۔ اسی طرح ایچ ایم ٹی سرینگر میں بھی سیلز منیجر کی اسامی کے لیے انٹرویو دیا تھا مگر ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں نے سنٹرل سروسز کا امتحان پاس کیا ہے تو انھوں نے تقرری کا آرڈر روک لیا۔ خیر کہتے ہیں انت بھلا، سو بھلا۔

☆☆☆

شادی، خانہ بربادی

ڈیل کارنیگی (Dale Carnegie) اپنی کتاب 'پریشان ہونا کیسے چھوڑیں اور جینا کیسے شروع کریں' (How to Stop Worrying and Start Living) میں رقم طراز ہے کہ آدمی کو زندگی میں دو فیصلے احتیاط سے کرنے چاہئیں، ایک، کون سا پیشہ اختیار کریں؟ اور دوسرا، کس سے شادی کریں؟ یہ شاید مغرب کے تعلق سے صحیح ہو مگر مشرق میں اس کی کوئی معنویت نہیں۔ یہاں ان دونوں کا فیصلہ یا تو والدین کرتے ہیں نہیں تو معاشرہ۔ بیٹا انجینئر بنے گا یا ڈاکٹر؟ یہ تو والدین ہی طے کر لیتے ہیں اور اسی حساب سے بچوں کے سبجکٹس کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہاں بچہ اگر ڈھیٹ ہو، جو اکثر بچے ہوتے ہی ہیں، تو ماں باپ کی تمناؤں پر پانی پھر جاتا ہے۔ نہ ڈاکٹر بنتے ہیں اور نہ انجینئر۔ رہی سہی کسر معاشرہ پوری کرتا ہے جیسے ریزرویشن، دولت کی فراوانی اور گھر کی ذمہ داریاں۔ میں نے کئی ڈاکٹر دیکھے ہیں جو ٹریننگ کے بعد تجارت، سیاست یا افسرشاہی کے رکن بن گئے، کئی انجینئر دیکھے ہیں جنھوں نے بالی وُڈ اور دوردرشن کے لیے فلمیں بنائیں یا پھر ناول لکھے۔ اس کے باوجود اکثر والدین اولاد پر اپنی پکڑ نہیں چھوڑنا چاہتے، پڑھا لکھا کر چاہتے ہیں کہ کوئی سرکاری نوکری مل جائے جہاں بالائی آمدنی کے زیادہ امکانات ہوں۔ لڑکیوں کی دنیا بالکل ہی نرالی ہے۔ گو زمانہ کافی بدل گیا ہے پھر بھی بیشتر لڑکیاں یا تو وقت گزاری کے لیے تعلیم حاصل کرتی ہیں یا پھر فیشن کے لیے۔ ہمارے نرینہ عصبی معاشرے میں والدین کی نظر صرف لڑکوں پر جمی رہتی ہے کیونکہ وہ ان کے مستقبل کا ضامن مانے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی تو پوچھو ہی مت، سن بلوغ کو پہنچی نہیں، لڑکا ڈھونڈ لیا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ، لڑکی کی تعلیم گئی بھاڑ میں۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں نے مذکورہ دونوں فیصلے مجبوری میں کیے اور کوئی بھی فیصلہ من موافق نہیں تھا۔ نوکری کے بارے میں تو لکھ ہی چکا ہوں، شادی کے معاملے میں حالات نے کچھ عجیب سا کھیل کھیلا۔ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

پتاجی کی دیرینہ آرزو تھی کہ ان کے کنبے میں سے کوئی ڈاکٹر بن جائے مگر نہ میری بڑی بہن بن سکی اور نہ ہی میں۔ بڑی بہن کے وقت صراف صاحب ریاستی کابینہ کے منسٹر تھے اور میرے ٹائم پر لوک سبھا کے ممبر۔ مگر وہ کوئی مدد نہیں کر سکے۔ چھوٹی دو بہنوں تک آتے آتے پتاجی کے ارمان دم توڑ چکے تھے۔ بعد میں ان کی تمنا تھی کہ میں ٹیچر نہیں بلکہ افسر بن جاؤں۔ کسی نہ کسی طرح ان کی یہ خواہش پوری ہو ہی گئی۔ رہا بچوں کی شادی کا سوال، اس معاملے میں ان کی کچھ بھی نہ چلی۔ سبھی نے اپنی من مرضی سے شادی کر لی۔ میں نے کنبے کی پراگندہ حالت کو دیکھ کر اپنی محبت کو، جو دہلی میں آسودہ حال ڈاکٹر تھی، ٹھکرا دیا اور ایسی لڑکی سے ارینجڈ میرج کرنے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں مجھے بھروسہ تھا کہ گھر گرہستی کی ذمہ داری سنبھال لے گی مگر میرا منطق ناکام رہا۔ پتاجی قطعی طور پر اس شادی کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ میں کسی بڑے افسر یا سیاست دان کی بیٹی سے بیاہ کر لوں تاکہ وہ میری آئندہ زندگی میں ترقی کی ضمانت بن سکے۔ اس معاملے میں ہم دونوں کے درمیان ترسیلی خلیج رہی۔ ایمپوریم کی ملازمت کے دوران میرے پتاجی نے ایک لڑکی ڈھونڈ لی تھی۔ اس کا والد نہیں تھا اس لیے بھائی مجھ سے ملنے میرے آفس آیا مگر میں ابھی شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے انھیں اپنی ۲۵۰/- والی تنخواہ کا بیورا سامنے رکھ دیا اور نرمی سے پوچھا کہ وہ اپنی بہن کی شادی مجھ سے کرنا چاہیں گے یا نہیں، فیصلہ ان کو کرنا ہے؟ وہ خاموش ہو کر چلے گئے اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیے۔ اس کے بعد پتاجی نے کوشش کرنا ہی چھوڑ دی۔ میں نے خود ہی ایک اور لڑکی کے بارے میں نشاندہی کی مگر نہ تو پتاجی اور نہ ہی کسی اور نے اس میں دلچسپی لی۔ پتاجی کو وہ اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس کا باپ گورنمنٹ ملازم نہیں تھا بلکہ ٹائپ رائٹر انسٹی ٹیوٹ چلاتا تھا اور گورنمنٹ دفتروں میں ٹائپ رائٹروں کے رکھ رکھاو کا کنٹریکٹ لیتا تھا۔ اُدھر جموں میں ایک رشتے دار نے مجھے ایسے دام میں پھنسانے کی کوشش کی کہ جب مجھے سرینگر لوٹ کر لڑکی کے چال چلن کے بارے میں علم ہوا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے بچ نکلا۔ اسی دوران میرا ایک پڑوسی دوست ایک پروپوزل لے کر آیا اور لڑکی کے بارے میں بہت تعریفیں کرنے لگا۔ اس کے ماما کی شادی لڑکی کی بڑی بہن سے طے ہوئی تھی۔ میں نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا تھا اور اب آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لیے شادی کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ اس نے کہا لڑکی لکھنؤ میں رہتی ہے، ایم اے ایل ایل بی ہے، پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں مگر

باپ نہیں ہے۔ پتاجی کچھ مائل نہیں ہوئے۔ مجھے شک ہوا کہ انھیں پھر وہی پریشانی ہو رہی ہے کہ لڑکی بڑے افسر کی بیٹی نہیں ہے۔ میرا یہ خیال تھا کہ اتنے بڑے کنبے کی لڑکی اور وہ بھی جس کا والد نہیں ہے، زندگی کی کٹھنائیوں سے آشنا ہوگی اور میرے گھر میں ایڈجسٹ کرے گی۔ پوپھی نے البتہ اشارتاً کہا کہ اتنے بڑے گھر میں تمھارا گزر نہ ہوگا کیونکہ تم تجرد پسند آدمی ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے دماغ پر بھوت سوار ہوگیا اور میں اس بات پر اڑ گیا کہ شادی اسی لڑکی سے کروں گا اور جہیز قطعی نہیں لوں گا۔ پتاجی نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح بینا رینا کے ساتھ میری شادی پکی ہوگئی۔ بیوہ پوپھی نے البتہ یہ نصیحت کی کہ چونکہ اس لڑکی کا باپ نہیں ہے اور والدین کی ساتویں اولاد ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کی ماں نے تھوڑا تھوڑا بچا کر کچھ چیزیں اس کے لیے اکٹھا کی ہوں، میری یہ گزارش ہے کہ ان کو نہیں ٹھکرانا کیونکہ ایک بوڑھی بیوہ کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں ماں نما پوپھی کی بات ٹال نہ سکا اور بیوی جو کچھ بھی ٹرنک بھر سامان لے کر آئی اسے واپس کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان چیزوں میں میرے حصے میں ایک ٹرانزسٹر، دو سوٹ، ایک گھڑی اور ایک جوتا آیا کیونکہ میں نے سونے کی انگوٹھی نہ لی اور نہ کبھی پہنی۔ سارے سامان کی کل قیمت تیس چالیس ہزار کے قریب تھی جس میں بیس تیس ہزار کا سامان خود اس کا اپنا تھا۔ اس جائیداد کو کوئی جہیز کہے تو میں کیسے روک سکتا ہوں؟ اس سے زیادہ سونے کے زیور تو اس کو سسرال سے تحفتاً ملے۔ اس زمانے میں غریب سے غریب لوگ بھی اپنی بیٹیوں کو سونے کے دو تین سیٹوں کے علاوہ صوفہ سیٹ، دو پلنگ، فین اور دیگر الیکٹرک سامان جہیز میں دیتے تھے۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری ہے کہ اس وقت میں نے سول سروسز کا امتحان پاس کرلیا تھا اور جہیز مارکیٹ میں کم سے کم تین چار لاکھ کی بولی لگ جاتی۔ مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو پوپھی کی بات مان لینا میری بہت بڑی بھول تھی۔ لینے کو تو جہیز لے ہی لیا اور دیکھا جائے تو اسے جہیز کہنا بیوقوفی ہوگی۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا........!

شادی ۲۳/ جولائی کو ہوئی اور دو دن بعد ہی مجھے مسوری کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ بیوی سسرال میں رہی۔ دو تین مہینے بعد مجھے اسے مسوری لانے کا موقع مل گیا جب میں اکیڈمی کے ٹور پر ویشنو دیوی، کٹڑہ، جموں آ گیا۔ چند دن مسوری میں اپنے ساتھ رکھ لیا اور پھر اس کو لکھنؤ میکے میں چھوڑ آیا۔ مسوری کی کافی سیر ہوئی۔ پانچ ماہ کے بعد میں پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ٹریننگ سنٹر چلا گیا جہاں وہ میرے ساتھ

رہی۔ میری بقایا تربیت یوپی خاص کر لکھنؤ کے آس پاس ہوئی اور اس دوران میری بیوی میرے ساتھ تھی۔

بدقسمتی سے ازدواجی زندگی میں ابتدا ہی سے مجھے جھٹکے لگتے رہے۔ میرے پتاجی نے شادی کی تاریخ اس طرح مقرر کرنے کا فیصلہ کیا کہ میری بہن کی شادی پہلے ہو اور پھر میری مگر میرے سالے کو یہ تاریخیں راس نہیں آئیں کیونکہ وہ اپنی دونوں بہنوں کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ اس کی پریشانیوں کو دیکھ کر میں نے پتاجی پر دباؤ ڈالا اور ان کو منا لیا حالانکہ اس طرح ہمیں بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ گفتگو کے دوران میرے سالے نے بھروسہ دلایا کہ وہ ہمیں ضروری اشیائے خوردنی جیسے چاول، چینی وغیرہ خریدنے میں مدد کر لیں گے کیونکہ وہ فوڈ کارپوریشن میں کام کرتے تھے۔ لیکن اس روز کے بعد وہ غائب ہو گئے اور میری چھوٹی بہن کی شادی کے دن سوٹ بوٹ پہن کر مہمانوں کی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ نتیجے میں مجھے چاول لانے کے لیے خود سرینگر سے ساٹھ کلومیٹر دور اننت ناگ اپنے پوپھا کے پاس جانا پڑا اور دو بوری چاول وہاں سے بس میں اور پھر امیرا کدل سے گھر تک ریڑھی میں لانا پڑا۔ مجھے اس بات پر غصہ نہیں آیا کہ یہ سب کام کرنا پڑا بلکہ اس جھوٹ پر غصہ آیا جو میرے سالے نے بولا تھا۔

دوسرا جھوٹ جس نے مجھے جھنجھلا دیا وہ تھا میری بیوی کی تعلیم کے سلسلے میں۔ مجھے کہا گیا تھا کہ وہ ایم اے، ایل ایل بی ہے جبکہ حقیقت میں وہ محض بی اے پاس تھی۔ ایل ایل بی میں ایڈمشن تو لے لیا تھا مگر بعد میں اسے ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ایم اے میں ایڈمشن لیا تھا مگر ابھی کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ میرے پتاجی مجھے سچ بولنے اور جھوٹ سے نفرت کرنے کی ہمیشہ تلقین کرتے رہے۔ اس لیے اتنے بڑے جھوٹ کو میں سہار نہ پایا اور رفتہ رفتہ یہ سب صدمے میرے اندر لاوے کی طرح جمع ہوتے رہے۔ میں سوچنے لگا کہ جب لوگ اس بارے میں سنیں گے کہ میری بیوی صرف گریجویٹ ہے، تو میری تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے طے کر لیا کہ میں اس کو پوسٹ گریجویشن کروا کے ہی دم لوں گا۔

پروبیشن کے دوران میری بیوی نے ایم اے (سماجیات) مکمل کیا اور میں چاہتا تھا کہ وہ سکول میں پڑھانے کے قابل بن جائے اس لیے اسے بی ایڈ کرنے کی صلاح دی۔ اس کے لیے میں نے سرینگر میں اسی کالج میں ایڈمشن کا انتظام کروایا جہاں سے میں نے خود بی ایڈ مکمل کیا تھا۔ پروبیشن کے دوران میں

یوپی میں ایک شہر سے دوسرے شہر گھومتا رہا جب تک وہ سرینگر میں بی ایڈ کرتی رہی اور یہی دور میری زندگی کا بدترین دور ثابت ہوا۔ وہ سسرال میں رہتی تھی اور ہر ایک سے لڑتی جھگڑتی تھی جس کا مجھے علم ہی نہ تھا۔ میرے پتاجی اور پوپھی نے سب کچھ سہن کر لیا مگر میری سب سے چھوٹی بہن، جو ابھی کنواری تھی، کہاں ماننے والی تھی، اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی یہاں تک کہ میری غیر حاضری میں دونوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہے۔ مجھے اس بارے میں کسی نے کوئی خبر نہ دی۔ بعد میں میری بیوی بینا نے سسرال والوں پر من گھڑت الزام لگایا کہ انھوں نے پورے ہفتے اسے بھوکا رکھا۔ میں ہوتا شاید میں ایسا کام کر بھی لیتا مگر جتنا میں اپنے پتاجی یا پوپھی کو جانتا تھا وہ تو دشمن کو بھی بھوکا رکھنے والوں میں سے نہ تھے اپنی بہو کا کھانا بند کرنا تو بعید از قیاس تھا۔ انہی دنوں اپنی بہن کی ہدایت پر میری بیوی نے پہلوٹھی کی اولاد کو بہت ہی گھناونے طریقے سے ضائع کر لیا کہ مجھے سنتے ہی شرم آئی۔ شکر ہے کہ پھینکے ہوئے جنین کو کسی نے دیکھا نہیں ورنہ لوگ میری بہن پر شک کر لیتے۔ اس واقعے کے بارے میں بینا نے خود ہی مجھ سے بتایا تھا۔

ٹریننگ کے بعد جب میں سرینگر پہنچا تو سب باتوں کا پتہ چلا۔ بعد میں میری بیوی نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اس کو ہر مہینے روپیہ نہیں بھیجتا تھا حالانکہ تربیت کے دوران وہ زیادہ تر میرے پاس یا نزدیک ہی رہی اور صرف بی ایڈ کرنے کی غرض سے سرینگر چلی گئی۔ تاہم اگر یہ بات صحیح بھی مانی جائے کہ میں نے اس کو روپے نہیں بھیجے اور وہ سسرال میں اس وجہ سے پریشان ہو رہی تھی اور ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی، وہ جا کر اپنے بھائی کے ہاں بھی رہ سکتی تھی، جو اس وقت سرینگر ہی میں تعینات تھا۔ اگر اس کی نیت اچھی ہوتی وہ چپ چاپ اپنے میکے میں دو چار مہینے کاٹ لیتی جب تک میں آ جاتا۔ مگر اس کا منشا کچھ اور ہی تھا جس کا پردہ آہستہ آہستہ اٹھتا رہا۔

میری پہلی پوسٹنگ کشمیر ڈویژن میں ہوئی اور میں دوڑتا بھاگتا اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہاں ایک عجیب قسم کا تناؤ دیکھنے کو ملا جس سے میں بے خبر تھا۔ اس دن میری دہلی والی مامی بھی آئی تھی جس نے خود میرے ماما کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی۔ میں یہ سوچ کر کہ میں اپنی بیوی کو بعد میں سمجھا بجھا کر تناؤ کو کم کروں گا، اپنی بہن کو تسلی دے رہا تھا کہ تم فکر مت کرو میں اپنی بیوی کی پوری طرح خبر لوں گا وغیرہ وغیرہ۔ اتنا کہنا ہی تھا کہ باہر دھڑام سے کچھ بھاری چیز گرنے کی آواز آئی۔ باہر نکلا تو میری بیوی نے پہلی

منزل (۹ رفٹ) سے چھلانگ ماری تھی۔ میری تو ہوائیاں اڑ گئیں۔ بہت شرمسار ہوا۔ جس آدمی کو محلے والے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے بچوں کو میری مثالیں دیتے تھے اس کی یہ درگت ہوگئی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ سسرال والوں کو بلوایا۔ شکر ہے کہ پولیس کیس نہیں ہوا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر پلستر چڑھ گیا۔ اس وقت وہ حاملہ بھی تھی۔ اس چھلانگ کے باعث میرے بڑے بیٹے کے جبڑے میں پیدائشی نقص پیدا ہوگیا جو لاکھ کوششوں کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوسکا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ ایک دو دن کے بعد پہلی بار سینئر سپرانٹنڈنٹ پوسٹ آفسز کا چارج لینا تھا۔ سارے ڈیپارٹمنٹ میں اس بات کا چرچا ہو رہا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ میری ساس اور اس کی بہن نے ہمارے گھر سے واپس نکل کر اپنی بیٹی کی ساکھ بچانے کے لیے بے پر کی اڑا دی کہ سسر نے بہو کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا تھا۔ بہرکیف جب ان کو معلوم ہوا کہ میرے پتا جی کی نیک نامی کے سبب لوگ ان کی باتوں پر یقین نہیں کرتے ہیں تو دو تین دن بعد انھوں نے بات بدل دی اور سسر کی جگہ نند کا نام لے لیا۔ اس طرح بے چاری کنواری بہن کی بدنامی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔

تناؤ سے بچنے کے لیے میں اپنے گھر سے الگ ہوگیا اور دفتر کے پاس ہی کرن نگر میں کرایے کے مکان میں رہنے لگا۔ میرا ایک انٹرویو دوردرشن کشمیر پر نشر ہوا جس میں میں نے یہ کہا کہ میں نے جہیز نہیں لیا۔ دو چار دن کے بعد میری سب سے بڑی سالی ہمارے گھر آئی اور کہنے لگی کہ میں سسرال والوں کو خوامخواہ بدنام کر رہا ہوں، جو جہیز لینا تھا سو تو لے لیا لیکن ٹی وی پر انھیں بدنام کر رہا ہوں۔ یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک دن بعد میرا ایک اور ساڑھو گھر میں وارد ہوا۔ میں نے اپنی کلائی سے گھڑی اتاری اور ٹرانزسٹر سمیت دونوں کو پتھر سے کوٹ کر ایک رومال میں باندھ لیا اور اس کے حوالے کر دیا۔ پھر اسے مخاطب ہوا کہ میرے سسرال والوں نے جو چیزیں بھیجی تھیں ان میں سے میں نے صرف یہ دو چیزیں استعمال کرلی ہیں جس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ اس لیے اب یہ چیزیں انھیں واپس بھیج رہا ہوں۔ میری بیوی یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئی اور نہ جانے کیا کیا بکتی رہی۔

شاید میری بیوی کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے دوسری بہنوں کی طرح زن مرید شوہر نہیں ملا تھا۔ میں تو من موجی تھا، اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن۔ جیسے کی عام بیویوں کی

عادت ہے میری بیوی نے مجھ سے سگریٹ چھڑوانے کی کوشش کی۔ بڑے ہی گھمبیر لہجے میں کہنے لگی۔ ''میری بات مان لو، یہ سگریٹ پینا بند کر دو۔ اس سے نقصان ہی ہوتا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔'' میں نے پہلے تو بات ٹال دی مگر جب اس نے دوبارہ وہی بات دہرائی تو جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔ ''بات یہ ہے کہ سگریٹ کے ساتھ میری یاری پانچویں جماعت سے چل رہی ہے اور تمھارے ساتھ ابھی کچھ ہی برس ہو گئے ہیں۔ اگر ایک نئے دوست کے لیے میں پرانے دوست کو چھوڑ دوں گا تو کیا کل یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی اور نئے دوست کے لیے تم کو چھوڑ دوں۔'' اس دن کے بعد محترمہ نے مجھ سے سگریٹ چھوڑنے کو کبھی نہیں کہا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ بہت برس بعد اپنے بڑے جواں سال بیٹے کو خوش رکھنے کے لیے اور اسے اپنے قابو میں کرنے کے لیے وہ دبئی سے اس کے لیے فارین سگریٹ لے کر آتی تھی۔

بینا کے گربھ کے دن پورے ہو گئے، میں نے دفتر کے انسپکٹر کو بھیج کر نرسنگ ہوم کا انتظام کروایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی ماں نے کچھ الگ ہی پروگرام بنا رکھا تھا کیونکہ کسی نے مجھ سے اس بارے میں بات تک نہیں کی۔ اس کی ایک اور بیٹی بچہ جننے کے لیے گورنمنٹ ہسپتال میں بھرتی ہو چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میری بیوی بھی وہیں ساتھ میں رہے تا کہ وہ دونوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ میرے ساتھ پہلے ہی سے مشورہ کیا گیا ہوتا تو کوئی پریشانی نہ ہوتی مگر آخری لمحے پر جب میں نے سارا انتظام کروایا میری بیوی گورنمنٹ ہسپتال میں داخلہ لینے کے لیے ہٹ کرنے لگی۔ وہی ہوا جو ماں بیٹی نے سوچا تھا۔ پہلوٹی کا بچہ تھا، میں چھوٹی موٹی باتوں کو درگزر کرنے لگا۔ گورنمنٹ ہسپتال میں داخلہ ہوا۔ میری سالی کی ڈیلیوری ہو گئی اور اس کو اپریشن تھیئٹر سے نکال کر غلام گردش میں ننگے فرش پر لٹا دیا گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت غصہ آ گیا۔ اتفاقاً ہسپتال میں ایک نرس تھی جو مجھ کو جانتی تھی (شاید ایک زمانے میں چاہتی بھی تھی)۔ میں نے اسے التماس کی اور سالی کے لیے ہال میں بیڈ خالی کروایا۔ دوسری طرف میں نے اپنی بہنوں کو چکن کا سوپ بنانے سے تنبیہ کی اور خود ہی مصالحوں کے بغیر اچھا سا سوپ بنا کر ہسپتال لے گیا۔ میرے پیہم اصرار کے باوجود بینا نے سوپ پینے سے انکار کر دیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ میری بہنوں نے اس کے کچن پر قبضہ کیا ہوگا اور یہ سوپ ان کے ہاتھوں بنا ہوگا۔ جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو میں نے ساس سے التجا کی کہ وہ اپنی بیٹی کو سمجھا دے۔ مگر وہ کیا سمجھاتی، الٹے اس نے ایسا جواب دیا کہ مجھے خاموش

ہونا پڑا۔ اِدھر بینا بھرتی چلی گئی اور میری بہنوں کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور پھر کبھی ہسپتال نہیں گیا۔ بچہ کب پیدا ہوا مجھے نہیں معلوم.......!

گھر اور دفتر ہر دو جگہ انتشار پھیل گیا۔ دفتر میں سٹاف کے تبادلے کے باعث بہت تناؤ رہنے لگا۔ سبھی یونینیں میرے خلاف ہو گئیں کیونکہ ان کے لیڈروں کی ایک نہ چلتی تھی۔ تینوں یونینوں نے سٹرائک کی اور مجھے لداخ سے واپس سرینگر پہنچنا پڑا۔ اسی پس منظر میں بارہ مولہ سے واپس آتے وقت میری جیپ کا حادثہ ہوا اور میرے سینے کی تین پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ بال بال بچ گیا، اگر پوری طرح ٹوٹ جاتیں تو سیدھے دل کو چھید جاتیں اور میرا رام نام ست ہو جاتا۔ سنا ہے، جھگڑے بکھیڑے زندگی کو کم کرتے ہیں۔ یہاں میں بستر میں کراہ رہا تھا اور وہاں میرا بچہ آنکھیں کھولنے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ پیٹ ہی میں تھا کہ ماں نے چھلانگ لگائی جس کے سبب رحم مادر ہی میں گہری چوٹ لگی تھی۔ بہت عرصہ بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے اوپر اور نیچے والے جبڑوں کی باہمی سیٹنگ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے پتا جی اور پوپھی مجھ سے پوچھے بغیر ہی بچے کو دیکھنے ہسپتال پہنچ گئے۔ پتا جی تو تھے ہی لڑائی جھگڑے کے خلاف، وہ بڑی سبکدستی سے بہو کو گھر لانے اور جھگڑے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے حالانکہ مجھے تجدید تعلقات کی مرضی نہ تھی۔ گاڑی یوں ہی چلتی رہی، میری توجہ زیادہ تر دفتر پر مرکوز رہی، والدین و بہنوں کے ساتھ زیادہ رابطہ نہیں رہا جب تک میرا فوجی ٹریننگ کا آرڈر موصول نہ ہوا۔

میاں بیوی کی یہ کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوتی گو اس میں کچھ ٹھہراو ضرور آیا۔ اس کا ذکر اگلے صفحات پر.......!

☆☆☆

نیا پیشہ، نئی چنوتیاں

انڈین سول سروسز کا امتحان ۱۹۷۵ء میں دیا تھا، رزلٹ ۱۹۷۶ء میں نکلا۔ ۲۷/جولائی ۱۹۷۶ء کو فاونڈیشن ٹریننگ کے لیے مسوری پہنچ گیا۔ سفر خرچ کے لیے میرے پاس پورے روپے نہیں تھے کیونکہ ۲۳/تاریخ کو شادی ہوئی تھی۔ بیوی کے پاس ڈیڑھ ہزار روپے تھے اس نے بغیر کسی سنکوچ کے مجھے دے دیئے۔ اس کی یہی ایک کرم فرمائی تھی جس کو میں عمر بھر نہ بھلا پایا اور اس کی کئی حماقتوں کو درگزر کرتا رہا۔ لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن، مسوری (LBSNAA) کی ٹریننگ پانچ مہینے کی تھی اور کل پروبیشن دو سال کا۔ فاونڈیشن کورس کے لیے سبھی کامیاب امیدواروں کو مسوری بلایا جاتا تھا پھر پانچ مہینے کے بعد اپنے اپنے محکمے کے ٹریننگ سینٹروں میں بھیجا جاتا تھا جبکہ آئی اے ایس اور آئی ایف ایس کے افسر پوری ٹریننگ کے لیے یہاں رہتے تھے۔ تقریباً ۵۰۰ سے زائد تربیت پانے والے کارآموز (Probationers) تھے جو دو احاطوں (Campuses) میں رہتے تھے۔ پہلا چارلویل کیمپس (Charlville Campus) اور دوسرا سیوائے کیمپس (Savoy Campus)۔ میں اپنے روم پارٹنر دیپک ترالشاوالا، جو ایک ٹانگ کی معذوری کے سبب آئی ایف ایس/آئی اے ایس میں منتخب نہیں ہوسکا اس لیے انکم ٹیکس سروس میں جوائن کرنا پڑا، کے ساتھ سیوائے کیمپس میں رہتا تھا۔ ترالشاوالا معصوم کالج اسٹوڈنٹ سا لگتا تھا، بہت منظم اور تہذیب یافتہ۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وہ میرا روم پارٹنر تھا۔ اکیڈمی میں پی ٹی (جسمانی ورزش)، یوگا، گھوڑسواری، فائرنگ اور نہ جانے کیا کیا الا بلا سکھائی جاتی تھی۔ جسمانی ورزش سے بچنے کے لیے میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنالیتا۔ ہمارے ناکتخدا یوگا گرو بھی اسی کیمپس میں مقیم تھا، اس لیے اس کے ساتھ اچھی دوستی ہوگئی۔ وہ مجھ سے ہیک مینز کے کیبرے ڈانس کی کہانیاں سن سن کر خوب لطف اندوز ہوتا تھا اور اس طرح مجھے یوگا کلاسز سے اکثر چھوٹ مل جاتی۔ آخر بندہ بشر ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ انسان مذہبی طور پر خود کو کتنا ہی نظم و ضبط میں جکڑنے کی کوشش کرے، اپنی جبلی خواہشوں سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ مسوری میں ایک اچھا ہوٹل تھا جس کا نام تھا ہیک مینز۔ وہاں پر پُرکشش اور شہوت انگیز دیپا ملہوترا کیبرے ڈانس کرتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کی دوستی ہوگئی اور پھر میں کئی بار اس کو ملنے کے لیے چلا گیا۔ ایک دو بار کیبرے دیکھ لیا مگر بعد میں بور ہوگیا، اس لیے براہ راست اس کے کمرے میں بیٹھ کر اسے بتیاتا۔ وہ اپنے بستر میں ایک سفید پمیرین کتے کے ساتھ نیم دراز لیٹی رہتی اور میں سامنے کرسی پر بیٹھا رہتا۔ بہت شراب پیا کرتی تھی مگر میں چائے پر ہی اکتفا کرتا تھا جس پر وہ طنزاً کہا کرتی کہ چائے سے نامردی کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور پھر ہنس دیتی۔ زمانے کی ٹھکرائی، بہت ہی درد بھری زندگی گزار کر وہ اس پیشے سے منسلک ہوگئی تھی۔

اکیڈمی میں دن بھر لیکچر سننے پڑتے تھے۔ کبھی اپنی فیکلٹی کے اور کبھی باہر سے بلائے گئے وزِٹنگ لیکچررس کے۔ بریک فاسٹ کمرے میں دیا جاتا تھا مگر لنچ اور ڈنر باجماعت ڈائننگ ہال میں ہوتا تھا۔ کھانے پینے کی اشیا سامنے رکھی جاتیں اور جس کو جتنی مرضی، اتنی کھا لیتا تھا۔ جوانی میں بنیادی طور پر دو ہی مسئلے انسان کو پریشان کرتے ہیں، ایک ملازمت اور دوسرا ازدواج، میری تو دونوں مرادیں ایک ساتھ ہی پوری ہوگئی تھیں۔ کوئی غم و تفرقہ نہیں رہا تھا۔ اس لیے میں خوب کھاتا اور مزے سے جینے لگا تھا۔ بیماریاں تو اڑن چھو ہوگئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرا وزن ۷۲ر کلو سے ۹۰ کلو تک بڑھ گیا۔ اس حالت پر ایک کشمیری کہاوت صادق آتی ہے: نُن نزین نہء بزازِ وان، بوچھ نزین نہ وازء وان (ننگے کو کپڑے کی دُکان پر مت لیجاؤ اور بھوکے کو دعوت پر مت لیجاؤ)۔ اکیڈمی میں رات کو وقتاً فوقتاً پارٹیاں بھی ہوتی تھیں جن میں آدابِ محفل اور میز پر کھانے کے طور طریق سکھائے جاتے تھے۔ انگریز تو ہندوستان سے سن سینتالیس میں چلے گئے تھے مگر ان کے چھوڑے ہوئے فرسودہ رسوم و رواج ہم کو ابھی بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اکیڈمی میں سبھی مقامات، دھرموں اور موسموں کے اہم تیوہار منائے جاتے تھے۔ رات کو ہم کلڑی بازار وغیرہ گھوم کر آتے تھے اور کبھی کبھار میں ہیک منز ہوٹل میں کیبرے دیکھنے جاتا تھا۔ کورس کے درمیان اکیڈمی ہمیں گروہوں میں بانٹ کر دیہاتوں، سرحدی علاقوں اور پہاڑی علاقوں سے واقفیت کرانے کے لیے ٹور کا انتظام کرتی۔

اکیڈیمی میں میں نے فارم پر اپنا مشغلہ ’آرٹ اور پینٹنگ‘ لکھا تھا۔ جنم اشٹمی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتفاقاً میری ملاقات سیوائے کیمپس کے ہیڈ کلرک شیام لال سے چارلِول لیڈیز بلاک کے عین سامنے ہوئی۔ اس نے پوچھا ”آپ یہاں پینٹنگ کرنے کیوں نہیں آتے؟“ لیڈیز بلاک میں اسٹیج کے لیے ایک جہازی پینٹنگ بنائی جا رہی تھی جو سٹیج کے پیچھے پورے پردے کو ڈھک لیتی۔ دس بارہ طلبہ چھوٹے چھوٹے برش لے کر آئیل کلرس سے پینٹنگ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جونہی میری نظر ان پر پڑی تو میرے منہ سے بے تحاشہ نکل پڑا۔ ”سٹیج کے لیے اس طرح پینٹنگ تھوڑے ہی بنائی جاتی ہیں۔ یہ کوئی مستقل رکھنے والی چیز تو ہے نہیں اور پھر اتنا وقت بھی کہاں ہے ان کے پاس۔“ شیام لال ڈائریکٹر کی بیوی کو، جو اس انتظام کی نگراں تھیں، خوش کرنے کے لیے اس کے پاس گیا اور اس کو میرے تاثرات جس کے تس سنائے۔ وہ خود اس حوالے سے پریشان تھیں کیونکہ دو دن کے بعد جنم اشٹمی تھی۔ انڈین ریونیو سروس کی مشہور کتھک رقاصہ پدم شری شوونا نرائن کو ڈانس کرنا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ ڈائریکٹر کی بیٹی کو رادھا کا کردار نبھانا تھا۔ ڈائریکٹر کی بیوی نے مجھے بلا کر پوچھ لیا۔ ”تم کسی اور طریقے سے جلدی بنا سکتے ہو۔“ ”میڈیم، یہ تو ڈسٹمپر کلرس سے بنتی ہے اور اس کے لیے برش کے بدلے کوچیاں استعمال ہوتی ہیں۔ ورنہ تو کئی روز لگ جائیں گے۔“ بولنے کو تو میں بول گیا مگر یہ خیال نہ آیا کہ مجھے تو اس بارے میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ خیر یہ ذمے داری مجھے دی گئی اور میں نے ڈسٹمپر کے دو تین رنگوں کے پیکٹ اور دو ڈھائی انچ کے برش اور تین چار کوچیاں منگوائیں۔ جب سامان آیا تو میں نے دوسرے طلبہ کو ہدایت دی کہ کیسے کام کر سکتے ہیں مگر انھیں، خاص کر آئی اے ایس والوں کو، میرا دخل در معقولات گوارا نہ ہوا۔ ایک ایک کر کے سب بھاگ گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ جب مال آ گیا تو نیلا رنگ بہت پھیکا سا لگ رہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ڈسٹمپر میں گہرا نیلا رنگ بازار میں کہیں ملتا ہی نہیں۔ میں شیام لال اور اپنی قسمت کو کوسنے لگا مگر سر اوکھلی میں دیا تھا تو موسلوں کا کیا ڈر۔ بدقسمتی سے بارش جم کر برس رہی تھی اور پینٹ سوکھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے نیل کے دو پیکٹ منگوائے اور نیلے رنگ کے ساتھ ملا دیے۔ پھر خیال آیا کہ نیل تو کپڑوں کو سفید بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو ہلکا نیلا رنگ ہے وہ بھی سوکھ کر اڑ جائے۔ مگر میرے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا اس لیے جوکھم اٹھا لیا۔ پھر کینواس کو دیوار کے

سہارے ترچھا رکھ کر اس کے پیچھے تین برقی ہیٹر رکھوا دیے۔ اس کے بعد کوچیوں سے دیوانہ وار سٹروک مارتا چلا گیا۔ سامنے سے ایک آئی آر ایس کی طالبہ، پاروتی کرشنا مورتی اپنے کمرے سے باہر نکلی اور مجھے دیر تک دیکھتی رہی۔ گیہواں رنگ، غلافی دعوت دے رہی آنکھیں اور سڈول بدن۔ میں ٹی شرٹ اور نکر پہنا ہوا تھا اور سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس نے پاس ہی دُکان سے کچھ پکوڑے لائے، اپنے کمرے میں جا کر جلدی سے دو کپ کافی بنائے اور پھر دونوں کافی پینے لگے۔ میرے جسم میں حرارت سی پھیل گئی۔ کافی پیتے پیتے وہ تعریفوں کے پُل باندھتی رہی جس کے سبب میرے برش میں عجیب سی توانائی پیدا ہوئی یہاں تک کہ دو گھنٹے کے بعد پینٹنگ تیار ہو گئی۔ ایک خوبصورت حسینہ اس طرح ایک آرٹسٹ کی تشویق وتحریک (Inspiration) بن سکتی ہے اس کا احساس مجھے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جمنا ندی میں طغیانی آئی ہوئی ہے، ندی کا پانی برسات کے سبب ملگجا ہو گیا ہے، اوپر آسمان کو بادلوں نے ڈھک لیا ہے اور اب بادل کسی بھی لمحے ٹوٹ کر برس پڑیں گے۔ دو دن کے بعد شوونا نرائن نے واسُدیو کا کردار نبھایا جو جمنا ندی کے بیچوں بیچ سے ٹوکری میں کرشن گوپال کو سر پر اٹھائے پار لے گیا۔ سب لوگ اس کے ڈانس پر تالیاں بجا رہے تھے۔ میں صرف اپنی پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا اور فخر محسوس کرتا ہوا خود سے پوچھ رہا تھا ”کیا یہ پینٹنگ تم نے بنائی ہے....؟“ بعد میں پاروتی کے بارے میں سنا کہ جنسی معاملات میں وہ کافی آزاد خیال تھی، مجھے بھی اس نے اپنے ساتھ دہلی چلنے کی ایک بار دعوت دی تھی مگر درمیانی مدت کے امتحانات کے مدنظر میں نے انکار کر لیا جس وجہ سے دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔ کئی برسوں بعد پاروتی کے ایک رفیق کار سے معلوم ہوا کہ وہ جوانی ہی میں دنیا کو خیر باد کہہ گئی تھی۔ مذکورہ پینٹنگ کے علاوہ میں نے ایک اور پینٹنگ ’تمل نائٹ‘ فنکشن کے لیے بنائی جس میں دراوڑ کلچر کے گوپورم (مندر کا عالیشان صدر دروازہ جس پر سیکڑوں دیوی دیوتاؤں کے مجسمے نقش کیے ہوتے ہیں) کی تصویر بنائی گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے کیمرہ سے اس کی رنگین تصویر کھینچی تھی۔ بعد میں مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ تصویر میں نے بنائی ہے۔ اس کو دیکھ کر میرے کورس ڈائریکٹر چندر شیکھر صاحب بہت ہی خوش ہوئے، اس لیے میں نے گوپورم والے مرکزی حصے کو کاٹ کر اور اس پر وارنش چڑھا کر ڈائریکٹر صاحب کو بھینٹ کر لی۔

چنانچہ میں نے یو پی میں فیلڈ ٹریننگ کرنے کی درخواست دی تھی اس لیے لکھنؤ سرکل آفس میں

رپورٹ کرنا پڑا۔ لکھنؤ کا انتخاب ایک تو اس لیے کیا کہ وہاں میری سسرال تھی اور میری بیوی ایم اے کی تعلیم مکمل کر سکتی تھی، دوسرے وہاں پر شمس الرحمٰن فاروقی سے ملاقات ہو جاتی اور اردو افسانہ نگاری میں مزید رہنمائی مل جاتی۔ لکھنؤ میں دو تلخ تجربے ہوئے۔ ایک تجربہ بادشاہ نگر میں ہوا جہاں ہم گراونڈ فلور پر رہتے تھے اور کچن باہر تھا۔ کھانا زمین پر چٹائی ڈال کر کھالیا کرتے تھے کہ ہم کشمیریوں کی عادت ہی اس طرح چار زانو بیٹھ کر کھانا کھانے کی ہے۔ کھانا کھا کر میں کمرے کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا جہاں بجلی جل رہی تھی۔ سامنے ایک کنڈلی مارے زہریلے سانپ پر نظر پڑی۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے، اس سے بھی زیادہ مجھے بینا کی فکر ہونے لگی کہ کہیں سن کر وہ بے ہوش نہ ہو جائے پھر سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے ہمت کر کے اس کو بڑے آرام سے اٹھایا اور سانپ کے بارے میں آگاہ کیا۔ مگر وہ تو بہت ہمت والی ثابت ہوئی، کہنے لگی ''میرے پتا جی کے پوجا کمرے میں ہر روز سانپ آیا کرتا تھا۔'' پھر ایک ڈنڈا لے کر اس کو بھگانے کے لیے اندر چلی گئی۔ دودھ بھی سامنے رکھا مگر سانپ نے دودھ نہیں پیا۔ پھر دھیرے دھیرے کھسک کر جونہی وہ فرش کے پاس پہنچا تو یہ جا اور وہ جا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ کہاں غائب ہو گیا مگر رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ چارپائی باہر صحن میں ڈلوا دی اور رات کو تارے گنتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان سے بہت سارے سانپ میرے اوپر گر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں مجھے وہاں سے شفٹ ہونا پڑا۔ بہت عرصہ بعد جب میں متھرا آرمی میس کا باغ بنانے میں جٹ گیا اور وہاں پھلواڑی کے علاوہ امرود، کینو اور جامن کے پیڑ لگوا رہا تھا تو سانپوں کی کئی بانبیوں سے واسطہ پڑ گیا اور آہستہ آہستہ میرا یہ خوف کچھ حد تک زائل ہوتا رہا۔

اب کی بار میں نے مہانگر میں دوسری منزل پر فلیٹ لے لیا تاکہ پھر کبھی ایسا حادثہ نہ ہو۔ ہم جس فلیٹ میں رہتے تھے وہاں گراونڈ فلور پر ایک اور بنگالی کرائے پر رہتا تھا جس کی ساس لکھنؤ کے ہسپتال میں نرس تھی۔ انھوں نے میری بیوی کے ساتھ جھگڑا کر لیا اور پولیس تھانے میں رپورٹ لکھوائی مگر میری اہلیہ بھی کیا کم تھی، اپنی سہیلی کے بھائی سے کہہ کر پولیس والوں ہی سے ان لوگوں کی ٹھکائی کروائی۔ پھر بھی میں ان لوگوں کے ردِعمل سے ڈرتا رہا اس لیے وہاں سے بھی شفٹ کر لیا۔

پروبیشن کے دنوں میں یو پی کے بہت سارے علاقے دیکھ لیے۔ لکھنؤ، کانپور، فتح پور،

بارابنکی، نینی تال وغیرہ۔ بڑا اچھا تجربہ رہا۔ اٹاوہ میں آر ایم ایس کی تربیت کے سلسلے میں ریلوے پلیٹ فارم پر ایک ٹرین آ رہی تھی جس کی چھت پر سیکڑوں لوگ بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان گر کر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے آر ایم ایس کی گاڑی منگوائی اور اس کو ہسپتال پہنچوایا۔ ڈاکٹر علاج کرنے سے کترا رہا تھا کیونکہ پولیس رپورٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر ڈاکٹر کو دکھایا اور وہ مریض کا علاج کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بعد میں محکمے کے کسی آدمی نے مجھے بتایا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پہلی بار مجھے یہ معلوم ہوا کہ قانون کے سامنے انسان کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔

فتح پور میں پوسٹ ماسٹری کی تربیت لی۔ وہاں تیس بتیس مچھواروں کے گھر تھے جو مچھلی پکڑ کر روزانہ کولکتہ بھیجتے تھے۔ چونکہ ان پڑھ تھے اس لیے وہاں سے انشورڈ پوسٹ کے ذریعے مچھلیوں کی بکری کا روپیہ منگواتے تھے۔ روزانہ تقریباً چھ سو روپے فی گھر آتے تھے یعنی تیس گھروں کے لیے اٹھارہ ہزار روپے۔ پوسٹ آفس ڈیلیوری سٹاف نے اس پر اپنا کمیشن باندھ رکھا تھا۔ دس فیصد...! مطلب دن کی کمائی اٹھارہ سو کی بنتی تھی جو وہ آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ ایک روز قریباً پچیس سالہ تیز طرار دبلی پتلی عورت میرے پاس اس بارے میں شکایت لے کر آئی۔ میں نے کیس کی تفتیش کر لی اور سبھی متعلقہ ملازمین کو وہاں سے تبادلہ کر دیا۔ ان کا سرغنہ ودیا بابو تھا جس کی دو بیویاں تھیں ایک مقامی اور ایک کیرالہ کی، اس نے پہلے تو حکم عدولی کرنے کی بہت کوشش کی مگر جب میں نے کثیر الازدواجی پر اس کو چارج شیٹ دینے کی بات کہی تو وہ ایل ٹی سی لے کر کیرالہ بھاگ گیا۔ ایک اور بابو شیام بہاری نے ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی ناؤ موڑ لی۔ اس کو کلچرل سرگرمیوں میں بہت دلچسپی تھی اور ڈاک ہفتے میں اس نے کافی مدد کی۔ ڈاک ہفتے کے دوران ہم نے کئی پروگرام کیے جس میں وہاں کے ڈی سی، سی ایم او وغیرہ کو بلایا۔ کئی سکولوں کے بچوں نے بھی پروگراموں میں شرکت کی مگر جس دن ڈی سی کو بلایا گیا تھا اس دن ڈرامہ ہونا تھا۔ ڈرامہ میں ایک عورت کا رول تھا جس کے لیے ایک زنخے کو کانپور سے بلایا گیا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ سبھی لوگ پریشان ہو گئے۔ شیام بابو نے مجھے کان میں یہ خبر دی۔ میں نے اسے پوچھا کہ کوئی متبادل بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک پیشہ ور ایکٹر کہہ رہا ہے کہ مجھے سکرپٹ پڑھنے میں آدھا گھنٹہ چاہیے اور پرومپٹنگ سے میں یہ رول نبھا سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ جاؤ اس کو کہو تیار ہو جائے اور خود سٹیج پر چڑھ کر مائیک پکڑ لی اور فلم مغل اعظم میں اکبر،

جودھا بھائی اور شہزادہ سلیم کے درمیان ہوئے ڈائیلاگ سنانے لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے مغل اعظم کبھی دیکھی ہی نہ تھی البتہ جس ڈرامہ کلب کے ساتھ میں کچھ وقت کے لیے جڑا تھا وہاں ایک دوست کبھی کبھی پرتھوی راج کے سٹائل میں یہ مکالمے سنایا کرتا تھا۔ آدھے گھنٹے بھر میں ناظرین کا دل بہلاتا رہا جب تک کہ ڈرامہ پارٹی تیار ہوئی اور پروگرام کامیابی سے چل پڑا۔ فتح پور ہیڈ پوسٹ آفس کے ملازم میرے بعد بھی ہر سال پروگرام مناتے تھے اور مجھے بلاناغہ دعوت بھیجا کرتے تھے۔

پوسٹ آفس کی حالت دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی صفائی کی جائے۔ پھر کیا تھا سنیچر اور اتوار کو سارے ملازمین صفائی میں جٹ گئے۔ میز کرسیاں، الماریاں سب کچھ باہر نکالے، پھر کاغذات میں جو بکنے والے تھے وہ الگ نکالے اور جو بیچنے لائق نہیں تھے ان کو نذر آتش کرلیا۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ اس کارروائی سے پہلے ہر کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ یہ چیز بھی ضروری ہے اور وہ چیز بھی ضروری ہے مگر جب الاؤ سامنے دکھائی دیا تو سیونگ بنک کی پرانی لیجریں بھی اس الاؤ میں ایسے پھینکی گئیں جیسے یگیہ کرتے ہوئے آگ میں گھی اور دوسری سامگری ڈالی جاتی ہیں۔ انجام کار جس ڈاکخانے میں پہلے تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی وہاں اب مزید چار پانچ بابوؤں کے بیٹھنے کی جگہ نکل آئی۔

فتح پور میں میری رہائش میں کچھ مقامی شعرا اور ادیب بھی آتے تھے۔ وہیں پر میری جان پہچان معروف شاعر ظفر اقبال ظفر اور آصف نعیم، جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے فارسی شعبے کا پروفیسر بن گیا، سے ہوئی۔ ان سے رابطہ اب تک قائم ہے۔ ایک مہینے کے بعد میری بیوی بھی فتح پور چلی آئی۔ میرے ساتھ ایک کلاس فور رہتا تھا جو گھر میں کھانا بنانے میں میری مدد کرتا تھا۔ نام تھا رام اوتار۔ دیکھنے میں سیدھا سادا مٹی کا مادھو لگتا تھا جسے کسی چیز کی سمجھ نہ ہو۔ جس روز میری بیوی کو آنا تھا، اتفاق سے اسی روز میں نے وِلز فلٹر کے بجائے بغیر فلٹر کے پانامہ سگریٹ منگوائے۔ شام کو رام اوتار نے میری بیوی سے پوچھ لیا۔ ''ماتا جی، کیا صاحب آپ سے ڈرتے ہیں؟'' میری بیوی نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔ وہ اور مجھ سے ڈریں! مگر تم نے ایسا کیوں پوچھا؟'' رام اوتار نے جواب دیا۔ ''ماتا جی، صاحب جی تو کل تک وِلز فلٹر سگریٹ پیتے تھے مگر آج انھوں نے سستے پانامہ سگریٹ منگوائے۔'' میری بیوی نے جب یہ بات مجھے بتائی تو میں آگے سے بہت چوکنا ہو گیا کہ ماتحت ملازم ہماری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی بڑے غور سے دیکھتے ہیں۔

رخصت کے وقت ہم فتح پور ڈاکخانے سے اسٹیشن جانے کے لیے تانگے پر سوار ہوئے۔ پیچھے پیچھے بہت دور تک ڈاکخانے کے ملازم ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے جس کے سبب میری بیوی بھی جذباتی ہوگئی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دو مہینوں میں اتنی نزدیکیاں پیدا ہونا میرے گماں میں بھی نہ تھا۔

فتح پور اور کانپور کی ٹریننگ کے دوران مجھے اپنے ساڑھو، سی ایل گنجو کے ساتھ کافی قربت رہی۔ گو مجھے کمپنی حصص (Shares) کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ معلوم تھا مگر عملی طور پر خرید و فروخت کا علم نہ تھا۔ چونکہ گنجو صاحب بنک میں نوکری کرتے تھے اور شیئرس کا لین دین کرتے تھے، میں نے ان سے کافی کچھ سیکھ لیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ اس ایریا میں میرے رہنما بن گئے۔ اس کے بعد میں نے اس بارے میں بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کیا اور خود بھی شیئرس کی خرید وفروخت کرنے لگا مگر میری دلچسپی زیادہ علمی تھی نہ کہ عملی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میرے ابتدائی شیئرس اچھوتے نکلے جیسے ہندستان لیور، کوٹس انڈیا، ریلائنس وغیرہ۔ اس کامیابی کے باعث مجھے کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں اس کام میں سنجیدگی سے منہمک ہوگیا۔

پروبیشن کا ایک اور پڑاو نینی تال تھا جہاں میں نے اسسٹنٹ سپرانٹینڈنٹ کی ٹریننگ لی۔ اس علاقے کے لوگ نرم دل، سادہ لوح اور مہمان نواز ہیں۔ پہاڑی لوگ ویسے بھی فطرتا خوش طبع، خوش دل اور خوش خلق ہوتے ہیں۔ وہ مدنی پیچیدگیوں سے نابلد ہوتے ہیں۔ نینی تال میں ریاستی سرکار کی طرف سے سیاحوں کے لیے ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں یوپی کے چیف منسٹر رام نریش یادو کو بطور خصوصی مہمان بلایا گیا تھا۔ ان کے خطاب سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس بات میں فرق نہیں کر سکتے کہ کس جگہ پر کیسے لیکچر دینا چاہیے۔ دل میں خیال آیا کہ بندہ اس کرسی کے لائق نہیں ہے۔ بقول کسے۔ آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر، خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ میرا اندازہ صحیح نکلا، انھیں کچھ مہینوں بعد ہی کرسی چھوڑنا پڑی۔ ہال میں میں پہلی قطار میں بیٹھا ہوا تھا اور میری ساتھ میرا ماتحت ایک پوسٹل انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کسی سکول کی پانچ دس لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں جن کے ساتھ نظر بازی میں مزہ آرہا تھا۔ ان میں سے ایک تو مجھ کو مسلسل دیکھ رہی تھی اور پھر مسکرا رہی تھی۔ ماتحت کی وجہ سے مجھے بہت احتیاط برتنا

پڑی۔ جاتے وقت میں چپ چاپ ہال سے باہر نکل کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ دوسرے روز میں مال روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے وہی لڑکیاں چلی آ رہی تھیں۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست تھا۔ پانچوں لڑکیاں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور سڑک پار کر کے مجھ سے ملنے چلی آئیں۔ من کے لڈو پھوٹنے لگے کہ چلو کل کی محنت ضائع نہیں ہوئی۔ وہ لڑکی، جو ہال میں بار بار میری جانب دیکھ رہی تھی، نزدیک آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ’’ہائے انکل، آپ کیسے ہیں؟‘‘ میرے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی سولہ سترہ برس کی لڑکی نے مجھے انکل کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ اتنی بڑی لڑکی کو میں انکل کیونکر نظر آیا۔ مجبور ہو کر جواب دیا۔ ’’بس ٹھیک ہوں، آپ لوگ یہاں کیسے؟‘‘ ’’ہم یہیں مقامی سکول میں بارہویں میں پڑھتی ہیں۔ آپ کو کل دیکھا اور بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا مگر آپ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ آپ تو بڑے ہینڈسم ہیں۔‘‘ میں نے شکریہ ادا کیا۔ ’’تھینکس، میں یہاں ٹریننگ پر آیا ہوں اور دوسرے مہینے واپس چلا جاؤں گا۔‘‘ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ’’ہم بھی اس سال یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، گڈ بائی انکل۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’گڈ بائی۔‘‘ پھر میں تیز تیز قدم اٹھا کر آگے چل دیا مگر دل آگے جانے کو مانتا ہی نہ تھا۔ اس لیے الٹے قدموں اپنی رہائش کی طرف مڑ گیا۔ اندر آتے ہی میرا پہلا کام تھا ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہونا اور یہ دیکھنا کہ مجھ میں ایسی کونسی تبدیلی آئی ہے کہ اس لڑکی نے مجھے انکل کہہ دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں نے چند مہینے پہلے شادی کی تھی مگر شکل وصورت میں کوئی فرق تو نہیں پڑا تھا۔ آئینے میں میں ہر زاویئے سے ابھی کنوارا ہی لگ رہا تھا۔ آخرش میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ تو میں کہتا ہوں مگر لڑکیوں کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں، ان کی چھٹی حس بتلاتی ہے کہ سامنے والا شخص انکل ہے یا کزن۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن میں نے سب سے زیادہ ٹائم آئینے کے سامنے بتایا اور اپنے آپ کو مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔

نینی تال کی بدولت کاشی پور بھی جانا پڑا جہاں میرے ایک کزن پردمن خشو، جو ایسکارٹ فارمز میں ملازم تھے، سے ملاقات ہوئی۔ ان کی بیوی نینی تال کی تھی اور بہت ہی مخلص، گرمجوش اور شفقت آمیز عورت تھیں۔ ان کے ساتھ گزارے دو دن اب بھی یاد آتے ہیں۔ نینی تال ہی میں ایک کشمیری، وید پرکاش کاؤ سے ملاقات ہوگئی جو دوستی میں بدل گئی۔ شام کو دونوں مال روڈ پر سیر کرنے نکلتے تھے۔ ایک روز

دو چار لڑکیاں دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔ بڑے مست موڈ میں تھیں۔ کسی نے ہائے ہینڈسم کہہ کر ہاتھ ہلایا۔ میں نے چپ چاپ سڑک پار کر لی اور اس کے کندھے پر بازو رکھ کر کہنے لگا۔ ''یس پریٹی گرل!'' یہ تو اس کے گماں میں بھی نہ تھا۔ خیر پھر ہم باتیں کرتے ہوئے بہت دور تک چلے گئے اور اس لڑکی کے ساتھ میں نے اپنے ایڈریس کا تبادلہ کیا۔ نام تھا جوری لہکار اور وہ تیج پور کی رہنے والی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میری اس کے ساتھ پھر کبھی ملاقات ہوگی، اس لیے خط و کتابت میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ تعجب کی بات یہ رہی کہ میری دوسری فوجی ڈویژنل پوسٹنگ ٹینگا ویلی ہوئی اور تیج پور آسام میں کور ہیڈ کوارٹر تھا۔ تیج پور میں میرا آسامی افسر مقیم تھا جس کی وساطت سے میں جوری کو ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اور اس کے والدین سبھی تپاک سے ملے اور انھوں نے رخصت ہوتے سمئے مجھے روایتی 'گموسا'، جو سفید سوتی گلوبند جیسا ہوتا ہے اور جس پر لال بارڈر بنا ہوتا ہے، تحفے میں دیا۔ میں نے ان کے گھر میں وہ کرگہ بھی دیکھا جس پر انھوں نے گموسا بنایا تھا۔ جوری کے ساتھ اچھا رابطہ قائم ہوا اور اس میں کوئی بری نیت نہیں تھی۔ میرا دوسرا بیٹا تیج پور ہسپتال میں پیدا ہوا۔ اس لیے بہت دنوں تک تیج پور میں رہنا پڑا۔ بیوی ہسپتال میں تھی جہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے میں کبھی کبھار جوری کے گھر چلا جاتا۔ اس کے گھر والے میری بہت عزت کرتے تھے۔ مگر کسی ماتحت نے میری بیوی کے کان بھر دیے اور وہ جھگڑا کرنے جوری کے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد جوری نے کبھی بھی اپنی صورت نہ دکھائی۔

پروبیشن کے دوران ایک اور تجربہ ہوا جس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری بیوی کشمیر میں بی ایڈ کرنے گئی تھی اس لیے میں چاہتا تھا کہ میری پوسٹنگ بھی وہیں ہو جائے حالانکہ کئی خیر خواہ افسروں نے مجھے مشورہ دیا کہ گھر کے ڈویژن میں پوسٹنگ لینا خودکشی کے مترادف ہے۔ میں ڈائریکٹوریٹ میں پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر روی پرکاش اور پھر ڈائریکٹر سکلکلے سے ملا۔ دونوں نے منع کر دیا۔ اس کے بعد میں سیکشن سپروائزر جنگ سے ملا، اس کو اپنی پرابلم سمجھائی اور اس نے بھروسہ دلایا کہ دو تین دن میں میرا پوسٹنگ آرڈر ایشو ہو جائے گا۔ ہوا بھی ویسا ہی۔ جو کام بڑے افسروں سے نہ ہو سکا وہ ایک سیکشن سپروائزر نے کر دکھایا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ ایڈمنسٹریشن کا یہ پہلا سبق تھا جو مجھے مل گیا۔ مسوری میں ٹریننگ کے دوران کسی نے لیکچر میں کہا بھی تھا کہ ہندوستانی افسر شاہی میں ایسٹبلشمنٹ (Establishment) اور

سٹاف کلرک بہت اہم کردار نبھاتے ہیں۔ میرے ایک ماتحت بھی کہتے تھے کہ ہندوستان میں بیوروکریسی (Bureaucracy) نہیں بلکہ کلرکوکریسی (Clerkocracy) چلتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یا تو افسروں اور کلرکوں کی ملی بھگت ہوتی ہے یا پھر افسر کام چور ہوتا ہے اور کلرک کے کام پر نظر نہیں رکھتا ہے۔

پہلی پوسٹنگ کشمیر میں ہوئی۔ گھر والے بہت خوش ہوئے مگر چارج لینے سے ایک دن پہلے ہی اہلیہ نے پہلی منزل سے چھلانگ مار کر اپنی ٹانگیں توڑ دیں جس کی وجہ سے بہت کرکری ہوئی۔ کشمیر ڈویژن ان دنوں بہت بڑا ہوتا تھا۔ اننت ناگ، سرینگر، بارہمولہ، کرگل اور لداخ سب اسی ڈویژن میں شامل تھے۔ میرے جاتے جاتے وہ تین ڈویژنوں میں تقسیم ہوا۔ سردیوں میں لداخ میں شدید ٹھنڈ پڑ جاتی ہے، پارہ منفی ۴۰ ڈگری تک گر جاتا ہے، اس کی وجہ سے وہاں کے لیے ہر سال تعیناتی کرنا پڑتی تھی اور یہ کارروائی ستمبر میں راستے بند ہونے سے پہلے ہی مکمل کرنا ضروری ہوتی تھی۔ مجھ سے پہلے جو افسر تھا اس نے جولائی تک کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس لیے مجھے جلد بازی میں فیصلے لینے پڑے، اِدھر جواں خون رگوں میں دوڑ رہا تھا، میں نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر کرپشن ختم کرنے کی غرض سے تکونے ٹرانسفر کیے جس کے سبب نہ صرف تعداد بڑھ گئی بلکہ یونین والوں کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ ان میں وہ سب لوگ تھے جو کنہیا لال موزہ، جو پہلے پوسٹ ماسٹر تھا مگر حال ہی میں ڈائریکٹوریٹ میں بحیثیت جنرل سیکریٹری، نیشنل فیڈریشن آف پوسٹل ایمپلائیز کے فارین سروس پر چلا گیا تھا، کے حمایتی تھے اور اس کی جیب گرم کرتے رہتے تھے۔ اس سے مجھے پروبیشن کے دوران ایک بار ملاقات ہوئی تھی کیونکہ ان دنوں وہ میرے گھر کے نزدیک مہاراج گنج ڈاک خانے کا پوسٹ ماسٹر تھا۔ میں ڈاک خانے میں جان پہچان والوں کو یہ خوش خبر سنانے گیا کہ میری تقرری ڈاک محکمے میں ہوگئی ہے لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ میں پوسٹ ماسٹر سے ملوں۔ ایک لڑکی نے موزہ کو خبر دی، میں نے ہیلو کہا، ہاتھ ملایا اور اس کے روبرو کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی شیخی بگھارنے لگا۔ اپنے مرتبے کے بارے میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے لگا اور یہاں تک کہنے لگا کہ یونین کا جنرل سیکریٹری ہونے کے ناتے میں ڈائریکٹر جنرل محکمہ ڈاک کے برابر ہوں۔ مجھے اس کی یہ باتیں ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ دریں اثنا اس نے وِلز نیوی کٹ سگریٹ کا پیکٹ ہاتھ میں اٹھایا اور

مجھے پینے کے لیے پیش کیا۔ خوش اخلاقی کا تقاضا یہ تھا کہ افسر ہونے کے ناتے اسے میرے سامنے سگریٹ نہیں پینا چاہیے تھا۔ شاید اس نے ایسا فعل اس غرض سے کیا کہ مجھے میری اوقات بتا دے۔ اس دن اتفاق سے میری جیب میں چار مینار سگریٹ کی ڈبیا پڑی تھی جس کو صرف نشہ خور ہی پیتے تھے اور بھاری تمباکو ہونے کے سبب عام لوگ پینے سے کتراتے تھے۔ میں نے جیب سے اپنا برانڈ نکالا اور اس کو پیش کیا۔

”نہیں آپ پی لیجیے۔ میں اتنے ہلکے سگریٹ نہیں پیتا۔ ہمارے علاقے میں بچے بھی ایسے سگریٹ نہیں پیتے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ بھی آج اس چُرٹ کا مزہ لیں۔“ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا، شاید اس کو میرے اس فعل کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔ پھر کچھ ڈاک محکمے کی باتیں ہوئیں۔ مارکسی یونین لیڈر ہونے کے سبب وہ کمیونزم کی راگ الاپنے لگا مگر اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ مجھے بھی طالب علمی کے زمانے میں کمیونزم کے کیڑے نے کاٹا تھا۔ سال بھر کے بعد جب میں نے کشمیر ڈویژن کا چارج لیا تو دونوں کی ٹھن گئی۔ وہ دہلی میں بیٹھا کشمیر کی پوسٹل یونین کی باگ ڈور ہاتھ میں لیے تھا اور میں یہاں کے ڈویژن کا ہیڈ تھا۔ ٹرانسفروں کے معاملے میں تینوں یونینیں این ایف پی ای، ایف این پی او اور بھارتیہ یونین ایک جٹ ہو گئیں اور کئی دن تک ہڑتال پر رہیں۔ مجھے لداخ ٹور سے فوراً واپس آنا پڑا۔ سرکل کی پوسٹ ماسٹر جنرل کمل ورما تھیں جو اصل میں ناتجربہ کار جونیئر ڈائریکٹر تھیں مگر کوئی سینئر افسر نہ ملنے کے سبب قائم مقامی کر رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کے سرکل میں کوئی تنازعہ کھڑا ہو اور اعلیٰ افسر اس کو نااہل قرار دیں حالانکہ سارا مسئلہ اس کی بدانتظامی اور راشی افسروں کو امان دینے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی میرے خلاف ہو گئیں۔ ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس کا میں نے ترکی بہ ترکی جواب اس طرح دیا کہ سارا قصور اس کے سر پر مڑھ لیا۔ ڈائریکٹوریٹ سے ایک ٹیم انکوائری کرنے کے لیے آئی، انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا کہ ڈویژن میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے صرف تبدیلیوں پر سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے۔ اُدھر موزہ منسٹر کے پاس چلا گیا اور مجھ سے جواب مانگا گیا۔ میں نے جواب میں کوئی فروتنی نہیں دکھائی بلکہ اپنی تبدیلی اینڈمان اور نکوبار تک کرنے کی پیشکش کی۔ موزہ ہار گیا اور آخر کار مجھ سے ملنے میرے دفتر چلا آیا اور پھر کشمیری پنڈت کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت دیر تک چائے پر باتیں ہوئیں۔ پھر کہنے لگا۔ ”سر، آپ ابھی نوجوان ہیں۔ کیریئر میں یہی ایک وقت ملتا ہے کچھ کمانے کے لیے۔ آپ یہ زریں وقت کیوں

گنواتے ہیں؟'' سوال کچھ بالراست سا تھا۔ میں نے بھی راستی ہی سے جواب دینا مناسب سمجھا۔ ''کتنی کمائی ہوسکتی ہے سال بھر میں؟'' اس نے جواب دیا۔ ''یہی کوئی بیس تیس ہزار۔'' میں نے پھر کہا۔ ''آپ کو اس وقت دہلی میں گورنمنٹ کا مکان ملا ہوا ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ اپنے مکان کو چھ مہینے کے لیے مجھے دے دیجیے۔ میں وہاں سے کال گرلز سپلائی کرنے کا دھندا کرلوں گا۔ چھ مہینے کے بعد آپ کو تیس ہزار دوں گا اور خود تیس ہزار رکھ لوں گا۔ کہیے منظور ہے؟'' گفتگو ایسا موڑ لے گی اس کو گماں بھی نہ تھا۔ اس نے موضوع بدل دیا اور اس دن کے بعد کبھی مجھ سے رشوت کے بارے میں بات نہیں کی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اس نے مجھے بالواسطہ طور پر رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ موزہ نے مہاراج گنج کا ڈاک خانہ شفٹ کرنے کے لیے کسی مالک مکان سے بات کی تھی اور اس کو اچھا کرایہ دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس بارے میں اس نے پی ایم جی پر کافی دباؤ ڈال دیا مگر میں نے انکار کرلیا۔ چونکہ میرے پتا جی لائف انشورنس ایجنٹ تھے اس لیے انھیں یہ لالچ دی گئی کہ آپ اپنے بیٹے سے اس بارے میں سفارش کرلیں اور اگر وہ مان جاتے ہیں تو آپ کو دس لاکھ روپے کی انشورنس پالیسی دی جائے گی۔ پتا جی مجھے بخوبی جانتے تھے اور اس بات سے بھی واقف تھے کہ میں پرانی ملازمت سے کیوں بھاگا تھا، اس لیے انکار کرلیا۔ اپنے گھر کے نزدیک ہی مجھے ایک خالی پلاٹ پر نظر تھی جو میں نے پی ایم جی کو دکھایا اور اسے التماس کی کہ اسے کسی بھی طریقے سے سرکاری تحویل میں لے کر اس پر ڈاکخانہ بنوا دیں کیونکہ مہاراج گنج عرف سری رنبیر گنج ٹریفک کے حساب سے سرینگر میں جی پی او کے بعد دوسرے نمبر پر تھا۔ چونکہ کمل ورما کے شیخ محمد عبداللہ سے اچھے مراسم تھے انھوں نے یہ پلاٹ ڈاکخانے کے نام کروا دیا مگر یہ بات جب محلے میں پھیل گئی تو وہاں کے بسکینوں نے طرح طرح کی اڑچنیں ڈال دیں۔ کبھی اس کو کمیونٹی کی زمین کہہ دیا، کبھی قبرستان کا بورڈ چڑھا دیا اور کبھی یہ کہا کہ اس سے ہماری بہو بیٹیوں کی پرائیویسی میں خلل پڑے گی۔ معاملہ بہت برس تک یونہی لٹکا رہا لیکن کنٹریکٹر نے کچھ سرمایہ خرچ کرکے وہاں کے غنڈوں کا منہ بند کردیا اور اس طرح مہاراج گنج کے ڈاکخانے کی عمارت تیار ہوگئی۔ افسوس کہ وہاں ملی ٹینسی کے دوران کئی بار بم پھٹ گئے۔

مولوی فاروق صاحب سے بھی اس حوالے سے واسطہ پڑ گیا۔ جامع مسجد میں ہمارا ڈاکخانہ ایک گندے اور تاریک دُکان میں کام کر رہا تھا اور یونینوں کے اصرار پر میرے پیش رو نے اس کو بدلنے کی

کوشش کی تھی مگر کرایہ زیادہ ہونے کے سبب بات کہیں نہیں بنتی تھی۔ میں یونین کے ایک لیڈر کو ساتھ لے کر مولوی صاحب کے دفتر چلا گیا۔ ان کے دفتر میں جانے سے پہلے خیال آیا کہ کہیں یونین والوں کو میری اور مولوی صاحب کی باہمی جانکاری کے متعلق معلوم نہ ہو کیونکہ وہ اس کو بعد میں میرے خلاف استعمال بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے اندر جاتے ہی ان کو خبردار کر دیا کہ میں بحثیت سینئر سپرانٹنڈنٹ کے آیا ہوں۔ دونوں محتاط ہو کر گفتگو کرنے لگے اور مولوی صاحب نے بہت ہی سستے کرائے پر وہ جگہ ڈاکخانے کے لیے دے دی جو انھوں نے اپنے دفتر کے لیے مختص کی تھی۔ بہت عرصہ بعد انھوں نے کسی بی پی ایم کی اپوائنٹ منٹ کے بارے میں فون کیا مگر میں نے معذرت کا اظہار کیا۔

سفارش کے بارے میں ایک اور قصہ یاد آیا۔ میں اننت ناگ صدر ڈاکخانے کا انسپکشن کرنے جا رہا تھا کہ راستے میں قریب دس بجے کھنہ بل کا ڈاکخانہ بند پایا جب کہ کھولنے کا وقت نو بجے تھا۔ میں نے سب پوسٹ ماسٹر کو سسپنڈ کر دیا جس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ سب پوسٹ ماسٹر اور اس کا والد صراف صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ صراف صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ ''دیپک جی آپ نے کل کھنہ بل میں کسی پوسٹ ماسٹر کو سسپنڈ کیا ہے، ان کے پتا جی نیشنل کانفرنس کے بہت ہی مخلص کارکن اور قوم پرست ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے سسپنشن آرڈر پر نظر ثانی کر لو۔'' پہلے تو میں ٹھٹھکا مگر پھر حوصلہ کر کے جواب دیا۔ ''ٹوٹھا جی، مجھے ایسا کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے مگر اس میں ایک پرابلم ہے۔ میں نے آپ کو اپنا آدرش مان کر آپ کے اصولوں کو اپنایا ہے اور آپ کے مجسمے کو پوجتا رہا ہوں۔ اگر میں یہ کام کروں تو مجھے ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کی کتھنی اور کرنی میں فرق ہے اور وہ مجسمہ مسمار ہو جائے گا۔ ورنہ اس مجسمے کو ویسے ہی کھڑے رہنے دیجیے اور قانون کو اپنا کام کرنے دیجیے۔'' وہ خاموش ہو گئے اور پہلی فرصت میں جب میں ان سے ملا تو کہنے لگے کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے تم جیسے جیالے پیدا کیے ہیں۔ میں نے ایمپوریم کی نوکری کے دوران زندگی سے مایوس ہو کر کئی بار ان کے بتائے ہوئے اصولوں سے روگردانی کرنے کی کوشش کی مگر بعد میں میرا ضمیر مجھ کو کچوکتا رہا۔ اس لیے میں نے آئی پی ایس جوائن کرتے ہی قسم کھا لی کہ اب میں ایمانداری سے کام کروں گا اور تمام عمر اس پر کاربند رہا۔ دراصل طالب علمی کے زمانے میں ریڈرس ڈائجسٹ میں ایک قول پڑھا تھا کہ ''وقت کے ساتھ بدلتے رہو جب تک ایسے مقام پر پہنچ جاؤ کہ وقت کو بدل سکو۔''

(Change with the times till you are influential enough to change the times)۔ ہندوستان میں جس قدر رشوت خوری اور کنبہ پروری عام ہو چکی ہے لگتا ہے کہ آج نہ کل یہ نظام بوسیدہ عمارت کی طرح ڈھ جائے گا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرتشی لوگ، خاص کر بیوروکریٹ، اس نظام کو چلتے دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اگر یہ نظام یک لخت ٹوٹ جائے گا تو ان کا خود اپنا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ حیاتیات میں کئی ایسے میزبان خور طفیلیوں (Parastoids) کا ذکر ہے جو اپنے میزبان کو کھوکھلا کر کے مار دیتے ہیں جس کے ساتھ وہ خود بھی نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ یہی ڈر ان کو ہمیشہ کھائے جاتا ہے۔

مطلق دیانت داری کا بہت بڑا سبق مجھے اپنے ایک ماتحت سے ملا۔ نام تھا ایم ایل ہنڈو۔ وہ میرے دفتر میں ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ تھا۔ کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ نہ ڈاک خانے کے ملازم اور نہ ہی یونین کے اراکین۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ہر چیز میں مین میکھ نکالتا تھا۔ ملازموں کی عادت تھی کہ وہ فرضی میڈیکل بلیں پیش کرتے تھے مگر وہ انھیں روک لیتا تھا اور اکثر بلوں کو سی ایم او کے پاس تصدیق کے لیے بھیج دیتا تھا۔ اس سے پہلے اننت ناگ صدر ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر رہا تھا جہاں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے تھے اور انتظامیہ کو اسے ٹرانسفر کرنا پڑا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ جب کبھی برانچ آفسوں میں انسپکشن کرنے جاتا تھا تو اپنے ساتھ چنے لے کر جاتا تھا اور اسی پر گزارا کرتا تھا، کبھی کسی برانچ آفس میں چائے بھی نہیں پیتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ منہ پھٹ آدمی تھا، افسروں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ فروری کا مہینہ تھا کہ سوپور سب ڈویژن کا انسپکٹر مجھ سے دفتر میں ملا اور کہنے لگا۔ ''سر، کچھ روز پہلے پوسٹ ماسٹر جنرل نے بانڈی پور گریز لائن کے رنر ہٹس کا معائنہ کیا اور ان کی خستہ حالت دیکھ کر مجھے خود ہی ایک ایک کر کے ان ہٹس کی مرمت کروانے کا حکم دیا۔ اس لیے پہلی سرائے (ہٹ) کے یہ نو ہزار کے بل لے کر آیا ہوں۔ میں نے ڈی ایس پی ہنڈو کو بلوایا اور اس کے سامنے بل رکھ دیے۔ اس نے انسپکٹر پر ایسے نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو تم تو پیدائشی چور اچکے ہو تم پر کیا بھروسہ کریں۔ سوال کیا۔ ''پی ایم جی کا آرڈر کہاں ہے؟'' انسپکٹر بولا۔ ''سر میڈم نے تو زبانی آرڈر دیا تھا۔'' ہنڈو بولا۔ ''زبانی آرڈر نہیں چلتا ہے، جا کر سرکل آفس سے لکھوا کر لاؤ۔'' ان کی آپس میں کافی بحث ہو گئی، میں نے انسپکٹر کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور ہنڈو

سے کہا۔ ''ہنڈو صاحب، فروری کا مہینہ ہے، مارچ میں پی ایم جی میرا سالانہ کانفیڈنشل رپورٹ لکھے گی، اس وقت نبھالو اور بل کسی بھی طریقے سے پاس کرلو۔ مگر وہ تو مانا ہی نہیں، اونچی آواز میں بولنے لگا۔ ''سر یہ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ فراڈ ہو رہا ہے، یہ تو غلط کام ہے۔'' میں نے کہا، ''اچھا ایسا کرلو، آپ ایک نوٹ ٹائپ کروالو اور خود دستخط مت کرو۔'' وہ تو اور بھی بھڑک گیا۔ ''سر، میں اس غلط کام کے ساتھ کسی بھی صورت میں وابستہ نہیں ہونا چاہتا۔ سر، آپ مجھے سسپنڈ کردو، نوکری سے نکال دو مگر میں یہ کام نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے بات کاٹ لی، انسپکٹر کو بلایا اور اس کو ہدایت دی کہ وہ اپنے ہی آفس سے بلوں پر ایک فارورڈنگ لیٹر نتھی کر کے اور پی ایم جی کا حوالہ دے کر ہمارے دفتر بھیج دے۔ جب اس کی چٹھی آئی تو میں نے بل پاس کرلیا اور ساتھ ہی آرڈر کی کاپی پی ایم جی کو اطلاعاً منسلک کردی کہ یہ منظوری ان کے زبانی حکم کے مطابق دی جارہی ہے۔ پی ایم جی نے نہ ہاں کی اور نہ ناں۔ اٹھارہ برس بعد جب میں پوسٹل سٹاف کالج میں پڑھاتا تھا تو مجھے حیرانی ہوئی کہ میری یہ کارروائی ضابطے کے تحت صحیح تھی۔ تاہم ڈی ایس پی ایم ایل ہنڈو نے اپنے کردار سے مجھے اتنا تو سمجھا دیا کہ لاچاری میں بھی غلط کام نہیں کرنا چاہیے چاہے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ایسا ہی ایک قصہ اس وقت پیش آیا جب میں ڈائریکٹر پی ایل آئی تھا مگر اس سیکھ نے بہت مدد کی۔ ایک اور واقع یاد آیا۔ میں نے کوئی آرڈر انجانے میں ایشو کیا جو ضابطے کے مطابق نہیں تھا۔ جب معلوم ہوا تو اپنے ماتحت کو بلایا اور کہا کہ دوسرا فرضی آرڈر ایشو کردو تاکہ یہ آرڈر صحیح لگے۔ اس کا جواب تھا کہ یہ الجبرا نہیں ہے، یہاں مائنس اور مائنس پلس نہیں ہوتا۔ دو غلط کام ایک صحیح کام نہیں بن سکتا (Two worngs don't make a right)۔ اس کی یہ رائے بھی میں نے مستقبل کے لیے گانٹھ باندھ کر رکھ دی۔ قسمت اچھی تھی کہ اس غلطی کی کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔

مارچ مہینے نے دستک دی اور میں اپنے مستقبل کے لیے فکر مند ہو گیا۔ اسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل، چڈھا صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ پی ایم جی تم سے بہت ناراض ہے اور وہ تمھارا سالانہ خفیہ رپورٹ خراب کرنے والی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم اس سے معافی مانگ لو اور معاملہ رفع دفع کرلو۔ یہ بات اس نے پی ایم جی کی شہ پر ہی کہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''سر، میرا قصور تو بتائیں۔ آپ خود اس ڈویژن کے ہیڈ رہے ہیں، وہاں کے حالات سے آشنا ہیں۔ اتنا تو آپ اندازاً بتا سکتے ہیں کہ میرے آنے سے پہلے اور

اس وقت ڈویژن میں ایمان داری میں کچھ فرق آچکا ہے یا نہیں؟'' انھوں نے کہا ''ہاں فرق تو آیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ایمان داری معکوس طور پر کارگزاری سے نسبت رکھتی ہے(Honesty is inversely proportional to efficiency)۔ اگر میرے ہوتے ہوئے کارکردگی میں کچھ کوتاہی آ گئی ہوگی تو وہ اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں کی بالائی آمدنی بند ہوگئی ہے۔'' وہ خاموش ہوگیا اور پی ایم جی سے ٹیلیفون پر رابطہ کر کے کہنے لگا کہ دیپک یہاں دفتر میں آیا ہوا ہے، اس کو آپ کے پاس بھیج دوں کیا؟ اس نے بھیجنے کو کہا اور میں پی ایم جی کے پاس چلا گیا۔ اس نے آتے ہی ایک لمبی چوڑی تقریر کی، اپنے دل کے پھپھوڑے پھوڑ دیے اور بات بات میں کہنے لگی کہ ''کشمیریوں کو جب تک سر پر ہتھوڑے نہیں مارو گے تب تک وہ سیدھے نہیں ہو جاتے۔'' انھوں نے تو یہ بات میرے سٹاف کے بارے میں کہی تھی مگر وہ بھول گئی کہ میں بھی کشمیری ہوں۔ خیر گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں نکلا، میں معافی مانگنے کو تیار ہی نہ تھا اس لیے اٹھ کر چل دیا۔ صرف جاتے جاتے اتنا کہہ دیا۔ ''میڈم، یہ کشمیریوں پر ہتھوڑے مارنے کا کام مجھ پر نہ آزمانا، آپ بہت پچھتائیں گی۔''

کشمیر ڈویژن میں کام کرنے کے دوران مجھے دو حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک حادثہ تب ہوا جب میں بارہمولہ سے کشمیر آرہا تھا۔ پٹن کے پاس میری جیپ دوسری گاڑی سے ٹکرائی اور جیپ کے ڈیش بورڈ کا ہینڈل میرے سینے میں گھس گیا۔ میں نے ہمت کر کے ایک جاتی ہوئی ٹرک کو ہاتھ دیا اور اس میں چڑھ گیا۔ ساتھ میں دو اور رفیق کار تھے۔ بیوی تو ناراض ہو کر ہسپتال میں تھی اور اس کے ساتھ رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے میں اپنی چھوٹی بہن کے ہاں بال گارڈن چلا گیا اور اس کو اپنے حادثے کی خبر دی۔ وہاں خوش قسمتی سے میری بڑی بہن بھی موجود تھی، دونوں نے مجھے پاس ہی صدر ہسپتال پہنچایا جہاں پر ایکس رے اتارے گئے اور مجھے رات بھر آرام اور مشاہدے کے لیے رکھا گیا۔ دو نرسیں رات بھر میری تیمارداری میں جُٹ گئیں، اس لیے نہیں کہ وہ اپنا فرض نبھا رہی تھیں بلکہ اس لیے کہ ان کو خوبصورت مرغا مل گیا تھا۔ ڈاکٹر نے صبح سویرے ایکس رے کی رپورٹ دیکھ لی جس میں کسی طرح کی پیچیدگی نظر نہیں آرہی تھی اس لیے مجھے ڈسچارج کر لیا۔ دونوں نرسوں کے منہ لٹک کر رہ گئے۔ گھر پہنچ کر میں مسلسل درد کے مارے تڑپتا رہا۔ اسی اثنا میں ایک ماتحت پوسٹل اسسٹنٹ، جس کی تبدیلی شدید بیماری کے سبب کچھ عرصہ قبل

میں نے بنا کسی سفارش کے روکی تھی، میری عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ مجھے درد سے تڑپتا دیکھ کو اس سے رہا نہ گیا، ٹیکسی منگوائی اور اپنے کسی رشتے دار کے ایکس رے کلنک پر لے گیا اور کئی زاویوں سے ایکس رے کھنچوائے۔ معلوم ہوا کہ میرے سینے کی تین پسلیاں افقی سمت میں ٹوٹ چکی ہیں مگر مکمل طور پر نہیں ورنہ سیدھی دل میں گھس جاتیں اور میں اسی دم راہ عدم کا راہی بن چکا ہوتا۔ پوسٹل اسسٹنٹ ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر عشائی کو میرے گھر لے آیا اور اس نے میرا علاج گھر پر ہی کیا۔ اس طرح میں بارہ دنوں کے اندر ہی صحتیاب ہو گیا۔ گو میں نے ہر جگہ اپنی جیب سے خرچ کیا تھا تاہم اس کی نوازش کو بھلا نہیں پایا۔ ان دنوں میری رضائی میں سے ایک عجیب سی کپڑے میں لپٹی ہوئی چوکور چیز برآمد ہوئی جو خون میں لت پت تھی۔ میں نے اپنی پوپھی کو چپکے سے دکھائی، وہ بہت ہی متین عورت تھی، اس جادو ٹونکے کو اٹھا لیا اور چپ چاپ جہلم دریا میں بہا کر آ گئی۔ واپسی پر میری رضائی بھی صاف کر لی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ ٹوٹکا کس نے رکھا تھا آج تک پتا نہیں چلا۔ دوسرا حادثہ اس وقت ہوا جب پاکستان میں بھٹو کو پھانسی دی گئی اور مشتعل بھیڑ نے ہفت شر مال کے آس پاس جماعت اسلامیوں کے گھر جلائے تھے۔ ہم سرکاری جیپ میں جا رہے تھے کہ ڈرائیور نے گاڑی راستے میں کھڑی کر دی اور پیچھے سے ایک ٹرک نے اسے ٹکر مار دی۔ میں اس وقت گاڑی میں چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے گھٹنے میں زبردست چوٹ آئی۔ میرا ڈی ایس پی ایم ایل ہنڈو بھی اس وقت پیچھے بیٹھا ہوا تھا مگر اس کو کوئی چوٹ نہیں آئی۔ ڈرائیور راج محمد، ایم ایل ہنڈو اور میں تینوں بال بال بچ گئے۔ کچھ برس بعد ڈرائیور راج محمد اور ڈی ایس پی ایم ایل ہنڈو دونوں ہارٹ اٹیک کے سبب سورگباش ہو گئے۔

پوسٹ ماسٹر جنرل اور میرے درمیان رسہ کشی نے سارے ڈویژن کا ماحول آلودہ کر دیا تھا۔ ہر کوئی جو مجھ سے خوش نہیں تھا ان کے پاس فریاد لے کر چلا جاتا اور میرے خلاف جو جی میں آتا بول دیتا تھا۔ اس میں دو یونین لیڈر کے ایل موزہ اور این سی بالی پیش پیش تھے۔ انھوں نے میرے خلاف کیا کیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے۔ کبھی سٹرائک، کبھی اعلیٰ افسروں کے پاس دہائی دینے چلے گئے یہاں تک کہ منسٹر کے پاس بھی فریاد لے کر چلے گئے۔ کسی عورت کو میری پوپھی بنا کر مٹھائی کا ڈبہ لے کر اس وقت گھر بھیج دیا جب میں خود دفتر میں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔ دراصل میری ایک پوپھی سورگباش

ہوگئی تھی اور پوپھا نے دوسری شادی کرلی تھی، اس لیے رشتہ زیادہ ہی نازک ہوگیا تھا۔ میری بیوی نے دفتر ٹیلی فون کیا کیونکہ اس کو اس رشتے کی خبر نہیں تھی۔ نام سن کر میں نے حامی بھرلی۔ چائے وغیرہ پی کر جاتے جاتے اس نے تحفے کے طور پر میری بیوی کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھمادیا۔ میری بیوی نے ڈبہ کھول کر اس کے اندر نوٹوں کا بنڈل دیکھ لیا۔ وہ گھبرا گئی۔ عورت جلدی جلدی نکلنے لگی مگر بینا نے ہمت دکھا کر اس کا تعاقب کیا اور جب اس نے ایک نہ مانی تو ڈبہ اٹھا کر اس کی طرف سڑک پر پھینک دیا جس کی وجہ سے وہ اٹھانے کے لیے مجبور ہوگئی۔ واپسی پر ٹیمپو میں دو پولیس والے اس پر طنز کرنے لگے کہ اتنا چھوٹا سا کام بھی نہ کرسکی۔ گفتگو کے دوران سارا ماجرا کھل گیا اور میرا نام بھی کئی بار لیا گیا۔ اسی ٹیمپو میں بینا کی ایک سہیلی سفر کررہی تھی، جس نے دوسرے دن اس کو سارا قصہ سنادیا۔ میری بیوی اور میں سن کر پریشان ہوگئے۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوگیا، تھوڑی سی ہوشیاری سے عزت بچ گئی۔ یہ سارا کھیل کسی یونین لیڈر یا راشی ملازم کا پولیس سے مل کر رچایا ہوا تھا تا کہ مجھ کو رشوت خور ثابت کیا جائے۔ بالکل فلمی سین دہرایا گیا۔ ان دنوں جموں وکشمیر میں اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑنے کا کافی چلن تھا۔

نیشنل یونین کا سرکل سیکریٹری این سی بالی جب بھی مجھے ملتا تھا تو کہتا تھا کہ میں آپ کو اپنے بیٹے کی طرح مانتا ہوں۔ بزرگ تھا اس لیے میرا ردِ عمل ہمیشہ خاموشی ہوتا تھا۔ مگر قریباً بیس بائیس سال بعد ایک روز میں نے اسے روک لیا اور کہا ”ایسی بات کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ کم سے کم آپ کا آچار آپ کے وچاروں کا ساتھ نہیں دیتا۔“ پھر میں نے ایک ایک کر کے اس کے وہ سارے کرتوت گنائے جو اس نے ماضی میں مجھے زک پہنچانے کے لیے انجام دیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا صرف اتنا کہہ کر بوجھل قدموں سے باہر نکلا۔ ”مجھے نہیں معلوم آپ کے دل میں میرے تئیں اتنی نفرت بھری پڑی ہے۔“ میں اس کو عمر کے اس پڑاؤ پر شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس روز میں جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ اس کی دوشاخہ شخصیت کو میں کبھی برداشت نہیں کرسکا، ایک طرف وید، بھگوت گیتا اور ہندو فلسفے کی باتیں کرتا تھا، دوسری طرف ہر اس چورا چکے ملازم کو اپنی یونین میں شامل کرتا جو کسی فراڈ میں ملوث ہوتا اور اس کے کیس کی پیروی کرتا۔ بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ اس یونین کا گروپ ڈی لیڈر بھی کچھ کم نہ تھا اور اس کو بھی ایسا ہی کچھ سنانا پڑا۔ کے ایل

موزہ اور این سی بالی کے برعکس بھارتیہ یونین کا سیکریٹری ڈی پی کول بہت ہی شریف، سادہ لوح اور دیانت دار آدمی تھا۔

کمل ورما کی شیخ محمد عبداللہ سے اچھی بنتی تھی۔ بہت تیز طرار خاتون تھیں۔ نہرو پارک پوسٹ آفس میں ڈاک ٹکٹ کا اجرا ہونے والا تھا کہ ہاؤس بوٹ کی رنگائی کا مسئلہ آن پڑا۔ میں نے خود اس کام کی نگرانی کر کے بہت ہی کم قیمت پر وہ کام کروایا اور سوچ رہا تھا کہ پوسٹ ماسٹر جنرل اس بات سے خوش ہوں گی مگر اس نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ پھر تبادلوں اور لیبر ریلیشنز کا مسئلہ بھی تو تھا۔ اس لیے وہ میرے کام سے کبھی مطمئن نہیں ہوئیں۔ میری بیوی بھی ان سے مل کر آئی تھیں جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اسی دوران جموں و کشمیر فلیٹلِک اگزبشن (KASHPEX) کا انعقاد کشمیر میں پہلی بار ہوا۔ میں نے اس نمائش کو کامیاب بنانے کے لیے کافی یوگدان دیا مگر جب ٹورسٹ سینٹر میں اختتامی پروگرام ہوا تو مجھے نظر انداز کر دیا گیا۔ سامنے ڈائس پر کمل ورما شیخ محمد عبداللہ اور ان کی بیگم کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں اور میں دروازے کے پاس ناظرین کے درمیان کھڑا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر (اے پی ایم) مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سر آپ وہاں کیوں نہیں بیٹھتے، یہاں کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جب کسی نے بلایا ہی نہیں تو زبردستی چلا جاؤں کیا؟“ وہ ماضی میں ایس ایس پی کا پی اے رہا تھا اور اس نے کئی جید افسروں کو دیکھا تھا اس لیے لمبا بھاشن دیتا رہا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ”بھائی، عزت کرسی کی ہوتی ہے۔ میری طرف سے کھلا چلینج ہے کہ ڈائس پر بیٹھے کسی آدمی سے کہہ دو کہ کرن نگر میں میری کرسی پر بیٹھ جائے اور احکام پاس کرے، تب آپ کی بات مان جاؤں گا۔“ وہ کچھ بول نہ سکا۔ بہر حال کبھی زندگی بھی اپنے کھیل دکھاتی ہے۔ کچھ روز بعد اسی اے پی ایم کی جی پی او میں ایک انگریز خاتون سے تو تو میں میں ہوئی اور اس خاتون نے پہلے پوسٹ ماسٹر اور پھر پوسٹ ماسٹر جنرل سے اس کی شکایت کی۔ پی ایم جی نے پوسٹ ماسٹر کو زبانی حکم دیا کہ اس کا تبادلہ بارہمولہ کر دو اور آج ہی ریلیو کر دو۔ اے پی ایم دوڑا بھاگا میرے پاس چلا آیا، اپنی رام کہانی سنائی، میں نے طنزاً کہا، ”میرے پاس کیوں آئے ہو، ان لوگوں کے پاس جاؤ جو صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں ہوتا ہی کون ہوں۔“ وہ بہت پشیمان تھا اور بہت منت سماجت کرنے لگا۔ آخر کار مجھے ترس آیا اور میں نے اسے کہا۔ ”تم جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور کوئی کچھ کہے

اسے صرف یہ کہہ دو کہ مجھے اپوائنٹنگ اتھارٹی کا آرڈر چاہیے۔ اطمینان رکھو، جب تک یہ دروازے پر کھڑا عام سا آدمی یہاں اس کرسی پر بیٹھا ہے، تمھارا ٹرانسفر آرڈر کوئی نہیں نکال سکتا ہے۔“ اور پھر ویسا ہی ہوا۔ نہ پی ایم جی کی چلی اور نہ اس کے پیچھے، پوسٹ ماسٹر کی چلی۔

انہی دنوں دہلی سے ایم ایل گیند، ممبر پوسٹل ڈیولپمنٹ آئے۔ وہ امرناتھ جانا چاہتے تھے۔ چھلانگ لگانے کے سبب میری بیوی کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور پلستر چڑھا ہوا تھا۔ لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں اننت ناگ کے راشی انسپکٹر کو ان کے ہمراہ بھیج دوں تو ہوسکتا ہے کہ وہ راستے میں میرے خلاف اس کے کان بھر دے۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ کر خود ہی چلا گیا۔ دونوں خچروں پر جا رہے تھے۔ راستے میں میں نے محکمہ ڈاک میں سُدھار لانے کے لیے کچھ تجاویز پیش کیں جو انھیں پسند آئیں۔ پھر انھیں مقامی نباتات کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ دلچسپی سے سنتے رہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ملحد ہوں اور صرف ان کی وجہ سے امرناتھ جا رہا ہوں۔ راستے میں وہ ایک عورت کو غور سے دیکھتے رہے جو اس شدید ٹھنڈ میں ایک ہلکی سی ساری پہنے پیدل چلی جا رہی تھی اور جگہ جگہ پھول اکٹھے کر رہی تھی۔ جب وہ امرناتھ کی گپھا کے پاس پہنچی تو اس کے منہ سے زبردست چیخ نکل پڑی۔ ”امر کبوتروں کی جوڑی...! دھنیہ ہو، بھگوان جی کے درشن ہو گئے۔“ روایت یوں ہے کہ جب شِو جی پاروتی کو اپنی امر کتھا سنا رہا تھا تو دو کبوتر ہمہ تن گوش تھے اور وہ امر ہو گئے اور اب اسی گپھا کے آس پاس نظر آتے ہیں۔ گیند صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”دیکھا دیپک، آستھا کیا ہوتی ہے۔ وہ عورت جو راستے بھر بھگوان کو چڑھانے کے لیے پھول جمع کرتی رہی، اسے سب سے پہلے امر کبوتروں کے درشن ہو گئے۔“ میں بھی کون سا چپ رہنے والا تھا۔ میں تاک میں رہا اور پھر گیند صاحب کو کم سے کم ایک سو کبوتر اور بیس پچیس کوّے گنوائے اور پھر کہا اب بتائیے کہ ان میں سے امر جوڑی کون سی ہے؟ درشن کر کے ہم لوٹ آئے۔ شیش ناگ کے پاس کچھ لوگ کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ نیچے جھیل میں چھ سر والا سانپ تیر رہا ہے۔ گیند صاحب نے اپنی دوربین نکالی اور دیکھنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ یقین انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ گیند صاحب بھی کہنے لگے کہ وہ دیکھو سانپ چل رہا ہے۔ میں نے ان سے دوربین مانگی اور دیکھنے لگا۔ مجھے کوئی سانپ نظر نہیں آیا۔ انھوں نے پوچھا ”کیوں دیکھا نا شیش ناگ؟“ میں نے تُرت جواب دیا۔ ”سر، اگر آپ بحیثیت ممبر پوچھ رہے ہیں تو ضرور ہے اور

اگر بحیثیت ہم سفر پوچھ رہے ہیں تو قطعی نہیں ہے۔ شاید آپ نے 'ایمپریرس نیو کلودس' (Emperor's New Clothes) کہانی پڑھی ہوگی بس وہی حال سمجھیے۔'' میں نے وہ کہانی دسویں میں پڑھی تھی۔ ایک شہنشاہ کے پاس دو جعلساز آدمی جلاہے بن کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سونے کی تار سے ایسے کپڑے بناتے ہیں جن سے آپ کی شخصیت نکھر جائے گی اور بے نظیر بن جائے گی۔ اس لباس کی خوبی یہ ہوگی کہ صرف ان لوگوں کو دکھائی دے گا جنھوں نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی ہو۔ جلاہوں سے جتنا ہوسکا شہنشاہ کا خزانہ لوٹ لیا اور پھر ایک دن کمرے میں شہنشاہ کے کپڑے اتارے اور ان کے بدن پر یوں دونوں ہاتھ پھیر لیے جیسے کپڑے پہنا رہے ہوں جبکہ ان کے پاس پہنانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ شہنشاہ کو یہ تو محسوس ہوا کہ وہ ننگا ہے مگر اس ڈر سے کہ کوئی اسے رشوت خور نہ کہے، کچھ بول نہیں پایا۔ دربار میں درباریوں کا بھی یہی حال رہا، سب جان کر بھی انجان بنے رہے۔ پھر شہنشاہ کو شہر بھر میں جلوس کی صورت میں گھمایا گیا۔ جو دیکھ رہا تھا اس کو شہنشاہ ننگا تو لگ رہا تھا مگر سچ بولنے کی ہمت کون جٹاتا۔ تماشائیوں میں ماں کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو شہنشاہ کو دیکھتے ہی چلایا کہ شہنشاہ تو ننگا ہے۔ پھر چہ مہ گوئیاں شروع ہوئیں۔ شہنشاہ سوچنے لگا کہ اس عمر کا کمسن بچہ رشوت خور کیسے ہوسکتا ہے، اس نے تو سچ بولا ہے۔ دراصل باقی سب لوگ اور خود شہنشاہ بھی خوف سے ایسا کہنے سے پرہیز کر رہے تھے۔ انجام کار دونوں جلاہوں کو پکڑ لیا گیا اور سزا دی گئی۔ گیند صاحب ہنس دیے اور کہنے لگے ''تم کو قائل کرنا مشکل ہے۔'' خیر گیند صاحب سفر سے کافی محظوظ ہوئے۔ جاتے وقت ان کو ایک قالین خریدنے کا شوق ہوا۔ کمل ورما انھیں بلیوارڈ پر رمضانا کارپیٹس کے پاس لے گئیں۔ قالین پسند کیا گیا اور قیمت چار ہزار طے ہوئی۔ وہ ہم کو دکان پر چھوڑ کر چلی گئیں۔ چونکہ پی ایم جی اور میرے درمیان ہوا صاف نہ تھی، اس لیے میں نے موقع کا فائدہ اٹھالیا اور کشمیری زبان میں دُکان کے مالک سے، جو مجھے اچھی طرح سے جانتا تھا، قیمت کم کرنے کی درخواست کی۔ وہ تین ہزار میں راضی ہوگیا جس پر گیند صاحب بہت خوش ہوئے۔ پھر بولے کہ قالین کو پیک کروا کے کسی انسپکٹر کے ہاتھ دہلی بھجوا دینا۔ میں نے روکا اور کہا ''سر، قالین کے پیچھے آپ دستخط کیجیے۔'' پوچھنے لگے کیوں؟ میں نے سرگوشی میں کہا کہ دکاندار کا کیا بھروسا، کہیں کوئی اور چیز بھیج دے۔ وہ راضی ہوگئے، قالین کی پشت پر دستخط کرلیا اور قالین کو پیک کروانے کے لیے انسپکٹر کو وہاں چھوڑ کر ہم دونوں چلے

آئے۔ ہفتے بھر کے بعد جب انسپکٹر قالین لے کر دہلی پہنچا تو گیند صاحب نے قالین لینے سے انکار کیا۔ کہنے لگے: ''یہ وہ قالین نہیں ہے جو میں نے پسند کیا تھا۔'' اس نے فوراً پی ایم جی کو ٹیلیفون کیا۔ پی ایم جی کو تو بہانے کی تلاش تھی، مجھ پر ٹیلی فون پر برس پڑی۔ مگر میں بھی کون سی کچی گولیاں کھیلا تھا، میں نے براہ راست ممبر سے بات کرنے کی اجازت مانگی۔ لائٹنگ کال سے رابطہ کیا اور گیند صاحب نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے مودبانہ گزارش کی کہ وہ قالین کو باہر لے جا کر سورج کی روشنی میں دیکھ لیں اور الگ الگ زاویوں سے نظر ڈالیں کیوں کہ مصنوعی روشنی اور تانے بانے کے باعث ظاہری صورت میں بہت فرق پڑتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد پھر ٹیلی فون آیا اور وہ کہنے لگے۔ ''دیپک، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ قالین بدل چکا ہے۔ جو میں نے پسند کیا تھا یہ وہ نہیں ہے۔'' وہ بہت دیر تک مجھے بہت کچھ سناتا رہا۔ میں تعلیق کے لمحات کو طول دے کر محظوظ ہو رہا تھا اور من ہی من میں ہنس رہا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ قالین وہی ہے جو انھوں نے پسند کیا تھا۔ آخر میں میں نے جواب دیا۔ ''سر، اگر آپ کو یاد ہوگا، آپ نے اس قالین کی پشت پر اپنے دستخط کیے تھے۔ آپ اپنے دستخط تو دیکھ سکتے ہیں۔'' اس نے قالین کو الٹ کر دیکھ لیا اور اپنے دستخط پہچان لیے۔ دوبارہ ٹیلیفون کیا اور کہنے لگے۔ ''بُدکی، آئی ایم ویری ساری، میں نے تمھیں بہت ہراساں کیا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سر، کوئی بات نہیں، ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ مگر آج ایک بات بتا تا چلوں کہ اس دن آپ نے پوچھا تھا کہ تم اس پر میرے دستخط کیوں لے رہے ہو اور میں نے جواب دیا تھا کہ دکاندار کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا مگر حقیقت یہ ہے کہ گاہک کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا، اس لیے ایسا قدم اٹھانا پڑتا ہے۔'' میں نے یہ بات بچپن میں اپنے پتا جی سے دُکان پر سیکھی تھی۔

گیند صاحب جب سرینگر میں تھے ان کا پرائیوٹ سیکریٹری پریم ناتھ ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور کہیں جا نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میری گاڑی لے کر جاؤ اور مغل گارڈن دیکھ کر آ جاؤ۔ وہ بہت خوش ہوا اور اپنے باس سے اجازت لے کر چلا گیا۔ رات کو گھر پر گاڑی لے کر آیا۔ میں ڈنر کر رہا تھا سو اس کو بھی ڈنر کرایا۔ میری بیوی کے ہاتھ سے کھایا ہوا لذیذ کھانا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ خوش ہو کر وہ اپنے گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔

گیند صاحب اور اس کے پرائیویٹ سیکریٹری پریم ناتھ سے شناسائی کسی کام آئے گی، ایسا تو خواب وخیال میں بھی سوچا نہ تھا۔ پریم ناتھ جب دہلی پہنچا تو لنچ ٹائم پر دوسرے پرائیوٹ سیکریٹریوں کے سامنے میری تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ ان میں سے ایک کشمیری پنڈت آر ایل مٹو تھا۔ اس نے اپنے کسی رشتے دار کے ٹرانسفر کے لیے ٹیلی فون پر بات کی۔ اتفاق سے اس کی تبادلے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس طرح وہ بھی بہت خوش ہو گیا۔ سال کے اختتام پر جب میری سالانہ خفیہ رپورٹ بھیج دی گئی تو ممبر ایڈمنسٹریشن کا پی ایس میری رپورٹ میں منفی اندراجات دیکھ کر چونک گیا۔ چنانچہ ان پر ممبر کے تصدیقی دستخط ضروری ہوتے ہیں، اس لیے پی ایس نے میرے رپورٹ کے بارے میں اپنے سکھ افسر سے کہا ''اس افسر کی رپورٹ خراب کر دی گئی ہے۔'' جواب ملا۔ ''افسر ایسا ہی ہوگا کہ رپورٹ خراب کر دی گئی۔ پی ایس نے کہا۔ ''سر یہ رپورٹ مسز کمل ورما نے لکھی ہے، آپ تو اس کے بارے میں جانتے ہی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ممبر ڈیولپمنٹ سے اس بارے میں پوچھ لیں، وہ گزشتہ برس کشمیر ٹور پر گئے تھے۔'' پی ایس نے دلجیت سنگھ، ممبر ایڈمنسٹریشن کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ پی ایم جی کمل ورما کو، جو سردارنی تھی اور مونا سے شادی کر چکی تھی، بالکل پسند نہیں کرتا ہے۔ ممبر ایڈمنسٹریشن نے ممبر ڈیولپمنٹ سے بات کر لی۔ گیند صاحب نے میری تعریفوں کے پل باندھ دیے اور کہا کہ یہ افسر آگے جا کر محکمے کا نام روشن کر لے گا۔ اس پر ممبر ایڈمنسٹریشن نے میرے خفیہ رپورٹ پر لکھی منفی رپورٹ کو رد کر دیا اور بہت ہی اچھی مثبت رپورٹ لکھ دی۔ انجام کار میں بچ گیا اور اس کارروائی میں پی ایس کا سب سے بڑا رول رہا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ مجھے ساتھ ہی خبردار بھی کیا گیا کہ میں وہاں سے خود کو ٹرانسفر کروالوں۔ میں نے آرمی پوسٹل سروسز کے لیے فارم بھرا ہی تھا اس لیے اس کی فوری طور پر پیروی کر کے فوج میں چلا گیا۔ میں سرینگر ڈویژن میں جولائی ۱۹۷۸ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۹ء تک کام کرتا رہا۔

☆☆☆

فوج کے ساتھ چند سال

فوج میں بھرتی ہونے کے لیے مختلف جسمانی ٹیسٹ لیے جاتے ہیں اور جو کوئی فوج کے پیمانوں پر کھرا نہیں اترتا اسے نامنظور کیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ صرف ایک دشواری پڑ رہی تھی اور وہ تھی میرا موٹاپا۔ اس وقت میرا وزن ۹۵/کلو تھا جب کہ میرے قد کے حساب سے وہ ۸۰/کلو سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سرینگر بیس ہسپتال میں میں نے نرسنگ اسسٹنٹ سے التجا کی کہ آرمی پوسٹل سروسز میں پیمانوں کی اتنی فکر نہیں کی جاتی ہے، اس لیے پانچ دس کلو کم لکھ دو تا کہ میں کسی طرح نکل جاؤں، وہاں پر تو وزن کم ہو ہی جائے گا۔ اس نے جوکھم اٹھا کر ۸۵/کلوگرام لکھ دیا۔ جب معاملہ آخری مرحلے پر پہنچا تو سرجن سپیشلسٹ، کرنل گاندھی کا سامنا ہوا جس کا دستخط ہونا باقی تھا۔ اس کی ڈھیل ڈول بالکل میرے جیسے تھی۔ کہنے لگے۔ ''تمہارا وزن ۸۵/کلو کیسے ہوسکتا ہے؟ میرا خود ۹۵/کلو ہے، تم کسی بھی صورت میں مجھ سے کم نہیں ہو۔'' میں نے سچائی قبول کرنے میں کوئی دیر نہیں کی۔ ''سر، دراصل میں ۹۵/کلو ہی ہوں مگر میں نے نرسنگ اسسٹنٹ سے درخواست کی کہ آرمی پوسٹل سروس میں پیمانوں کی سختی سے پابندی نہیں ہوتی، اس کو کم لکھ دو کیونکہ میرا وزن وہاں جا کر ہر روز کی جسمانی ورزش سے خود ہی کم ہو جائے گا۔ یہاں رہ کر تو عمر بھر کم نہیں ہوگا۔'' وہ میری صاف گوئی سے خوش ہوا اور بولا۔ ''وعدہ کرو کہ وہاں تم ۸۰ کلو تک وزن گھٹاؤ گے۔'' میں نے کہا ''یس سر، اِٹ از مائی پرامز۔'' انھوں نے فارم پر ۸۵/کلو کاٹ کر ۸۰/کلو لکھ دیا۔ اور اس طرح میں سینا ڈاک سروس (اے پی ایس) میں بھرتی ہوگیا۔ اے پی ایس سنٹر کامٹھی میں مراٹھا ایل آئی کا استاد تعینات تھا، جس نے میرا وزن گھٹانے میں اور مجھے مکمل فوجی بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

کامٹھی میں ہم تین افسر تھے جو ٹریننگ کے لیے آئے تھے، کیپٹن سداشوم، لیفٹننٹ او بلیسو اور میں۔ میس میں ہمارے ساتھ ریکارڈ افسر کیپٹن رائے بھی رہتا تھا کیونکہ اس کی فیملی ساتھ میں نہیں تھی۔

ہماری اچھی دوستی ہوگئی۔ ریکارڈ افسر چونکہ باقاعدہ فوجی افسر تھا اس لیے فوج کے قوائد وقانون سے ہمیں آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس نے جب مجھے عورتوں کی جانب مائل دیکھا تو تنبیہ کی کہ کسی فوجی افسر کی بیوی پر ڈورے نہیں ڈالنا، لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اے پی ایس سنٹر کے کمانڈنٹ کرنل آر ایس کریر ہوا کرتے تھے جو خود مکمل فوجی لگتے تھے۔ انھوں نے ہمیں تربیت دینے اور فوج کے قابل بنانے میں کوئی فروگذاشت نہیں کی۔ شراب پیتے تھے تو پیے جاتے تھے، رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ساتھ ہی ہنستے بھی رہتے تھے مگر میں نے انھیں کبھی بدمست ہوتے نہیں دیکھا۔ پارٹیوں میں انھوں نے ہمیں فوجی آدابِ اخلاق سے روشناس کرایا۔ ایک پارٹی میں میجر نیلہ کنٹھ کی بیوی سے تعارف ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ آرٹ اور پینٹنگ میں پریزیڈنسی کالج، مدراس سے پوسٹ گریجویشن کر چکی ہیں۔ فوجی ماحول میں وہ جل بن مچھلی کی طرح محسوس کر رہی تھی جہاں بُرشوں کے بدلے بوٹوں کے چلنے کی صدائیں سنائی دیتی تھیں اور رنگوں کے بدلے براسو کی پالش لگانے کا رواج تھا۔ وہ پارٹی میں میرے ساتھ گھل مل گئی اور مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی مگر دوستوں نے مجھے وہاں جانے سے روک لیا۔ ایک روز میں اور سداشوم کانونٹ سکول میں لگی نمائش دیکھنے گئے کہ اچانک وہ اپنے خاوند کے ہمراہ نظر آئی اور ہمیں زبردستی اپنے گھر لے گئی۔ وہاں ہم نے کافی پی لی، سداشوم چنانچہ تمِل تھا اس لیے اس کے شوہر سے تمِل زبان میں باتیں کرنے لگا جبکہ میں اس کی بنائی ہوئی پینٹنگز کو دیکھتا رہا اور سراہتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ایک پرکٹا پرندہ قفس میں بند ہو کر چھٹپٹا رہا ہو۔ وہ اپنی اور اپنے فن کی پہچان کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس لیے میں ہمدردی کے دو چار بول بول کر واپس چلا آیا۔ مگر اس کی شخصیت نے ذہن پر ایک مستقل نقش چھوڑ دیا کیونکہ میں بھی ایک زمانے میں آرٹ اور پینٹنگ کا دیوانہ تھا۔

میں تقریباً نو سال فوج میں ڈیپوٹیشن پر رہا۔ کامٹھی میں تین مہینے کی فوجی ٹریننگ کے بعد ۸۱-۱۹۸۰ء میں بریلی، یوپی؛ ۸۳-۱۹۸۱ء میں ٹینگا ویلی، ارونا چل پردیش؛ ۸۵-۱۹۸۳ء میں شیلانگ، میگھالیہ اور ۸۸-۱۹۸۵ء میں متھرا، یوپی میں تعینات رہا۔ میری پہلی پوسٹنگ یوپی ایریا ایس ڈی ایس یونٹ، بریلی میں بحیثیت کیپٹن ہوئی۔ اتراکھنڈ کے کئی پہاڑی علاقے دیکھنے کا موقع ملا مگر نہ جانے کیوں کیدارناتھ، بدری ناتھ، گنگوتری اور جمنوتری نہیں جا پایا۔ ان دنوں میرے اندر تصویریں بنانے کا شوق پھر

سے جاگ اٹھا۔ بریلی میں پہلے پہل سول ایریا رام پور گارڈن میں رہتا تھا۔ وہاں ایک بوڑھا آرٹسٹ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آرٹ اور پینٹنگ سکھاتا تھا۔ میں بھی وہاں جانے لگا۔ واٹر کلر سے کچھ واقفیت تو تھی ہی مگر وہاں میں نے آئیل پینٹنگ سیکھ لی اور کئی سینریاں اور پورٹریٹ بھی بنائے۔ ماڈل کے طور پر میں یونٹ سے کسی سپاہی کو لے جاتا تھا اور پینٹنگ مکمل ہونے پر وہ تصویر اسی کو تحفتاً دے دیتا تھا۔ گورو جی کے پاس امریکا میں مقیم ایک ہندوستانی تاجر آتا تھا جو ان سے کوڑیوں کے دام ریشمی کپڑے پر منی ایچر پینٹینگز بنواتا تھا اور امریکا میں جا کر نہ جانے کتنے گنا دام بڑھا کر بیچتا تھا۔ لڑکیاں آدھی تصویر بنا کر اسے مکمل کرنے اور آخری درستی کرنے کے لیے گورو جی کے سامنے رکھ دیتی تھیں۔ میں نے اس بارے میں گورو جی سے سوال کیا، کہنے لگے کہ تم اپنے ساتھ ان کا تقابل مت کرو، ان لڑکیوں کو آرٹ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ان کا مدعا دو چار تصویریں بنانا ہوتا ہے، ان کے نیچے اپنا نام لکھنا ہوتا ہے اور شادی سے پہلے جب کوئی ان کو دیکھنے کے لیے آجاتا ہے تو اس کو اپنا کمال دکھانا ہوتا ہے۔ پسِ شادی ان تصویروں سے گرد جھاڑنے کی بھی ان کے پاس فرصت نہیں ہوتی۔ گورو جی کو میں نے رانی کھیت کے کماؤں فوجی میوزیم میں چند پورٹریٹ بنانے کا کام دلوایا اور خود بھی دو تین سینریاں ان کو میس کے لیے فروخت کیں۔ بریلی ہی میں میری دوستی ایک نرسنگ افسر دلاری سے ہوئی جو کئی سال تک چلتی رہی حالانکہ فوج میں سٹیشن بدلتے رہتے ہیں اور دوست بھی بدلتے رہتے ہیں۔ بڑی ہی بولڈ لڑکی تھی، بائز کٹ رکھتی تھی اور بہت ہی صاف و شفاف رہتی تھی۔ شہوت انگیز ایسی کہ بدن سے آگ برستی تھی مگر اکیلے پن نے مشت زنی کی عادت ڈالی تھی۔

یو پی ایریا کے جنرل آفسر کمانڈنگ ریٹائر ہونے والے تھے۔ ان کے پوسٹل لائف انشورنس کی معیاد ختم ہوگئی۔ اس لیے انشورنس کی واجب الادا رقم دینے کے لیے میں ان کے آفس صبح سویرے ہی پہنچ گیا۔ اندر کمرے میں داخل ہوا، سلوٹ مارا اور کہا۔ ''سر آپ کی پی ایل آئی پالیسی آج میچور ہوئی ہے۔ اس کی رقم لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' وہ حیران ہوئے، بولے۔ ''آج ہی میچور ہوئی اور آج ہی رقم مل گئی۔ اتنی ایفی شنسی!'' مجھے نہ جانے کیا سوجھی بذلہ سنجی سے کام لیا۔ ''سر پھر بھی میں دس گھنٹے لیٹ ہوا ہوں، پالیسی تو رات بارہ بجے میچور ہوئی ہے۔'' وہ مسکرا دیے، اپنے پی اے کو بلایا اور اے پی ایس کے اعلیٰ ترین افسر کے نام خط کا ڈکٹیشن دیا کہ مجھے اپنے فارمیشن کے اس نوجوان اے پی ایس کیپٹن بُدکی پر ناز ہے۔ کام کی جانب

اس کی لگن کو دیکھ کر میں بہت ہی خوش ہوں۔'' مجھے ان کے یہ تعریفی کلمات سن کر بہت ہی فخر محسوس ہوا۔ اتفاق سے اسی سال (۱۹۷۹ء) مجھے اے پی ایس ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے پوسٹل لائف انشورنس کے گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔

چند دل فگار تصویریں بھی دل پر نقش ہو چکی ہیں۔ میرے پوسٹل یونٹ میں بہت ساری گاڑیاں ہوتی تھیں جن کی جنگ میں تو ضرورت پڑتی تھی مگر امن کے ٹائم پر ان کا بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ ایریا کے بڑے افسروں کو اس بات کا علم تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے ان گاڑیوں کو طلب کرتے اور وہاں سے سیتا پور اور اس کے آس پاس علاقوں میں شکار کھیلنے کے لیے چلے جاتے حالانکہ شکار کرنا ان علاقوں میں غیر قانونی قرار دیا جا چکا تھا۔ مگر فوجی افسر تھے، کون پوچھ سکتا تھا۔ یوں بھی اپنے ملک میں قانون تو بہت سارے ہیں مگر ان کو توڑنے والے خود محافظ ہی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ حال ہی میں کئی فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو بھی شکار کھیلتے ہوئے پکڑا گیا، کسی کا کیا جاتا ہے۔ عدالتیں تاریخ پر تاریخ لگاتی ہیں، پیشیاں ہوتی ہیں اور نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ رسوخ والے تو آخر کار چھوٹ جاتے ہیں۔

مجھے کئی بار ٹنک پور جانا پڑتا تھا کیونکہ وہاں بَن بسا میں آرمی کا بریگیڈ اقامت پذیر تھا۔ اس ایریا پر اپنے کیمپ لگانے اور کھیل کود وغیرہ کا میدان بنانے کے لیے فوج نے ٹیک، ساگوان اور بانس کا بہت بڑا جنگل صاف کیا تھا۔ کچھ علاقے میں ابھی بھی ٹیک وُڈ اور ساگوان کے کٹے درختوں کے مُنڈھ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے کوفت ہوتی تھی۔ وہ بریگیڈ اگر اگلے پچاس برس بھی شجر کاری کرنے کی کوشش کرتا پھر بھی ویسا جنگل آباد نہیں کر پاتا۔ سچ کہا ہے کسی نے جب محافظ ہی مخاصمت پر اتر آتا ہے تو پھر چمن کے اجڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ہمالیہ کے دامن میں ایسے کئی جنگل انسانی تخریب کا شکار ہو کر صحرا بن چکے ہیں۔ اس بریگیڈ نے میرے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دی۔ ہماری ایک ٹن گاڑی روزانہ ڈاک لے کر بریلی سے بن بسا (ٹنک پور) جاتی تھی۔ وہاں پورا بریگیڈ قیام پذیر تھا، جس کے ڈی کیو نے فیلڈ پوسٹ ماسٹر کو حکم دیا کہ میل گاڑی میں بریگیڈیر صاحب کا کچھ نجی سامان مع سپاہی چلا جائے گا۔ فیلڈ پوسٹ ماسٹر نے ٹیلی فون پر میری اجازت چاہی جو میں نے مسترد کر دی کیونکہ یہ قانوناً غلط تھا۔ کرنل صاحب کو غصہ آیا، بریگیڈیر کے کان بھر دیے اور گاڑی کو رکوا کر ڈرائیور کو فوجی قید میں ڈال دیا۔ میں نے فیلڈ پوسٹ ماسٹر

کو ہدایت دی کہ وہ مجھے اور آرمی ہیڈ کوارٹر کو اس سلسلے میں سگنل بھیج دے۔ سگنل تو سگنل سنٹر سے جانا تھا، بریگیڈیر صاحب کی ہوائیاں اڑ گئیں اور گاڑی فوراً چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد میں وہاں گیا، بریگیڈیر نے مجھے بلایا اور اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ میں اے پی ایس مینول (دستور العمل) اپنے ساتھ لے گیا تھا، ان کو دکھایا لیکن وہ اس بات پر مصر تھے کہ ”آئی ایم دی لوکل کمانڈر، یہاں جو میں کہوں گا وہی چلے گا۔“ انھوں نے کیس میرٹھ سب ایریا کے توسط سے یوپی ایریا کو روانہ کیا تاکہ گاڑی میں بریگیڈیر صاحب جس کو چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ میں نیا نیا تھا، ڈر گیا، ابھی میرٹھ سب ایریا سے کیس یوپی ایریا پہنچا ہی نہیں تھا کہ میں نے یوپی ایریا کے جنرل صاحب سے اجازت لے کر یوپی سٹیٹ ٹرانسپورٹ سے معاہدہ کروالیا اور ان کی گاڑیوں سے ڈاک بھیجنا شروع کر دیا۔ اس طرح فوج کو سالانہ دس لاکھ روپے کا فائدہ ہونے کی امید تھی۔ کافی لے دے ہوئی۔ پھر بریگیڈیر صاحب نے کمانڈ سے میرے باس کو دعوت پر بلایا لیکن میرے باس نے ان کے سامنے وہ خط رکھ دیا جس کی رو سے کنٹرولر آف ڈیفنس اکاونٹس نے سینا ڈاک سیوا کو شاباشی دی تھی اور دوسرے یونٹس کو بھی ہدایت دینے پر اصرار کیا تھا تاکہ وہ بھی اسی طرح سرکاری خرچہ کم کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح بریگیڈیر صاحب خاموش ہو گئے۔ کچھ برس بعد یہ طریقہ کاربن بسا سے آگے پتھورا گڑھ اور دارچولا کے لیے بھی لاگو کر دیا گیا۔

ایک برس بعد میں بحیثیت میجر کے ٹینگا ویلی، اروناچل پردیش ٹرانسفر ہوا۔ ہمالیہ کی گود میں بسی ہوئی یہ بستی بہت ہی خوبصورت ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں ۱۹۶۲ء میں چینیوں نے گھس پیٹھ کی تھی۔ توانگ میں بودھوں کی عبادت گاہ لاسا تبت کے بعد دنیا میں دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے گیارہ ہزار فٹ کی اونچائی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ ہماری ڈاک گاڑیاں روزانہ ایک طرف تیج پور سے ٹینگا ویلی اور دوسری طرف ٹینگا ویلی سے توانگ جاتی تھیں۔ ڈویژن کے جنرل آفسر کمانڈنگ بہت ہی نیک دل انسان تھے۔ نام تھا جنرل سمی خان۔ اپنی کسی کزن سے شادی کی تھی مگر نزدیکی نسبت کے باعث جینیاتی پیچیدگی کھڑی ہوگئی تھی اور تینوں بچے ایک کے بعد ایک جوانی کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی خدا کو پیارے ہو گئے۔ آخر کار انھوں نے بارہمولہ کشمیر کے کسی اناتھ آشرم سے ایک بچے کو گود لیا تھا مگر اس کے باوجود مسز سمی خان اپنے اندر کے خلا کو پُر نہیں کر پائیں۔ بہت غمگین رہتی تھیں۔ آرٹسٹ بھی بہت اچھی تھیں

اور بچوں کو آرٹ سکھانے کے لیے مجھ سے انتظام کرنے کو کہا مگر وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس ڈویژن میں مجھے لیڈیز کلب (Ladies Club) اور آرمی وائیوز ویلفیئر ایسوسی ایشن (AWWA) فنڈ کا اکاونٹ رکھنے کا کام بھی سونپا گیا جو میں نے بخوبی نبھایا مگر ایک بار ڈرائیور نے غلطی سے بریگیڈیر جی ایس (بی جی ایس) کی بیوی کے بدلے میری بیوی سے چیک پر دستخط کرالیا اور وہ چیک کیش بھی ہوگیا۔ قسمت اچھی تھی کہ مجھے جلدی معلوم ہوگیا اور میں نے بنک میں چیک رکوا کر دوسرے چیک پر بی جی ایس کی بیوی کے دستخط لے کر منیجر کو پیش کیا ورنہ غضب ہو جاتا۔ اِدھر کرنل کیو کی بیوی بھی ایک بار ناراض ہوگئی۔ اس نے کسی سپاہی کو چھٹی پر مہاراشٹر بھیج کر اسے وہاں سے آوا (AWWA) کی دُکان کی خاطر چیوڑا منگوایا۔ جتنی قیمت چیوڑے کی نہیں تھی اس سے زیادہ رقم کا تو اس سپاہی نے ٹرانسپورٹ کا بل پیش کیا جو میں نے نامنظور کرلیا۔ اس بات پر وہ اور کرنل کیو، جو فارمیشن میں میرے فوری افسر تھے، دونوں ناراض ہوگئے۔ اسی طرح ایک اور بار دو اعلیٰ افسروں کی بیویوں کی اناؤں کے ٹکراو کا شکار ہوگیا۔ ان دنوں ڈویژن ایکسرسائز کے لیے چین کی سرحد کے نزدیک اونچے پہاڑوں پر گیا تھا کہ ایم ای ایس (MES) نے پوجا کے سلسلے میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ پروگرام کی تیاری میں میں نے کافی مدد کی اور میری بیوی پہلی بار اینکر کا کام کر رہی تھی۔ چونکہ پہلا موقع تھا وہ گھبرا گئی اور مجھے ایک روز کے لیے نیچے آنے کے لیے کہا۔ یہ بات کرنل ایڈم کی بیوی کو ہضم نہیں ہوئی کیونکہ کچھ مدت کے لیے نیچے آنے سے ڈیلی الاونس نہیں مل سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے جی او سی اور بی جی ایس کی بیوی نے بلایا تھا اس لیے میں نے ان کا حوالہ دیا۔ کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ میں نے لیڈیز کلب اور آرمی وائیوز ویلفیئر ایسوسی ایشن سے استعفیٰ پیش کیا۔ بات جی او سی تک پہنچ گئی۔ انھوں نے مجھے بلایا۔ جونہی میں ان کے کمرے میں داخل ہوا میرے چہرے سے بے چینی صاف جھلک رہی تھی۔ انھوں نے کافی منگوائی اور مجھ سے معذرت کے ساتھ کہا کہ تھوڑی دیر رکنا پڑے گا میں زرا واش روم ہو کر آ جاؤں گا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لوٹ آئے، پھر کافی آئی اور ہم دونوں کافی کی چسکیاں لینے لگے۔ اس درمیان میری بے چینی دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی۔ انھوں نے گفتگو کا آغاز یوں کیا۔

”میجر بدکی، سب سے پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے حال ہی میں صدر ہند کی آمد پر میرے لیے جو خطاب اردو میں رقم کیا تھا وہ مجھے بہت پسند آیا۔ تم تو بہت اچھی اردو لکھتے ہو۔“ میں نے بھی

شکریہ ادا کیا اور اس طرح میری رہی سہی رنجش بھی ختم ہوگئی۔ پھر جنرل صاحب بولے۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ کمیونکیشن گیپ میری بیگم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔ خیر اب بتاؤ تمھیں کیا کہنا ہے۔'' ان کے اس فقرے کے بعد مجھے کہنے کو رہا ہی کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سر مجھے کوئی شکایت نہیں ہے بس کچھ غلط فہمی تھی جواب دور ہوگئی۔'' انھوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر تم اپنا کام سنبھالو اور ہاں میں چاہتا ہوں کہ تم میس سیکریٹری کا کام بھی سنبھال لو۔'' اب تو میرے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا، ہاں کہہ دیا۔ باہر جا کر وہ کہاوت یاد آئی۔ گئے تھے روزے چھڑانے، نماز گلے پڑی۔ خیر مجھے مینجمنٹ کا ایک بہت بڑا سبق مل گیا کہ کسی شکایت کرنے والے کی بے چینی کا ازالہ کیسے ہوسکتا ہے۔

ایک اور واقعے کے بارے میں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری ڈاک گاڑی تیج پور سے ٹینگا اور ٹینگا سے 'سے لا' درّے سے ہوتی ہوئی بیساکھی پہنچ جاتی تھی مگر یہاں بھی اس میں کسی کو سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی کبھار کسی کو بہت ہی مجبوری میں اجازت دے دیتا تھا۔ راستے میں دو برگیڈ پڑتے تھے۔ ایک برگیڈ کے ڈی کیو مجھ سے اجازت لیتا تھا مگر دوسرے برگیڈ کا ڈی کیو، چنانچہ بہت عرصہ پہلے جی او سی کا ایڈ جونٹ رہا تھا، کسی سے اجازت مانگنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ ایک روز کسی کو بھیجنا چاہتا تھا کہ ڈرائیور نے منع کیا۔ اس نے اپنی دھاک بٹھانے کی بہت کوشش کی، ڈرائیور پر تیز رفتاری کا الزام لگا کر ملٹری پولیس سے کارروائی کرنے کو کہا لیکن میرے استدلال اور ضابطے کے آگے وہ کچھ نہ کرسکا۔ اس نے ایک نئی مصیبت کھڑی کردی۔ وہ توانگ میں ایک فیلڈ پوسٹ آفس کھلوانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کردیا۔ بات جی او سی تک پہنچی اور پھر کور کمانڈر جنرل رنجیت سنگھ دیال تک۔ اس نے فیلڈ آفس کھولنے بابت پروپوزل منگوایا جو میں نے تیار کر کے قاعدہ کے مطابق آگے بھیج دیا۔ میں نے پروپوزل بڑی دقیقہ ریزی سے بنایا اور ڈاک خانے کا خرچہ ۷؍ لاکھ سے زیادہ دکھایا حالانکہ اس کا ایک بڑا حصہ ہم اس وقت بھی بالواسطہ طور پر خرچ کر رہے تھے۔ دراصل جن لوگوں کے لیے وہ یہ آفس کھلوانا چاہتا تھا وہ اس سوویدھا کے حق دار تھے ہی نہیں اور یہ خرچہ فضول تھا۔ جنرل صاحب نے دیکھتے ہی مسترد کردیا اور کیس فائل بند ہوگئی مگر ہماری آپسی تکرار پھر بھی بند نہیں ہوئی۔ ڈی کیو نے کئی بار مجھ سے الجھنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔

اس سے پہلے جب میں بریلی میں تھا، بینا نے کیندریہ ودیالیہ سنگٹھن (Central

(Schools Organisation میں ہندی پوسٹ کے لیے درخواست دی تھی۔ گو اس کی جب شادی ہوئی تھی وہ محض گریجویٹ تھی مگر اب وہ باضابطہ ایم اے (سوشولوجی)، ایم اے (ہندی) اور بی ایڈ تھی۔ اِدھر میرا پروموشن بحیثیت میجر ہوا اور مجھے ٹینگا ویلی بھیج دیا گیا، وہ بھی میرے ساتھ ہو لی۔ وہاں بارڈر روڈس کا ایک افسر اجے کول ملا جس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دہلی میں چند بوتل رم دے کر اس کا سینٹر گواہاٹی کروالوں کیونکہ نارتھ ایسٹ میں زیادہ ٹیچرس دستیاب نہیں ہوتے اور نوکری ملنا آسان ہے۔ میں نے رم تو کیا وہسکی کی دو بوتلیں ساتھ لیں اور فوجی کوریئر سے دہلی چلا گیا۔ وہاں سمجھ میں نہیں آیا کہ کس کو شراب کی بوتلیں دوں اور کیسے دوں؟ اس لیے دونوں بوتلیں اے پی ایس کے دوستوں میں بانٹ دیں اور خود بریلی جا کر کیندریہ سکول کے انتظامیہ کو خط بھیج دیا کہ بینا بدکی، جس نے نوکری کے لیے درخواست دی ہے، کا انٹرویو سنٹر گواہاٹی تبدیل کر دیا جائے۔ ساتھ میں اپنے پوسٹنگ آرڈر کی نقل بھی منسلک کر دی۔ خود واپس اروناچل چلا گیا۔ ہفتہ بھر گزر گیا اور بینا کو تار ملی کہ گواہاٹی میں پرائمری ٹیچرس اور ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرس کے انٹرویو کے لیے حاضر ہو جاؤ۔ وہ حاملہ تھا، اس لیے فارمیشن سے اجازت لے کر میں اس کو جونگا میں گواہاٹی لے گیا۔ انٹریو کی تیاری کے لیے میں نے اسے محنت کرنے اور خود اعتمادی لانے پر زور دیا اور اس بات کو خارج کر دیا کہ نوکری کے لیے ہر جگہ روپیہ اور سفارش چلتی ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ اگر انسان میں غیر معمولی قابلیت ہو تو کوئی انٹرویورا اتنا سنگ دل اور بے رحم نہیں ہوتا کہ وہ آپ کو نظر انداز کر دے گا۔ ٹی جی ٹی کا انٹرویو ہوا۔ چیئرمین نے جب سنا کہ اس کا شوہر فوج میں میجر ہے، تو پوچھا۔ ''آپ کے ہسبنڈ کو نہیں دیکھا جب کہ سبھی فوجی افسر جن کی بیویاں انٹرویو کے لیے آئی ہیں ہمیں مل چکے ہیں؟'' جواب ملا۔ ''سر، وہ میرے ساتھ آئے تو ضرور ہیں مگر مجھے یہاں چھوڑ کر خود شیلانگ سیر سپاٹے کے لیے چلے گئے۔ وہ نوکری کی خاطر کسی سے ملنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کے اپنے کچھ اصول ہیں۔'' چیئرمین بولا۔ ''اور اگر ہم آپ کا انتخاب نہیں کریں تو؟'' بینا نے جواب دیا۔ ''تو کیا ہوگا۔ نوکری ملے گی تو سب کہیں گے کہ اس جیسی ذہین عورت ہمارے گھر میں کوئی نہیں ہے اور نہ ملے تو کہیں گے نوکریاں یوں راستے پر تھوڑی ہی پڑی ملتی ہیں، اس کے لیے انٹلی جنس کی ضرورت ہوتی ہے۔'' بینا نے ایک اور سوال کے جواب میں خوش الحانی کے ساتھ تلسی رامائن سنائی اور بورڈ کو محظوظ کر لیا۔ انھوں نے کہا کہ تمھارا سلیکشن ہو گیا ہے اب پرائمری

ٹیچرس انٹرویو کے لیے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خوشی خوشی گیسٹ ہاؤس لوٹ آئی اور شام کو مژدہ سنایا مگر میں نے نصیحت کی کہ تم اپنا فرض پورا کر لو، انھیں اگر انٹرویو نہیں لینا ہوگا وہ ان کی مرضی۔ سو وہ دوسرے روز انٹرویو کے لیے دوبارہ چلی گئی۔ چیئرمین نے پوچھا کہ تم کیوں آئی۔ جواب دیا۔ ''سر میرے پتی نے کہا تم اپنا کرتویہ پالن کرو، ان کو اپنا کرتویہ ادا کرنے دو۔'' چیئرمین نے موقع غنیمت جان کر پاس ہی اپنے گیسٹ روم سے ٹیپ ریکارڈر منگوایا اور بینا کی آواز میں تلسی رامائن کا کچھ حصہ ریکارڈ کر لیا۔ اس طرح اس کا بطور ٹی جی ٹی سلیکشن ہوا، ٹینگا میں پوسٹنگ ہوئی اور کچھ وقفے کے بعد بچہ بھی پیدا ہوا جس کے باعث کئی مہینوں بعد نوکری جوائن کر سکی۔

ٹینگا ویلی سے مجھے موٹر ڈرائیونگ اور میکنکل ٹریننگ کے لیے دو مہینے آرمی سکول فار مینٹیننس اینڈ ٹرانسپورٹ بنگلور (ASMT,Bangalore) بھیجا گیا۔ ۱۹۸۱-۸۲ء کے دسمبر و جنوری کے مہینے تھے۔ گو اس سے پہلے بھی اوٹا کمنڈ کی سیر کی تھی اور جنوبی ہند کی دوشیزاؤں سے واسطہ پڑا تھا مگر اب تو پہلی بار جنوبی ہند کی ہوا میں کھلے طور سانس لینے کا موقع ملا۔ کھوپرے کی خوشبوؤں میں ملفوف وہاں کی حسیناؤں کے متناسب اور لچک دار جسم، گیہواں رنگ، موتیوں کی طرح چمکتے دانت، بالوں سے لٹکتی بیلا اور جوہی کی مالائیں اور بدن کے ہر مسام سے پھوٹتی شہوت انگیز خوشبو کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں حورانِ جنوب کا ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ بقول والی آسی:

؎ جو دل میں ہوتا ہے صاف صاف کہتے ہیں
سو اس خطا پر ہمیں بے ادب نہ سمجھا جائے

ٹریننگ کے دوران دو لڑکیوں سے ملاقات ہوئی جو دوستی میں بدل گئی۔ ایک کا نام اینی لزی (اینالوسیا) تھا، کرسچن تھی اور مہارانی کالج میں طالب علم تھی۔ اس کے ساتھ کبن پارک یا پھر کسی ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کرنے میں مزہ آتا تھا۔ بالکل پاکٹ سائز فلاسفر لگتی تھی۔ اسی کے توسل سے میں نے آئین رینڈ، وِل ڈیورانٹ اور رچارڈ باک کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ کبھی کبھی میں اسے کہتا تھا کہ کاش میرا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تمھاری شادی اس سے کراتا، مگر میری مانو تو تم کبھی شادی نہیں کرنا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی دوسرے سیارے سے زمین پر غلطی سے اتر آئی ہے۔ بعد میں اس نے اپنی پوری زندگی سماجی

کاموں کے لیے وقف کردی اور نا کتخدا رہی۔ فیس بُک کا شکریہ کہ پچیس سال بعد اسے پھر رابطہ ہو گیا۔ دوسری لڑکی سی کے شیلا کورگ کی رہنے والی تھی، شمشاد قد، نہایت حسین، شہوت انگیز اور پُر خلوص، سٹاک بروکر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دُکان پر ملاقات ہوئی۔ کورگ کے لوگ باقی جنوبی قبیلوں سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں، ان کے یہاں برطانوی طور طریق اب بھی رائج ہیں۔ ہندوستان کے مشہور جنرل کریاپہ بھی کورگی تھے۔ بنگلور میں جب تک تھا اس سے کئی بار ملاقات ہوئی مگر بعد میں رابطہ ٹوٹ گیا۔ کبھی کبھار کننگ ہم روڈ پر ہوٹل کاویری میں بیئر پینے اور غزلیں سننے جایا کرتا تھا۔ وہاں پر ایک حیدرآبادی مغنیہ تھی جو گاتی رہتی جبکہ لوگ اپنی بیئر میں مست رہتے۔ آج کل کی بھیڑ میں وہ غزلوں کے شیدائی کہاں جو واہ واہ کہتے یا پھر مکرّر کہتے۔ خیر اس کو تو گانا پڑتا تھا کوئی سنے یا نہ سنے۔ پہلی ہی بار میں اس کی آواز سے متاثر ہوا اور اس کی داد دی۔ پھر جب بھی جاتا اس کو اپنی فرمائش اردو میں لکھ کر بھیج دیتا۔ بہت خوش ہو جاتی کہ کوئی تو قدرداں مل گیا۔ بنگلور چھوڑنے سے قبل آخری بار چلا گیا اور اس کو کاغذ کے پرزے پر لکھ کر بھیج دیا کہ اپنی پسند کی کوئی بھی اچھی غزل سناؤ کہ اب میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اس نے ایک سریلی غزل گائی جس کے بول تھے ’’یوں ہی پہلو میں بیٹھے رہو... آج جانے کی ضد نہ کرو.... وقت کی قید میں زندگی ہے مگر چند گھڑیاں یہی ہیں جو آزاد ہیں... ان کو کھو کر میری جانِ جاں عمر بھر نہ ترستے رہو‘‘۔ میں جذبات میں بہہ گیا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ جب بھی کبھی یہ غزل سنتا ہوں تو اس گلوکارہ کی شکل سامنے آتی ہے۔

ٹینگا ویلی سے شیلانگ، میگھالیہ پہنچ گیا جہاں دو سال گزارے۔ شیلانگ میں میس کے علاوہ پانچ مکان بدلنے پڑے۔ پہلے میس میں رہتے تھے، پھر ایک عارضی رہائش مل گئی۔ ایک لمبا سا بیرک نما یک منزلہ مکان تھا جیسے انگریزوں کے زمانے میں گھوڑوں کے اصطبل ہوا کرتے تھے۔ چار کمرے تھے جو ایک قطار میں ایک دوسرے سے جڑے تھے۔ ایک رات بہت زور کی آندھی آئی۔ میں اور میرے بچے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں گھبرایا، اٹھا، بجلی جلائی اور اپنے کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر تیسرے کمرے میں دیکھا تو میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ وہاں بہت بڑا چنار یا نیم کے سائز کا درخت آندھی کی وجہ سے گرا پڑا تھا۔ چھت ٹوٹ چکی تھی اور درخت کمرے کے بیچوں بیچ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اگر اُس کمرے کی بجائے ہمارے کمرے پر گرا ہوتا تو شاید

میں یہ سوانح لکھنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ موت کے ساتھ یہ میرا دوسرا اینکاونٹر تھا۔ اس سے پہلے پٹن، بارہمولہ کے پاس جیپ حادثے میں مرتے مرتے بچ گیا تھا۔ دوسرے روز ہم نے ایک اور عارضی رہائش میں پناہ لی۔ کچھ مہینوں بعد ہمیں ایک اچھا مگر رتبے سے کم کیپٹن کا فلیٹ دیا گیا۔ اسی دوران بیوی کو ٹریننگ پر آگرہ جانا پڑا اور مجھے ایک مکان کی آفر ملی جو میرے رتبے کا تو تھا مگر کرائے پر لیا گیا پرائیویٹ مکان تھا۔ الگ تھلگ اور پولیس بازار جانے کے لیے صرف ایک گلی پار کرنا پڑتی تھی۔ محل وقوع کے حساب سے بہت اچھی جگہ پر تھا۔ کہیں سے کسی کی چوکسی نہیں۔ میں نے غنیمت جانا کہ شیلانگ میں ایسی جگہ مل گئی جہاں آدمی عیش کرسکتا ہے۔ اس لیے شفٹ کرلیا۔ یہاں تو دوستوں کی کافی آمد ورفت رہتی تھا۔ پارٹیاں بھی ہوتی تھیں اور موج مستی بھی۔ ایک ہی سٹیشن میں پانچ مکان بدلنے کا یہ ریکارڈ بن گیا۔

بینا اپر شیلانگ میں سنٹرل سکول میں کام کرتی تھی۔ وہاں سے اس کو گورنمنٹ کے خرچ پر ایم ایڈ کرنے کی خاطر کیندریہ ہندی سنستھان، آگرہ بھیجا گیا۔ وہ بچوں کو لے کر آگرہ چلی گئی اور میں اکیلا رہ گیا۔ شیلانگ جیسی جگہ میں اکیلا رہنا تو خوش نصیبی کی بات ہے۔ شیلانگ میں کئی دوشیزاؤں کے ساتھ دوستی ہوگئی، چند ایک کے ساتھ معاملہ محض فلرٹیشن اور چوما چاٹی تک محدود رہ گیا جبکہ ایک کھاسی اور ایک نیپالی کرسچن سے کافی گہرے سمبندھ ہوگئے۔ بقول غالبؔ۔

؎ آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد!!
مجھ سے میرے گنہ کا حساب، اے خدا نہ مانگ

سِول ڈاک محکمے میں کچھ لوگوں سے جان پہچان ہوئی، کچھ دلچسپ دوست بنے، کچھ پارٹیاں ہوتی رہیں اور کچھ مزے لوٹتے رہے۔ سرکل آفس سے چند لڑکیاں کینٹین کا شراب لینے کی خاطر میرے گھر میں حاضری دیا کرتی تھیں۔ ایک پارٹی میں میرے دوستوں کے علاوہ میزورام اور شیلانگ کی کئی لڑکیاں تھیں کہ اندرا گاندھی کے قتل کی خبر مل گئی۔ سبھی لوگ دم بخود ہوگئے۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔ اس روز مجھے پہلی بار اندرا گاندھی کی مقبولیت کا احساس ہوا۔ میں چپ چاپ اٹھا، اپنی الماری سے ماہنامہ تعمیر سرینگر کا وہ شمارہ نکالا جس میں ایمرجنسی کے دوران میرا افسانہ 'جاگو' شائع ہوا تھا۔ افسانے میں اندرا گاندھی کی بدانتظامی کو علامتی پیرائے میں درشایا گیا تھا۔ میں نے آخری پیراگراف میں یہ پیش گوئی کی تھی

کہ اس کی میت کو کوئی اٹھانے والا بھی نہ ملے گا مگر جنتا پارٹی کے اقتدار کے بھوکے لیڈروں کے باعث وہ اپنی مقبولیت بحال کرنے میں ظفریاب ہوئی اور بہت حد تک ایمرجنسی والی امیج کو مٹانے میں کامیاب ہوئی۔ تاہم جس بہیمیت سے اس کی موت واقع ہوئی وہ زندگی کا بہت بڑا سبق ہے۔ اندرا گاندھی نے کچھ برس پہلے ممبئی کے انتولے کیس میں کہا تھا کہ ”کرپشن ایک عالمی فنومینن ہے۔“ (Corruption is a universal phenomenon)۔ اس طرح اس نے رشوت ستانی کو بالواسطہ طور پر اپنی منظوری دی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کے سیکورٹی عملے میں کسی نے رشوت کھا کر یا پھر اثر و رسوخ کے سبب اس کے گارڈس میں ایک ہی وقت پر دو مشتبہ سکھوں کو تعینات کیا تھا جس کے باعث انھیں اندرا گاندھی پر گولیاں چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ نتیجے میں اس کو اپنے ہی گھر کے اندر اپنے ہی حفاظتی عملے نے گولیوں سے ہلاک کر دیا۔

شیلانگ میں میرا التہابِ زائدہ کا آپریشن ہوا۔ پہلی بار ڈاکٹر نے جلدی میں آپریشن کیا اور اپینڈکس میں سوجن اور پیپ دیکھ کر اس کے استخراج کے بغیر ہی واپس ٹانکے لگا دیے۔ پھر ایک مہینے بعد دوسری بار آپریشن ہوا۔ فوجی ہسپتال میں دو قسطوں میں وہ بیس تیس دن بڑے مزے سے گزرے۔ کئی نرسیں شام کو بتیانے کے لیے آتی تھیں جن میں کیرلا کی ساوتری سے اچھے مراسم پیدا ہو گئے۔ گوری، ملائم، خوبصورت، خوش الحان اور خوشبودار برہمن لڑکی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی شادی کیرلا کے کسی نوجوان سے ہوئی اور وہ نوکری چھوڑ کر اس کے ہمراہ گلف چلی گئی۔ آپریشن کا ایک منفی نتیجہ بھی نکلا۔ میرا پوسٹنگ آرڈر امتراٹ، بھوٹان (IMTRAT) کے لیے ایشو ہوا جس میں کافی مالی فائدہ تھا مگر چونکہ میرا آپریشن ہوا تھا اور فوجی زبان میں ابھی کیٹگری شیپ ون (Shape I) میں نہیں تھا یعنی پوری طرح صحتیاب نہیں ہو چکا تھا، اس لیے فارین پوسٹنگ پر جانا ممکن نہ تھا۔ بہت ہی اچھا موقع ہاتھ سے چلا گیا۔

جن دنوں میں بیماری کے سبب گھر میں پڑا رہا، انگریزی میں بچت سکیموں، شیئر انوسٹمنٹ اور انکم ٹیکس کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کی کوشش کی۔ ان دنوں بنک اور ڈاک خانے کی ریٹ گورنمنٹ طے کر لیتا تھا۔ ڈاک خانے میں نوکری کے سبب بچت سکیموں کی جانکاری تو تھی ہی، پروبیشن کے دوران کمپنی حصص (Shares) اور انکم ٹیکس میں کافی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اس وقت لوگوں کو خاص کر ملازموں اور

فوجیوں کو بچت سکیموں، شیئرس اور انکم ٹیکس کی زیادہ جانکاری نہ تھی۔ قریب دو سو صفحات ٹائپ کر لیے تھے مگر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ آخری دو ابواب لٹک کر رہ گئے جو شیئرس سے متعلق تھے۔ اس طرح کتاب میں تاخیر ہوتی گئی اور پھر کبھی منظر عام پر نہ آسکی۔ شیئرس کے بارے میں میری دلچسپی زیادہ علمی تھی اور عملی کم، تاہم کچھ شیئرس کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ البتہ میرا پورٹ فولیو دیکھنے لائق ہوتا تھا۔ میں نے ان دنوں اپنے پتا جی کو خط لکھا کہ گواہاٹی میں مجھے دس ہزار روپے پر سٹاک ایکسچینج کی ٹکٹ مل رہی ہے اور اگر آپ میرے پاس آئیں گے تو ہم شیئر مارکیٹ میں دلالی کا کام شروع کر سکیں گے۔ وہاں سے روکھا سا جواب آیا کہ ”میرا جو کچھ بھی بچا ہوا ہے اس کو نیلام کرنے کا ارادہ ہو تو بتا دو۔ مجھے ایسے کام کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ جی میں آئی کہ لکھوں ”آپ کے پاس ایسی کون سی جائیداد ہے جس کا نیلام ہو جائے گا۔“ ایک پشتینی مکان تھا جس پر قرقی ہونے کا دو بار نوٹس لگ چکا تھا۔ سورگباش ہونے پر انھوں نے بنک میں کل پانچ ہزار کی قلیل سی رقم چھوڑی تھی جس سے قرض داروں کے قرضے اتارے گئے اور ایک تین ہزار کی انشورنس پالیسی تھی جو انھوں نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کے نام کر لی تھی۔ میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھ لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ انہی دنوں ایک مارواڑی دوست بھنسالی میرے گھر آیا، شیئرس کی بات چلی تو اس نے دلچسپی ظاہر کی حالانکہ اس کو اس حوالے سے کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس نے صراف بازار گواہاٹی پر واقع سٹاک ایکسچینج میں اپنا نام درج کروالیا، ایک چارٹرڈ اکاونٹنٹ کو نوکر رکھا اور دلالی شروع کی۔ بہت سالوں کے بعد گواہاٹی میں اس سے پھر ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ دہلی میں ایک بہت بڑا شیئر دلال بن چکا ہے۔ کہتے ہیں:.

Fools rush in where angels fear to tread"

گھریلو تفرقات نے میرے سوچنے کی طاقت سلب کر دی تھی۔ شیلانگ میں ایک مرتبہ نہ جانے کیا سوجھی کہ اپنے تمام تر مسودے مع ان رسالوں کے جن میں میری نگارشات شائع ہوئی تھیں نذر آتش کر لیے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید قلم کار ہونے کی وجہ سے میں زود حس ہو رہا ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے فکر مند اور پریشاں رہتا ہوں جو گھریلو چپقلش کو مہمیز کرتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس تخلیقی مادہ کو یک لخت دفن کر لوں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ اس طرح میں نے اپنا سارا تخلیقی سرمایہ آگ کے حوالے کر دیا۔ اس حوالے سے نریش کمار شاد کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

؎ بھول جا اے شاد اپنی شاعری کو بھول جا
کر کلرکی، کھا ڈبل روٹی، خوشی سے پھول جا

اس وقت جو کچھ بھی میں نے کیا سب وقتی جنون کے تحت ہوا لیکن بعد میں بہت پچھتانا پڑا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اب جو یاد آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ ’جہان نو‘، ’نوجیون‘ اور ’ہمارا کشمیر‘ کے کارٹون، وہ ’عقاب‘ کی فائلیں جن میں میرے مضامین، افسانے اور کارٹون شائع ہوئے تھے، وہ ’آفتاب‘ کے صفحات جن پر میرے افسانے میرے فکر و خیال کی ترجمانی کر رہے تھے، وہ ’رفتار جموں‘، ’تعمیر ہریانہ‘ اور ’تعمیر سرینگر‘ کے شمارے جن میں میری کہانیاں محفوظ تھیں اور وہ ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے جو ابھی تک تشنۂ اشاعت تھے، سب خاکستر ہو گئے۔ اس طرح میری پہلے دور کی تخلیقی دنیا راکھ ہو گئی۔

جن دنوں میں شیلانگ میں تھا، گوہاٹی یونٹ کے ایک وارنٹ افسر نے مجھے دہلی میں سستے داموں زمین دلوانے کی پیش کش کی۔ جنک پوری کے پاس ہی پنکھا روڈ کے اس پار ایک غیر منظور شدہ کالونی بن رہی تھی اور وہاں زمینوں کے پلاٹ سستے داموں بک رہے تھے۔ دس مرلے کے لیے مجھے صرف اٹھائیس ہزار دینے پڑے۔ اس نے پلاٹ کے اردگرد ایک دیوار بھی اینٹوں اور مٹی سے چنوا لی جس کے لیے مزید آٹھ ہزار دینے پڑے۔ زمین کو خریدنے کے ٹائم پتہ چلا کہ کوئی ایکس فوجی صوبیدار اس کا منتظم ہے۔ وہ میری بہت عزت کرتا تھا۔ بات بات میں اس نے جب یہ دیکھا کہ مجھے سکول کھولنے میں دلچسپی ہے تو ایک روپے گز کے حساب سے زمین دینے کی پیش کش کی بشرطیکہ اس گاؤں کے بچوں کو اس میں مفت تعلیم دی جائے۔ میں نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ پتا جی اور چھوٹی بہن دہلی شفٹ ہو کر مجوزہ مکان میں رہے اور دوسرے چند رشتے داروں سے بات کی کہ اگر وہ چاہیں تو ہم مل کر دہلی میں سکول چلا سکتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں ریسپانس منفی رہا اور مجھے وہ زمین خسارے میں پچیس ہزار کے عوض فروخت کرنا پڑی۔ دراصل ہم کشمیری پنڈتوں میں ایسے جوکھم اٹھانے کی عادت نہیں ہے۔

شیلانگ سے مجھے ترقی پر متھرا کور ہیڈ کوارٹرس بحیثیت لیفٹننٹ کرنل کے بھیجا گیا۔ ان دنوں جنرل وی این شرما کور کمانڈر تھے جو بعد میں آرمی چیف بن گئے۔ وہاں میں کور کے کلچرل پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ مجھے ایک پروگرام کا بندوبست کرنے کا حکم ہوا جو توپ خانہ کے ایک سکھ میجر کو، جو عام طور پر

ایم سی (Master of Ceremonies) کا کام سرانجام دیتا تھا، اچھا نہ لگا۔ مسخرا ہونے کے سبب سردار جی پروگراموں کا روحِ رواں ہوتا تھا مگر اس تبدیلی سے اس کے دل پر سانپ لوٹ گیا۔ ڈپٹی جی او سی کے پاس جا کر چغلی کر لی، پروگرام کا ریہرسل ہوا، اس نے اپنا رول، جو پروگرام کا مرکزی رول تھا، بالکل سپاٹ طریقے سے پیش کیا، نتیجتاً ڈپٹی جی او سی نے پروگرام کا انچارج اسی سردار جی کو بنا لیا البتہ میرا دل رکھنے کو مجھے ایم سی (اینکر) کا کام بدستور کرنے کا حکم ہوا۔ میرے پاس دو آپشن تھے، یا تو میں بدلے میں اپنا رول سپاٹ بنا لوں یا پھر اتنا اچھا بنا لوں کہ باقی پروگرام اس کے سامنے پھیکے پڑ جائیں۔ میں نے دوسرا آپشن پسند کیا، اپنے لیے آسامی سلک کا ایک زرق برق پٹھان ڈریس بنوایا، اور سٹیج پر حاضر ہوا۔ زندگی میں یہ پہلی بار تھی کہ میں نے پروگرام سے پہلے بہت ریاض کیا تھا۔ پروگرام میں اگر کسی کو تالیوں سے خوب سواگت ہوا، تو وہ میں تھا۔ صرف ایک بدمذاقی اس بات پر ہوئی کہ ریٹائر ہونے والے کمانڈ کے جنرل صاحب نے، جن کے لیے پروگرام کا اہتمام کیا گیا تھا، میرے ایک شعر کا غلط مطلب نکالا اور اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ شعر احمد فراز کا تھا:

؎ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

جنرل صاحب کہنے لگے کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد سوکھا پھول بن کر نہیں رہوں گا۔ میں متحرک زندگی بسر کر لوں گا۔ پروگرام کے اختتام پر انھیں شعر کا مفہوم سمجھانے میں کافی وقت لگا۔ پروگرام اچھا ہوا۔ سردار جی کو میری صلاحیت کا اندازہ ہو گیا اور پھر ایم سی کے لیے میرے نام پر مستقل مہر لگ گئی۔

متھرا کی پوسٹنگ کے دوران میرے پتا جی کا انتقال ہو گیا۔ بدقسمتی سے میں اس وقت دہلی میں ٹریننگ کر رہا تھا اور مجھے اطلاع ملنے میں تاخیر ہو گئی۔ بینا نے جب متھرا میں خبر سن لی وہ فوراً دہلی آ گئی، دوسرے روز دونوں ہوائی جہاز سے سرینگر پہنچے مگر پتا جی کی آخری رسومات میرے پہنچنے سے قبل ہی ادا ہو چکی تھیں۔ اس سفر سے دو تین برس پہلے مجھے اکیلے ہی سرینگر جانا پڑا تھا۔ ان دنوں پتا جی زندہ تھے۔ پتا جی نے میرے کہنے پر کشمیر میں زمین خرید لی تھی جس کی قیمت میں نے ادا کی تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں مجھے دلچسپی تھی۔ اس خریداری میں کچھ ایسے مشتبہ لوگوں کو شامل کیا گیا تھا جن کا مجھے گماں

بھی نہ تھا۔ خیر تلخ گھونٹ پینا ہی پڑا اور میں نے اپنی ناراضی کا اظہار شدت سے نہیں کیا۔ ان ہی دنوں ایک کشمیری لڑکی سے، جو پروٹوکول دفتر سے منسلک تھی، ملاقات ہوگئی اور اس کے ساتھ کافی قربت رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ منشیات کی عادی ہو چکی ہے اور عیاشی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر زندگی کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔

پتا جی تو سورگباش ہو گئے لیکن ایک نئی مصیبت آن کھڑی ہوئی۔ میری بیوی اور چھوٹی غیر شادی شدہ بہن کی آپس میں پہلے ہی سے نہیں بنتی تھی۔ تاہم میں نے کوشش کی کہ شاید بہن کو متھرا لے جا کر بات بن جائے مگر وہاں پر بات بگڑتی ہی چلی گئی اور دونوں کے درمیان تو تو میں میں شروع ہوئی یہاں تک کہ میری بیوی نے اس پر ہاتھ اٹھایا اور بات ملٹری پولیس تک پہنچ گئی۔ معاً میں نے ایک وارنٹ افسر کے ساتھ اپنی بہن کو دہلی روانہ کر دیا اور وہاں سے بذریعہ جہاز سرینگر بھجوا دیا۔ شکر تھا کہ آبائی مکان ابھی بیچا نہیں تھا، اس لیے وہ وہیں جا کر رہنے لگی۔ اس بات پر میری بیوی اور میرے درمیان کافی جھک جھک ہوئی اور اس نے میرے خلاف پولیس سٹیشن میں رپورٹ لکھوائی۔ کئی برس بعد میں نے وہ آبائی مکان عدالت میں بہن کے نام کر دیا۔

بگڑے حالات کے مدِ نظر میں نے واپس سوِل محکمے میں جانے کی درخواست دی حالانکہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ بھاری وزن کے موجب میں پھر کبھی فوج میں واپس نہیں آسکوں گا۔ ایک بار تو تگڑم کر کے آیا تھا مگر ہر بار کم وزن لکھوانا ممکن نہ تھا۔ انجام کار میں نے ۱۹۸۸ء میں فوج سے ڈسچارج لے کر سرینگر سرکل آفس میں بحیثیت ڈائریکٹر جوائن کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا فوجی باب اختتام پذیر ہو گیا۔

☆☆☆

زندگی کا ایک تاریک باب

کشمیر میں میری دوسری پاری مارچ ۱۹۸۸ء میں شروع ہوئی۔ پہلی بار میں اپنی جائے پیدائش کی خدمت کرنے کے ارادے سے آیا تھا مگر حالات سے مجبور ہو کر جلد ہی فوج میں جانا پڑا۔ نہ افسر خوش تھے اور نہ ہی یونینیں۔ گھر میں بھی انتشار تھا۔ فوج میں زندگی اپنے ڈھرے پر چلنے لگی تھی، کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی، صرف دو ایک بار بینا میری گرل فرینڈس کے ساتھ بھڑ گئی۔ بہر حال پتا جی کی رحلت کے سبب میں نے بہن کی نگہبانی کے واسطے واپس سِوِل میں جانے کے لیے درخواست دی تھی جو ڈیڑھ سال کے بعد منظور ہوئی حالانکہ اس وقت تک مسئلہ دوسرا ہی رخ اختیار کر چکا تھا اور حل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس لیے فوج سے ڈسچارج پر پچھتا رہا تھا۔ اس وقت کشمیر کے حالات نارمل تھے اور کہیں کوئی شورش کا گماں بھی نہ تھا۔ میں نے اپنے بچوں کے داخلے کے لیے متھرا ہی سے برن ہال سکول کے پرنسپل کو چٹھی لکھی تھی اور درخواست کے ساتھ نہ صرف بچوں بلکہ والدین کے کوائف بھی لکھے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ پرنسپل بائیوڈاٹا پڑھ کر متاثر ہوا ہوگا، اس نے بچوں کو داخلہ دینے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ یہ تو میرے لیے بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ برن ہال سرینگر کا ممتاز سکول مانا جاتا ہے۔ سرکاری گھر بھی نزدیک ہی جی پی او کمپلکس میں مل گیا۔ میں نے چین کا سانس لیا کیونکہ اب میں یہاں پر تب تک رہ سکتا تھا جب تک دونوں بچے بارہویں پاس نہ کر لیتے اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے کہیں چلے نہ جاتے۔ کہتے ہیں واہ رے قسمت کے دلیا، پکائی تھی کھیر بن گیا دلیا! میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ حالات نے ایسی کروٹ لی جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

۳/ سے ۷/ اکتوبر ۱۹۸۸ء تک مجھے ایک کورس کے لیے ایفروایشین پیسی فک پوسٹل ٹریننگ سنٹر بنکاک (APPTC, Bangkok) بھیجا گیا۔ موضوع تھا ’ڈاک میں منشیات کی سراغ

رسائی'۔ کورس میرے کسی کام کا نہیں تھا تاہم بنکاک دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ہمارے ایک افسر وجے کھنہ بحیثیت فیکلٹی ڈیپوٹیشن پر مقرر تھے جو ایس ایس پی ٹائم ہی سے مجھے جانتے تھے۔ انھوں نے بحیثیت میجر، اے پی ایس کے مجھے فوج میں بھیجنے کا انتظام کرایا تھا۔ بنکاک جانے سے پہلے دہلی میں اس وقت کے ممبر اجے باغچی نے بلایا۔ کہنے لگے۔ ''دیپک، تمھیں بنکاک جانا ہے، میں نے اس لیے بلایا کہ تمھیں آگاہ کروں کہ وہاں پر وجے کھنہ ہمارے افسر ہیں۔ ہمارے افسر یہاں سے جاتے ہیں اور ساتھ میں پورا روپیہ نہیں لے جاتے، وہاں پر وجے کھنہ سے مانگ لیتے ہیں جو اچھی بات نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سر، مجھے نہیں معلوم آپ کن افسروں کی بات کر رہے ہیں مگر میں نے ذاتی روپے ایکسچینج کر کے پانچ سو ڈالر اپنے ساتھ رکھے ہیں۔ چونکہ آپ بہت سینئر ہیں اور یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ آپ میرے طور طریق سے واقف ہوں، میں گاندھیائی طرزِ زندگی میں یقین رکھتا ہوں اور غیر ملکی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ اس لیے مجھے وہاں کچھ بھی خرچ نہیں ہوگا سوائے کھانے پینے کی اشیا پر۔ آپ اس بارے میں بے فکر رہیں۔'' مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اتنی لمبی چوڑی تمہید کیوں باندھ رہے ہیں۔ بولے۔ ''اگر تم اپنے لیے کچھ نہیں لا رہے ہو، تو ایسا کرو، میں نے وجے سے دو بوتل بارکلے رم بھیجنے کو کہا ہے۔ پھر تم وہ اپنے ساتھ ہی لے آؤ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سر، ضرور لے آؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' اور میں وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ من ہی من میں ہنسی آئی اور سوچنے لگا کہ دو بوتل رم کے لیے اتنا بڑا وعظ اور وہ بھی اتنے بڑے افسر کے دہن سے....! بنکاک کا کورس تو اچھا رہا۔ وہاں ایران کے ڈاک محکمے کا ایک افسر ٹریننگ کے لیے آیا تھا۔ چنانچہ ایران میں ان دنوں آیت اللہ خمینی کا انقلاب زوروں پر تھا اس لیے اس نے خمینی کے نام کی ڈاک ٹکٹیں اور بہت سارے تبلیغی کتابچے سبھی شرکا کو بانٹ دیے۔ خود کو بڑا پاکباز اور دیندار ظاہر کر رہا تھا۔ ہم ہوٹل راما دا میں ٹھہرے ہوئے تھے جو بہت مہنگا تھا۔ اس کو کسی اور ہوٹل کے بارے میں معلوم ہوا کہ کافی سستا ہے اور وہاں مقامی ایسکارٹ، لڑکیاں اور لڑکے دونوں دستیاب ہیں، اپنا بوریا اٹھا لیا اور اسی روز دوسرے ہوٹل میں چلا گیا۔ انقلاب دھرے کا دھرا رہ گیا۔

بنکاک سے لوٹ کر ایک بار کشمیر کے ایک برانچ پوسٹ آفس کا دورہ کرنے چلا گیا۔ ساتھ میں متعلقہ انسپکٹر نہیں تھا بلکہ سرکل آفس کا ایک اے ایس پی تھا۔ برانچ پوسٹ ماسٹر کچھ روز سے بغیر اجازت

غائب تھا اور اپنا کام کسی رشتے دار کو سونپ گیا تھا۔ اکاونٹ وغیرہ تو لکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے جب اسے کچھ سوالات کیے وہ جواب نہیں دے پایا۔ اتنے میں برانچ پوسٹ ماسٹر کی بیوی چلی آئی اور کشمیری میں اس کو جھاڑنے لگی کہ تم نرے چغد ہو، وہ آئے گا تو بہت ناراض ہو جائے گا۔ یہاں انسپکٹر لوگ آتے ہی ہم ان کی ضیافت کا انتظام کرتے ہیں، ان کے لیے بطخ ذبح کرتے ہیں اور ان کو کسی قسم کی پریشانی اٹھانے نہیں دیتے اور پھر تم نے ان کو چائے کے لیے بھی نہیں کہا، نہ مجھے خبر کر دی۔ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ میں نے وقت کی نزاکت کو سمجھ کر اسے کشمیری میں بس اتنا کہا کہ ہم انسپکشن کی غرض سے نہیں آئے ہیں، بلکہ محکمے کی کچھ انفارمیشن جمع کرنے آئے ہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ تب وہ چلی گئی اور ہم بھی واپس چلے آئے۔

باغ مہتاب، چاڈورہ میں میری ایک کنال دو مرلہ زمین تھی جو میرے پتا جی نے میرے سرمائے سے خرید لی تھی۔ اس کو ہڑپنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اس لیے میں نے اس پر مکان بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک بہت ہی نیک اور قابل راج مستری مل گیا اور میری نگرانی کے بغیر مکان کی ایک منزل تعمیر ہو گئی۔ ڈیزائین میں نے خود ہی بنایا تھا۔ چھت کا سلیب پڑ گیا اور پلستر وغیرہ مکمل ہو گیا مگر موسم سرما کی وجہ سے کام روکنا پڑا۔ اب صرف لکڑی کی چھت بنانی تھی اور اس پر ٹین کی چادریں بچھانی تھیں۔ ایسی چھت کے نیچے بھی کچھ کمرے نکل آتے ہیں جو رہنے کے علاوہ کاٹھ کباڑ اور ایندھن رکھنے کے کام آتے ہیں۔

تاہم مہورت کے حساب سے ہم نے مکان میں پرویش کیا۔ میں اور بیٹا رات بھر وہاں ٹھہرتے رہے۔ اسی کالونی کے پاس میرا ایک دوست میر عبدالرشید رہتا تھا۔ وہ اور اس کی اہلیہ بہت ہی شریف، نیک اور ہمدرد تھے۔ گاہ بہ گاہ مکان پر نظر رکھتے تھے حالانکہ مکان کی نگرانی کے لیے ایک الگ چوکیدار بھی رکھ لیا تھا۔ رشید صاحب اور اس کی اہلیہ نے مکان بنانے میں ہماری بہت مدد کی۔ مکان کے ساتھ کافی زمین تھی جس میں تین اعلیٰ قسم کے سینٹ روز آلو بخارے اور دو نارمل قسم کے سیبوں کے پیڑ تھے۔ مکان بنانے میں چھ لاکھ روپے سے زیادہ خرچ ہو گئے۔ بقول بشیر بدرؔ:

؎ لوگ ٹوٹ جاتے ہیں اِک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

اِدھر مکان بنتا رہا، اُدھر شہر میں شورش اور تخریب کاری بڑھنے لگی۔ دہشت گردی کے باعث

مرکز کی سرکاری مشنری پراگندہ ہوگئی تھی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ سب کچھ اچانک ہوگیا اور پھر اتنی جلدی ہوگیا۔ حکومت ہند اس کے لیے بالکل تیار نہ تھی، ریاستی سرکار کی تو بات ہی نہیں، انھوں نے تو ملی ٹینٹوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ کئی کئی دن کرفیو لگا رہتا تھا، کبھی سرکاری اور کبھی سِوِل، بات بات پر بازاروں میں ہڑتالیں ہوتیں، شاہراہوں پر ناکہ بندی اور جامہ تلاشیاں عام ہوگئیں، گھر گھر، علاقے علاقے تلاشیاں لی جارہی تھیں، ہر روز گولیاں چلتیں، بم پھٹتے اور فوجی کیمپوں پر راکٹ برسائے جاتے۔ دفتر، دکانیں، کاروباری ادارے اور بنک کئی کئی روز بند رہتے۔ ہر روز آگ زنی کی وارداتیں پیش آتیں، ہلاکتوں کی خبریں ملتیں اور تخریب کاروں کی پولیس سے جھڑپیں ہوتیں۔ ایک طرف سیکورٹی فورسز گولی بارود کی زد میں آنے لگے اور دوسری طرف معصوم شہریوں کو مخبروں کے لیبل لگا کر ہلاک کیا جاتا۔ سینما ہالوں اور ویڈیو پارلرز کو سب سے زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ نیز کشمیری پنڈتوں کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا۔

۱۹۸۹ء میں نہ جانے کیا ہوا، سارا ماحول ہی بدل گیا۔ جدھر دیکھو اُدھر جلوس پر جلوس نکالے جارہے تھے، آزادی کے نعرے بلند کیے جارہے تھے اور ہاتھوں میں طرح طرح کے پرچم لیے ہوئے مظاہرہ کرنے والے ہر روز یو این او دفتر میں دہائی دینے چلے جاتے۔ جتنے جھنڈے نظر آرہے تھے اتنے ہی ان کے رنگ اور ڈیزائن تھے۔ شاید پرچم بردار کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں کس تنظیم کا پرچم ہے۔ بموں کی وقوع پذیری روز بروز بڑھتی جارہی تھی اور کئی جانی مانی ہستیوں کو نشانہ بنایا جارہا تھا جن میں مذہبی رہنما بھی تھے، سیاست دان بھی اور افسر بھی۔ کشمیری پنڈتوں کو جلوسوں میں شرکت کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ میرا دفتر جو شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے دامن میں تھا راستے میں پڑتا تھا اور مجھے جلوس کی ہیئت کو دیکھ کر اندازہ ہونے لگا کہ معاملہ انتظامیہ کے ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔ فرامین اور احکام کی ترسیل متوازی ذرائع سے ہو رہی تھی اور سرکار کو کانوں کان خبر نہیں رہتی۔ فرمان جاری ہوا کہ سبھی دُکانوں کے سائن بورڈ سبز رنگ کے ہونے چاہئیں اور ان پر اردو میں سفید لکھائی ہونی چاہیے۔ چند ہی دنوں میں سب سائن بورڈ ہرے ہوگئے۔ ایک اور فرمان جاری ہوا کہ سبھی عورتیں مستقبل میں گھر سے باہر برقع لگا کر نکلا کریں ورنہ ان پر تیزاب پھینکا جائے گا۔ حکم کی فوری طور تعمیل ہوئی۔

ایک روز ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر لسہ کول کے دفتر میں ایس ایس بی کا انٹرویو چل رہا تھا جس کا ایک رُکن میں بھی تھا کہ باہر گیٹ کے پاس بم پھٹ گیا مگر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بعد میں لسہ کول پر اس کے گھر کے باہر گولیاں برسائی گئیں۔ اسی طرح ایچ یم ٹی کے جنرل منیجر ایچ ایل کھیڑا اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق، جو اسلامیات کے جانے مانے عالم تھے، کو قتل کیا گیا اور سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ اس طرح بقول ان کے نظام مصطفیٰ کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ اس حوالے سے یگانہ چنگیزی لکھنوی فرماتے ہیں:

؎ سب ترے سوا کافر، آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا

۱۹/اور ۲۰/جنوری کی درمیانی رات کو منصوبہ بند طریقے سے ساری وادی جاگ اٹھی۔ مسجدوں میں لاوڈ سپیکر نصب کیے گئے تھے جن پر 'آزادی، آزادی' کے نعرے لگائے جا رہے تھے، ہندوستانی نظام کو للکارا جا رہا تھا اور کشمیری پنڈتوں کو وادی چھوڑنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ لوگوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رات ختم ہوتے ہی جب سورج طلوع ہوگا تو ایک نئی دنیا، نیا نظام قائم ہو چکا ہوگا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہندوستانی فوج کہیں ہے ہی نہیں اور انتظامیہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ کیوں اور کیسے اس پر یہاں بحث کرنے کا محل ہے نہ موقع۔ وادی میں کشمیری پنڈتوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سرکاری نظام اور فوج کی یہ حالت دیکھ کر سب پریشان ہو رہے تھے۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ لی اور صبح ہوتے ہی کشمیری پنڈت اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کسی کو ٹرک ملا، کسی کو سُومو اور کسی کو لاری، جو جس میں سمایا، چلتا بنا۔ کسی نے مول تول نہیں کیا۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے۔ فرار پانے کے لیے وادی سے ایک ہی راستہ تھا اور وہ جموں کی طرف جا رہا تھا۔ اس لیے سارا قافلہ جموں کی جانب روانہ ہو گیا۔ مہینے بھر میں وادی کشمیری پنڈتوں سے خالی ہوگئی ماسوا چند ایک کے جو حفاظتی فوجوں کے کیمپوں کے آس پاس رہتے تھے یا پھر لاچار ہو کر کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ اس کے باوجود سب کو ایک موہوم سی امید تھی کہ چند مہینوں میں ہندوستانی فوج سرحد پار سے آئے دہشت گردوں پر قابو پالے گی اور ہم واپس اپنے گھروں میں بس

جائیں گے۔ اس طرح کشمیری پنڈت اپنے ہی ملک میں رفیوجی بن گئے اور آج تک بے گھری جھیل رہے ہیں۔ اکثر لوگ جموں، اودھم پور، نگروٹہ وغیرہ کے گردونواح میں خیموں میں رہنے لگے۔ جس کسی کا کوئی رشتے دار تھا وہ عارضی طور وہاں چلا گیا اور جو کرائے پر رہ سکا اس نے کرائے پر ایک دو کمرے لے لیے۔ بہت سارے لوگ تو ملک کے دوسرے بڑے شہروں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اِدھر وادی میں حالات بد سے بدتر ہو گئے، اکثر مرکزی دفاتر اور بنک بند ہو گئے، جلوس نکلتے رہے، دونوں جانب سے گولیاں برستی رہیں، بم برستے رہے اور بار ہا راکٹ لانچر بھی استعمال کیے گئے۔ لوگوں کو باہر نکلنے پر پابندی لگائی گئی۔ کئی کئی دن کرفیو نافذ رہا۔ شاہراہوں پر ناکہ بندی کی گئی، جگہ جگہ جامہ تلاشیاں ہونے لگیں، محلے کے محلے تلاشیوں کے لیے قطار بند کر دیے گئے اور کئی محلے نذر آتش کیے گئے۔ اُدھر نوجوان جوق در جوق عسکری تربیت پانے کے لیے سرحد پار کرنے لگے کیونکہ ان کو جہاد اور جنت کے رنگین سپنے دکھائے جا رہے تھے۔

ملی ٹینسی کی افزائش میں سیاست دانوں نے کیا رول ادا کیا وہ تو اظہر من الشمس ہے لیکن افسر شاہی بھی کچھ پیچھے نہیں رہی۔ فاروق عبداللہ اپنی عیاشیوں میں مست رہا، کشمیر کو جہنم کی آگ میں دھکیل دیا اور جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو لندن جا کر بھاگ کھڑا ہو گیا۔ گورنر جگ موہن کے پہلے معیاد عہدہ میں جماعت اسلامی نے تبلیغ کے ذریعے علیحدگی پسندی کے لیے زمین ہموار کی، ملی ٹینٹوں نے اپنا پورا نیٹ ورک بچھایا اور اسلحہ کی زخیرہ اندوزی کی جس کے بارے میں ہماری خفیہ ایجنسیاں بے خبر رہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ فاروق عبداللہ کو چیف منسٹری کی کرسی سے اتار کر جی ایم شاہ کو وہاں بٹھایا گیا جو ۱۹۵۳ء میں مرزا افضل بیگ کے ساتھ مل کر شیخ محمد عبداللہ کو ہندوستان سے ناتا توڑنے میں پیش پیش رہا تھا۔ وہ تب سے پاکستان کے ساتھ تعلقات بنائے ہوئے تھا اور مالی امداد لیتا رہا تھا۔

گورنر جگ موہن نے اپنی کتاب 'مائی فروزن ٹربیلونس ان کشمیر' (My Frozen Turbulence in Kashmir) میں لکھا ہے کہ کرسی چھوڑنے کے بعد شاہ نے کہا تھا کہ ''میں پاکستانی ہوں، ہر کشمیری پاکستانی ہے اور ہم نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے الحاق کر کے بڑی غلطی کر لی۔''

سوال یہ ہے کہ جب گورنر نے فاروق کے بجائے شاہ کو وزیر اعلیٰ بنایا، کیا اس نے اپنا ہوم ورک نہیں کیا تھا، کیا اس نے شاہ کے ماضی کے بارے میں چھان بین نہیں کروائی تھی؟ ایسی ذہنیت کے آدمی کو کیسے سی ایم

بنایا گیا؟ کم سے کم فاروق کے بارے میں ایسی باتیں تو نہیں لکھی جاسکتی ہیں ماسوائے اس کے کہ وہ جے کے ایل ایف کے اراکین سے پاکستان میں ملا تھا۔ صرف اس بات کے لیے کہ فاروق کے دور حکومت میں کرکٹ میچ کے میدان میں پاکستانی جھنڈے دکھائے گئے اور اندرا گاندھی کے لیکچر کے دوران کچھ شر پسند عناصر نے بدتمیزی کی تھی، کیا فاروق کو کرسی سے اتارنا واجب تھا؟ مگر گورنر جگ موہن تو صرف راجیو گاندھی کو بقول ان کے ’وارننگ سگنلز‘ بھیجتا رہا۔ اگر جگ موہن نے محسوس کیا تھا کہ ریاست میں ہندوستان کی سالمیت کے خلاف تخریب کاری کا سامان ہو رہا ہے اور ان کی ’وارننگ سگنلز‘ کا راجیو گاندھی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو اسے فوراً استعفیٰ دینا چاہیے تھا۔ پارلیمنٹ اور ملک میں اس مسئلے پر فوراً ہنگامہ کھڑا ہوتا اور راجیو گاندھی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ جگ موہن کوئی سرکاری ملازم تو تھا نہیں کہ استعفیٰ دینے سے اس کی پنشن چلی جاتی۔ کم سے کم ساری قوم اس کی قربانی کو یاد رکھتی اور شاید کشمیر دہشت گردی کی لپیٹ میں نہ آجاتا۔ یہی بات میں نے گورنر جنرل ایس کے سنہا سے بھی کہی جب میں بحیثیت چیف پی ایم جی ان کے پاس کال آن کرنے گیا تھا۔ مجھے کشمیری پنڈت سمجھ کر انھوں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”بانہال کے اس پار لوگ کہتے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں کو جگ موہن نے بھگا دیا۔“ ان کا خیال تھا کہ میں ہاں میں ہاں ملاؤں گا۔ اس کے برعکس میں نے جواباً عرض کیا۔ ”میرا بھی یہی ماننا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں یہ تو نہیں مانتا کہ انھوں نے ہمیں وہاں سے نکلنے کو کہا کیونکہ کشمیری پنڈت قوم بے رہنما و انفرادیت پسند ہے اور ریوڑ چال چلنے کو تیار نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں کشمیری پنڈت دور دراز علاقوں میں بکھرے پڑے تھے پھر گورنر کو ان تک پہنچنے کے کون سے ذرائع دستیاب تھے؟ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ سرکار نے انھیں روکنے کی کوئی سبیل نہیں کی نہ ہی پنڈت علاقوں میں سیکورٹی کے پختہ انتظامات کروائے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔“ آخر میں انھوں نے یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ ”ہاں شاید آپ کا نظریہ صحیح ہو۔“ جگ موہن کے دور میں کئی ایسی وارداتیں ہوئیں جو روکی جاسکتی تھیں۔ اگر اس نے چارج لیتے ہی سبھی افسروں کی کانفرنس بلا کر ان کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہوتی اور ان کی حفاظت کے لیے سیکورٹی کے پختہ انتظامات کیے ہوتے تو شاید کھیڑا اور مشیر الحق کی موت واقع نہ ہوتی۔ اس نے لسہ کول کو یوم جمہوریہ کے موقع پر ٹی وی پر ہندوستانی جھنڈا لہرانے کی رسم کو پبلسٹی دینے کی تاکید تو کر لی مگر اس کی حفاظت کے اقدام نہیں کروائے

اور وہ ملی ٹینٹوں کی گولیوں کا شکار ہو گیا۔ مرکزی دفاتر جو جموں چلے گئے اور پھر جو لوگ واپس سرینگر دفتروں میں کام کرنے کے لیے بلائے گئے ان کے لیے یکساں قوائد و ضوابط نہیں بنائے گئے جن کی وجہ سے کئی کورٹ کیسز آئے دن دائر ہونے لگے۔ یہی حال مائیگرنٹوں کا تھا جن کے لیے کوئی واضح قانون نہیں بنایا گیا۔ یہ بات صحیح ہے کہ گورنر جگ موہن نے حتی المقدور کوشش کی کہ کشمیر میں لگی آگ کو کنٹرول کیا جائے اور شاید اگر وہ نہ ہوتے تو کشمیری پنڈتوں کی حالت بدتر ہوتی مگر بحیثیت ایک ایڈمنسٹریٹر کے وہ ایک 'نرسنگ آرڈرلی' بننے آیا تھا جس میں وہ ناکام رہا اس لیے بدنام ہو کر برطرف کیا گیا۔

حبیب جالبؔ فرماتے ہیں:

؎ وہ چمن جسے ہم نے خون دل سے سینچا تھا
اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا

ملی ٹینسی کے بارے میں جیسا میں نے پہلے بھی کہا ہے ریاستی اور مرکزی سرکاروں کا ردعمل صحیح نہیں تھا۔ مرکزی دفاتر اور افسروں کی کوئی کارڈینیشن نہیں تھی۔ جو لوگ شہید ہوئے ان کو گورنمنٹ نے معاوضہ دینے کے لیے کوئی یکساں قانون نہیں بنایا، کسی کے لواحقین کو ایک لاکھ دیا گیا اور کسی کے لواحقین کو سات لاکھ دیے گئے۔ لواحقین کو نوکریاں دینے میں بھی یکساں قانون نہیں بنائے گئے۔ کہیں کہیں تو ان لوگوں کو بھی نوکریاں دی گئیں جن کے والد یا بھائی بندو دہشت گردی میں ملوث تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں، افسر شاہی نے ان حالات کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھا لیا۔ امر سنگھ کلب کے پاس گیسٹ ہاؤسز میں رہنے لگے، گورنمنٹ کھاتے میں بے تحاشہ اخراجات ہونے لگے یہاں تک کہ ان گیسٹ ہاؤسز میں بہت ساری ارثی چیزیں بھی غائب ہو گئیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں 'سب کے لیے میدان کھلا تھا۔ (It was free for all)۔ جسے جو چاہے کر رہا تھا۔ نظام درہم برہم ہو گیا۔ اشیائے خوردنی محکمہ فوڈ تک تو پہنچ جاتی تھیں اس کے آگے کس کا کنٹرول تھا کوئی بتا نہیں سکتا۔ مختلف ڈاک خانوں میں آئے دن بم دھماکے ہو رہے تھے۔ قریباً ۶۵ ڈاکخانے یا تو نذر آتش کیے گئے یا پھر لوٹے گئے۔ چند ایک پوسٹ ماسٹر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میں اس وقت کے آئی جی نعمانی صاحب کے پاس چلا گیا اور اسے گزارش کی کہ ڈاک خانوں کے لیے سیکورٹی کا انتظام کروالیں۔ جواب ملا۔ ''کس کس جگہ؟'' سرینگر

ہیڈ آفس میں تو پہلے ہی سے سیکورٹی تھی، میں نے باقی اہم جگہوں کے نام لیے مثلاً بارہمولہ، اننت ناگ، کولگام، پلوامہ وغیرہ۔ نعمانی کہنے لگا ''اننت ناگ نہیں، اس کا نام اسلام باد ہے۔'' میں سوچنے لگا اس بندے کو کیا کہوں اور کشمیر کی تاریخ کیسے پڑھاؤں، اس کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بولا ''جو بھی کہیے، اس وقت مدعا پولیس حفاظت ہے۔'' کہنے لگے۔ ''آپ اپنی ضرورت تحریری طور پر تفصیل سے لکھ کر بھیج دیں، ہم دیکھ لیں گے کہ کتنے سپاہی درکار ہوں گے۔ اسی حساب سے نئی بھرتی کر لیں گے اور ان کو ٹریننگ دے کر تعینات کیا جائے گا۔ مگر آپ کے محکمہ کو خرچہ اٹھانا پڑے گا۔'' غرض کم سے کم ایک سال کا ٹائم درکار ہوگا، تب تک بہت سارے ڈاکخانے اور شاید ان میں کام کرنے والے ملازمین صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہوں گے۔ مجھے ان کے جواب کا مفہوم سمجھ آیا اور اٹھ کر چل دیا۔ نہ کبھی مانگ کا خط ارسال کیا اور نہ ہی بھرتی اور ٹریننگ ہوئی۔

مہاراج گنج ڈاکخانے پر جب دو بار بم پھینکے گئے اور عمارت کو کافی نقصان پہنچایا گیا، تو وہاں کا سارا کام ٹھپ ہو گیا۔ چنانچہ میں اکیلا ہی تھا اور پی ایم جی دہلی میں چھٹی لے کر بیٹھ گئے تھے، میں اپنے روزنامچے میں ڈائریکٹوریٹ کو اطلاع دیتا رہا۔ کچھ دنوں بعد مجھ سے پوچھا گیا کہ وہاں عمارت کی مرمت کیوں نہیں کرائی جاتی ہے اور ڈاکخانہ کام کیوں نہیں کر رہا ہے؟ سیکریٹری پوسٹ کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ میں ڈھنگ سے کام نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بلوریں ایوانوں میں رہنے والے ان افسروں کو کیا جواب دوں۔ میں نے براہ راست سیکریٹری کو خط لکھ کر یہ کہہ دیا کہ انھیں کشمیر کے حالات کے بارے میں گمراہ کیا جا رہا ہے اور یہ نہیں بتایا جا رہا ہے کہ یہاں کے حالات کتنے نازک ہیں۔

دراصل ملی ٹنسی کے ابتدائی مرحلے میں جموں وکشمیر سرکل کے پوسٹ ماسٹر جنرل وید کمار تھے۔ شریف اور قوائد وضوابط کے تابع مگر کچھ حد تک ڈرپوک۔ ان کا شوگر لیول بہت کم ہو گیا اور زبان بالکل کالی پڑ گئی۔ ایک دو بار شیر کشمیر انسٹی ٹیوٹ چلے گئے مگر مجھے جونہی خبر ملی کہ وہ تو ملی ٹنٹوں کا گڑھ ہے، انھیں خبردار کر لیا اور دہلی جانے کی صلاح دی لیکن وہ صحت یاب ہونے کے باوجود دہلی سے واپس نہیں آئے۔ مجھے ڈائریکٹوریٹ سے حکم ملا کہ میں بغیر کسی ایکسٹرا الاونس کے پوسٹ ماسٹر جنرل کا کام سنبھالوں کیونکہ کشمیر میں کام کرنے کے لیے انھیں کوئی افسر نہیں مل رہا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ جب تک میرے الاونسز میں

بڑھوتری نہیں کی جائے گی میں پی ایم جی کا کام نہیں کر سکتا۔ ایسی چٹھی ہندوستانی افسر شاہی کی تاریخ میں شاید ہی کسی نے اس سے قبل لکھی ہو۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خوش ہو جاتا کہ ایڈیشنل چارج مل رہا ہے، دیکھنے والا کوئی نہیں اور کمائی کے سبھی راستے کھل گئے ہیں۔ ایسے ہنگامی حالات میں بہت طریقوں سے بالائی آمدنی ممکن تھی مگر مجھے نہ کمانا تھا اور نہ کمایا۔ صاف صاف لکھ دیا کہ کسی افسر کو بھیج دو۔

اِدھر میرا نام بھی ہٹ لسٹ پر تھا مگر میری جان اس لیے بچ گئی کہ فوج میں رہنے کی وجہ سے میں اپنی سیکورٹی کے بارے میں بہت احتیاط برتنے لگا تھا۔ میں نے آفس جانا بند کر دیا تھا اور جی پی او سے، جہاں میری رہائش تھی اور چوبیس گھنٹے سی آر پی ایف کا پہرہ لگا رہتا تھا، سارے سرکل کا کام چلاتا تھا۔ ہندو ملازمین تو بھاگ گئے تھے صرف مقامی ملازمین آتے تھے اور وہ بھی اپنی مرضی سے۔ ملی ٹینسی کے نہایت ہی خراب دور میں مجھے جموں و کشمیر پوسٹل سرکل کا نظام کچھ دیر اکیلے ہی سنبھالنا پڑا، پھر جب پی ایم جی کی تقرری ہوئی وہ تو محض ربڑ کی مہر بن کر رہ گیا۔ انہی دنوں مجھے آئی آئی پی اے دہلی میں تین مہینوں کے ٹریننگ پروگرام پر جانے کا آرڈر ملا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گیا ہوتا اور پھر کوئی تگڑم کر کے اپنا ٹرانسفر کروا لیتا۔ کشمیر کی حالات کے مدنظر میں نے ایسا نہیں کیا اور ڈائریکٹوریٹ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اس وقت سرکل میں میری ضرورت ہے، میں ٹریننگ پر نہیں جا سکتا۔ بہر حال اس کے بعد جب میرا معیاد عہدہ ختم ہو گیا تو ڈائریکٹوریٹ نے میرا ٹرانسفر آرڈر نکالا مگر میری جگہ جس افسر کو بھیجا گیا اس نے اپنا ٹرانسفر آرڈر رکوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کامیاب ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ آرڈر میرے دل کو بہلانے کے لیے ایشوع ہوا تھا۔

اوپر جس خط کا ذکر میں نے کیا ہے، اس کے مل جانے پر سیکریٹری پوسٹ نے ڈائریکٹوریٹ میں میٹنگ بلوائی۔ سبھی ڈی ڈی جی حاضر ہوئے۔ میری چٹھی پر غور کیا گیا۔ ان میں سے ایک ڈی ڈی جی، کے دہیش نے، جو وید کمار سے پہلے چیف پی ایم جی رہ چکے تھے، والنٹیئر کیا کہ میں ڈی ڈی جی کی نوکری کے علاوہ وہاں کا کام بھی سنبھال لوں گا۔ اس سے قبل وہ کشمیر میں جتنے بھی سال رہا تھا، ایک ہی کام کرتا تھا، اپنے بنگلے پر بیئر پیتا تھا جبکہ سارا کام اس کا ڈائریکٹر منجیت بالی سنبھالتا تھا۔ اسی روز مجھے ٹیلی فون ملا کہ میں سرینگر سے جموں آجاؤں اور اس سے ملوں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر میں جموں پہنچا۔ میرے ساتھ میرا اے

ایس پی ویجلنس بھی تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد پی ایم جی صاحب نے اپنا بھاشن شروع کیا۔ ''دیپک، میں نے پچھلی بار ایک آرڈر نکالا تھا کہ پی ایم جی کا کام ڈائریکٹر دیکھے گا اور میں اوپر کے اہم کام جیسے ریاستی سرکار سے لیازن، گورنر سے ملنا، دہلی میں سرکل کے رکے ہوئے کاموں کو نکلوانا وغیرہ دیکھا کروں گا۔ اس طرح تم پی ایم جی کا کام ابھی سے سیکھ جاؤ گے۔ تم اس آرڈر کی کاپی تلاش کرواکر اس کی نقل کروالو اور اس پر میرے دستخط لے لو۔'' مجھے حیرانی اس بات کی ہورہی تھی کہ اس نے اپنے دستوری اختیارات (Statutory Powers) اپنے ماتحت کو کیسے سونپ دیے تھے، یا تو وہ لاعلم ہے یا پھر دوسروں کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''سر، آپ کو معلوم ہے کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' وہ گویا ہوئے۔ ''بھلا کیوں! میں سمجھا نہیں؟'' میں نے وضاحت کی۔ ''کیونکہ میں نے معاوضے کے بغیر پی ایم جی کا فاضل کام کرنے سے انکار کیا ہے۔ آپ وہی بات پھر دہرا رہے ہیں۔ اِدھر سے نہیں اُدھر سے کان پکڑ رہے ہیں۔'' اسے ایسے جواب کی امید نہ تھی، بولا۔ ''مگر جب میں یہاں تھا میرا ڈائریکٹر تو سب کام کرتا تھا۔'' میں نے بے روک ٹوک جواب دیا۔ ''سر اس کو کوئی غرض رہی ہوگی مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف اپنا کام کروں گا اور آپ کا کام آپ کی میز پر جمع ہوتا رہے گا۔ ویسے بھی سرکل آفس میں لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ صاحب نے پورے ٹینوئر میں کل چار فائیلوں پر دستخط کیے ہیں۔'' وہ خاموش ہوگیا اور کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا۔ ''ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی۔'' میرے ساتھ جو اے ایس پی آیا تھا وہ گھبرا رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ ویجلنس کی جو فائلیں لے آئے ہو وہ صاحب کے سامنے دستخط کرنے کے لیے پیش کرلو۔ صاحب نے بنا پڑھے پانچ فائیلوں پر اپنے دستخط ثبت کرلیے۔

دوسرے روز ہم بذریعہ ہوائی جہاز سرینگر پہنچے۔ ہمارے ساتھ اے ایس پی ویجلنس اور ایک اور ماتحت افسر ایس آر ایم تھا۔ وہاں ہمیں لینے کے لیے کوئی گاڑی نہیں آئی تھی۔ دن کے چار بج رہے تھے۔ ڈاکخانہ بند تھا اور رابطہ کرنا مشکل تھا۔ اور کچھ ٹائم کے بعد سارا ہوائی اڈہ خالی ہوجاتا۔ میں نے جوکھم اٹھا کر ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ راستے میں ایک جگہ ہجوم نے ہم کو گھیر لیا۔ پی ایم جی میرے اور ایس آر ایم کے بیچ میں بیٹھا تھا جبکہ اے ایس پی سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ فرن پہنے ہوئے ایک باریش نوجوان نے گاڑی روک لی۔ سب کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ پی ایم جی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ نوجوان

کشمیری زبان میں ٹیکسی والے سے پوچھنے لگا کہ کون لوگ ہیں؟ میں نے اپنے بھاری آواز کا فائدہ اٹھا کر جواب دیا۔ ”کوئی نہیں اپنے ہی آدمی ہیں۔ یہ بندہ فارین نیوز ایجنسی کا بہت بڑا کارسپانڈنٹ ہے۔ اس کو عیدگاہ لے جا رہا ہوں کہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کشمیر میں کیا ہو رہا ہے، نہتے لوگوں کو کیسے مارا جا رہا ہے اور ظلم و بربریت کا ننگا ناچ کس طرح ہو رہا ہے۔“ معلوم نہیں وہ کون تھا مگر اس نے ہجوم کو روک کر ہمیں جانے دیا۔ آگے جا کر رام باغ پل کے پاس پولیس نے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے ہوائی جہاز کی ٹکٹ دور ہی سے دکھائی اور اس نے بھی جانے دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور یہ سب نہیں دیکھ پایا۔ کچھ دور جا کر وہ رک گیا اور کہنے لگا ”یہاں سے آپ دوسرا کوئی انتظام کر لیجیے، میں آگے نہیں جا سکتا۔“ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیا ہو گیا، بہت منت سماجت کی، جب نہیں مانا تو میں نے اس کو بھروسہ دلایا کہ میں اس کے ساتھ واپس یہاں تک آؤں گا مگر یہ مہمان ہے اس کو تو چھوڑنا پڑے گا۔ آخر کار بہت منت سماجت کر کے اس نے پھر ٹیکسی سٹارٹ کی۔ جب وہ جی پی او کے احاطے میں پہنچ گیا، وہاں دو سی آر پی ایف کے جوان دوڑ کر چلے آئے، انھیں معلوم تھا کہ میں فوج میں لیفٹننٹ کرنل رہ چکا ہوں، مجھے سلیوٹ کر لیا جس کا میں نے معقول جواب دیا، پھر ایک نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور دوسرے نے گیسٹ ہاؤس کے کیئر ٹیکر کو بلایا۔ ”جلدی آجاؤ بھئی، کرنل صاحب کا سامان لے چلو۔“ ٹیکسی والا تذبذب میں پڑ گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہاں کیا باتیں ہوئیں اور اب یہاں .....! میں نے جلدی سے تین سو روپے نکالے اور اس کو دے دیے۔ اس نے گھبراہٹ میں لینے سے انکار کر لیا مگر میں نہیں مانا اور اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ پھر میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر کہا ”چلو، تم کو چھوڑ کر آجاتا ہوں۔“ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ کشمیری میں کہنے لگا۔ ”جناب، مجھ پر رحم کرو اور مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ میرے ساتھ جو افسر تھے انھوں نے پی ایم جی کو بتایا کہ کیا ہوا تھا اور اس کی جان کیسے بچ گئی۔ واپس دہلی جا کر دیش صاحب نے یہ سارا ماجرا اپنے رفیق کاروں کو سنایا اور پھر ڈائریکٹوریٹ میں یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس کے بعد کئی بار پی ایم جی کو آنا پڑا اور چند دن سرینگر میں ٹھہرنا پڑا مگر تب تک ریاستی سرکار نے افسروں کی آواجاہی کے لیے باضابطہ سیکورٹی کے انتظامات کیے تھے۔

ڈاک خانے اور دفاتر زیادہ تر بند ہی رہتے تھے، کبھی کرفیو، کبھی سول کرفیو اور کبھی ہڑتال۔

دپش صاحب گیسٹ ہاؤس میں دن بھر چائے کے کپ میں شراب ڈال کر پیتے تھے۔ کئی ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے کہ مجھے لگا کہ میں نے اپنے سر مصیبت مول لی۔ یوں تو صرف کام ہی سنبھالنا پڑتا اب تو کام کے ساتھ باس کو بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ ایک روز جی پی او کے بنڈ سائیڈ پر ایک بھکارن بیٹھی بھیک مانگ رہی تھی، جلدی سے نیچے اتر آئے اور اسے کہنے لگے۔ ''کتنا کماتی ہو دن بھر؟'' وہ بے چاری کیا بولتی، جواب دیا۔ ''یہی پانچ دس روپے۔'' انھوں نے جیب سے بیس روپے نکالے اور اسے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ بھکارن نے بیس کا نوٹ تو رکھ لیا مگر جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پھر پولیس بلا کر اس کو ہٹایا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے کہنے لگے کہ وہ بڑھیا مخبر ہے اور پاکستان کی آئی ایس آئی کے لیے کام کر رہی ہے۔ مجھے ان کی حماقت پر ہنسی آئی مگر 'یس سر' تو کرنا پڑا۔ انگریزی جاسوسی ناولیں پڑھنے کا یہی تو انجام ہوتا ہے۔ ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ دو ایرانی نوجوان جی پی او کے احاطے میں کچھ کام سے گھوم رہے تھے کہ پی ایم جی ایک ایرانی سے بحث میں الجھ گئے، بات یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے نوجوان کو دہشت گرد کہہ دیا۔ معاملہ بہت بگڑ جاتا اگر میں دو تین مقامی ملازموں کو بلا کر ان کو وہاں سے لے جانے کا اشارہ نہ کرتا۔ کچھ دنوں بعد نصف رات کو مجھے خبر ملی کہ پی ایم جی نیچے آر ایم ایس میں بیگوں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ میں حالات کی نزاکت سمجھ کر نیچے چلا گیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ ماجرا کیا ہے؟ کہنے لگے کہ مجھے پکی خبر ہے کہ ان ڈاک تھیلوں میں چرس بھیجی جا رہی ہے۔ ہمیں ان کی تلاشی لینا پڑے گی۔ تھیلوں کی تلاشی اور وہ بھی آدھی رات کو! یہ ناممکن تھا۔ کسی طرح میں نے ان تھیلوں کو ایک کمرے میں بند کروا کے اس پر تالا لگوا دیا اور ہدایت دی کہ صبح ان کی تلاشی لی جائے گی اس کے بعد ہی تھیلے ہوائی اڈے پر بھیجے جائیں گے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ سب کچھ بھول گئے تھے اور تھیلے روزانہ کی طرح ائیر پورٹ بھیجے گئے۔ مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہم دونوں انسپکشن کوارٹر (گیسٹ ہاؤس) میں بیٹھے خاموشی سے بہتے ہوئے جہلم کو دیکھ رہے تھے اور وہ چائے میں ملی شراب کی چسکیاں لے رہا تھا کہ آسمان پر ہوائی جہاز اڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''دیپک، دیکھو اس جہاز کی دم میں پنسل بم رکھا ہوا ہے۔ مجھے صبح آئی جی انٹیلی جنس نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ آج ایسا ہونے والا ہے۔ اب دیکھ لینا کچھ منٹوں میں یہ بم پھوٹ جائے گا۔'' میں حیرت سے ان کو تکنے لگا، اس حماقت پر ہنسنے لگا اور من ہی من میں سوچنے لگا کہ اگر انٹیلی جنس کے

آئی جی کو یہ خبر تھی کہ اس جہاز میں بم رکھا جائے گا تو کیا اس جہاز کو اڑنے کی اجازت مل جاتی۔ خیر مجھے 'یس سر، یس سر' کرنے کی اب عادت پڑ چکی تھی۔ اس 'یس سر' پر یاد آیا کہ انھوں نے ایک بار گفتگو کے دوران اپنے پیش رو کو نکما اور بے کار کہا جو مجھ سے برداشت نہ ہوا کیونکہ میں نے وید کمار سے کام کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اس لیے ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں نے 'یس سر، یس سر' کیا مگر ان کو احساس ہوا کہ میں ان کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ کہنے لگے "ہر بات پر یس سر کیے جا رہے ہو۔" اب مجھ سے رہا نہ گیا، بولا۔ "سر، ہم بیوروکریٹ بھی رنڈیوں کی طرح ہوتے ہیں، باس کیسا بھی ہو، ہمیں تعریف کرنا ہی پڑتی ہے۔ رنڈیوں کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے اور ہم بیوروکریٹس کی نظر باس کے قلم پر۔"

ایک مرتبہ دیش صاحب نے گورنر جگ موہن سے ملنے کی ٹھان لی اور ساتھ میں جنرل منیجر ٹیلی کام اور مجھے لے گئے۔ میں نے ان سے کئی بار گزارش کی کہ جانا ہے تو ہم دو ہی چلے جائیں گے مگر وہ نہیں مانے۔ جگ موہن کے سامنے تینوں بیٹھے تھے، سائیڈ میں ان کے ایڈوائزر روید مرواہا اور جلیل احمد قریشی بیٹھے تھے۔ ابتدا میں گورنر صاحب کو اپنا ٹیلی فون یاد آیا اور اس پر بہت دیر تک جی ایم ٹی سے گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد ان کے پاس ہماری بپتا سننے کے لیے وقت نہیں تھا، اس لیے ہم سے ہمارے مسئلہ جات پر ایک بریف مانگا جو میں نے خوش قسمتی سے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ بریف ایڈوائزر کے ہاتھ میں دے دیا، نہ کوئی بات ہوئی اور نہ کسی مسئلے کا سمادھان نکلا۔ اٹھ کر واپس چلے آئے۔ جی پی او میں یونین لیڈر کھڑے تھے، دیش صاحب ان سے مخاطب ہوئے۔ "میں ابھی ابھی گورنر سے مل کر آیا ہوں، ان کے سامنے میں نے آپ کی مشکلات رکھیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر کہیں سے گولی آئے گی تو وہ پہلے میرے سینے پر لگے گی اور بعد میں میرے سٹاف پر۔" اچھی ولولہ انگیز سیاسی تقریر تھی۔ پھر میری جانب دیکھ کر کہنے لگے۔ "کیوں دیپک، کیا کہا میں نے گورنر صاحب سے؟" وہی رنڈیوں والا قصہ.....! مجھے تو 'یس سر' کہنا ہی پڑا حالانکہ جی میں آئی کہ کہہ دوں آپ کے منہ سے تو بات تک نہ نکلی۔ سامنے کھڑے یونین کے لوگ مطمئن ہو کر چلے گئے۔

نشے کے تو رسیا تھے۔ اک رات میں نے گھر پر ڈنر کے لیے بلایا۔ شراب پی کر گھر میں وارد ہوئے اور آتے ہی کچن میں گھس گئے۔ میری بیوی کو ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے کچھ کہنے لگے مگر اس نے

وپش صاحب گیسٹ ہاؤس میں دن بھر چائے کے کپ میں شراب ڈال کر پیتے تھے۔ کئی ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے کہ مجھے لگا کہ میں نے اپنے سر مصیبت مول لی۔ یوں تو صرف کام ہی سنبھالنا پڑتا اب تو کام کے ساتھ باس کو بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ ایک روز جی پی او کے بنڈ سائیڈ پر ایک بھکارن بیٹھی بھیک مانگ رہی تھی، جلدی سے نیچے اتر آئے اور اسے کہنے لگے۔ ”کتنا کماتی ہو دن بھر؟“ وہ بے چاری کیا بولتی، جواب دیا۔ ”یہی پانچ دس روپے۔“ انھوں نے جیب سے بیس روپے نکالے اور اسے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ بھکارن نے بیس کا نوٹ تو رکھ لیا مگر جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پھر پولیس بلا کر اس کو ہٹایا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے کہنے لگے کہ وہ بڑھیا مخبر ہے اور پاکستان کی آئی ایس آئی کے لیے کام کر رہی ہے۔ مجھے ان کی حماقت پر ہنسی آئی مگر 'یس سر' تو کرنا پڑا۔ انگریزی جاسوسی ناولیں پڑھنے کا یہی تو انجام ہوتا ہے۔ ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ دو ایرانی نوجوان جی پی او کے احاطے میں کچھ کام سے گھوم رہے تھے کہ پی ایم جی ایک ایرانی سے بحث میں الجھ گئے، بات یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے نوجوان کو دہشت گرد کہہ دیا۔ معاملہ بہت بگڑ جاتا اگر میں دو تین مقامی ملازموں کو بلا کر ان کو وہاں سے لے جانے کا اشارہ نہ کرتا۔ کچھ دنوں بعد نصف رات کو مجھے خبر ملی کہ پی ایم جی نیچے آر ایم ایس میں بیگوں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ میں حالات کی نزاکت سمجھ کر نیچے چلا گیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ ماجرا کیا ہے؟ کہنے لگے کہ مجھے پکی خبر ہے کہ ان ڈاک تھیلوں میں چرس بھیجی جا رہی ہے۔ ہمیں ان کی تلاشی لینا پڑے گی۔ تھیلوں کی تلاشی اور وہ بھی آدھی رات کو! یہ ناممکن تھا۔ کسی طرح میں نے ان تھیلوں کو ایک کمرے میں بند کروا کے اس پر تالا لگوا دیا اور ہدایت دی کہ صبح ان کی تلاشی لی جائے گی اس کے بعد ہی تھیلے ہوائی اڈے پر بھیجے جائیں گے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ سب کچھ بھول گئے تھے اور تھیلے روزانہ کی طرح ائیر پورٹ بھیجے گئے۔ مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہم دونوں انسپکشن کوارٹر (گیسٹ ہاؤس) میں بیٹھے خاموشی سے بہتے ہوئے جہلم کو دیکھ رہے تھے اور وہ چائے میں ملی شراب کی چسکیاں لے رہا تھا کہ آسمان پر ہوائی جہاز اڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”دیپک، دیکھو اس جہاز کی دم میں پنسل بم رکھا ہوا ہے۔ مجھے صبح آئی جی انٹیلی جنس نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ آج ایسا ہونے والا ہے۔ اب دیکھ لینا کچھ منٹوں میں یہ بم پھوٹ جائے گا۔“ میں حیرت سے ان کو تکنے لگا، اس حماقت پر ہنسنے لگا اور من ہی من میں سوچنے لگا کہ اگر انٹیلی جنس کے

آئی جی کو یہ خبر تھی کہ اس جہاز میں بم رکھا جائے گا تو کیا اس جہاز کو اڑنے کی اجازت مل جاتی۔ خیر مجھے 'یس سر، یس سر' کرنے کی اب عادت پڑ چکی تھی۔ اس 'یس سر' پر یاد آیا کہ انھوں نے ایک بار گفتگو کے دوران اپنے پیش رو کو نکما اور بے کار کہا جو مجھ سے برداشت نہ ہوا کیونکہ میں نے وید کمار سے کام کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اس لیے ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں نے 'یس سر، یس سر' کیا مگر ان کو احساس ہوا کہ میں ان کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ کہنے لگے "ہر بات پر یس سر کیے جا رہے ہو۔" اب مجھ سے رہا نہ گیا، بولا۔ "سر، ہم بیوروکریٹ بھی رنڈیوں کی طرح ہوتے ہیں، باس کیسا بھی ہو، ہمیں تعریف کرنا ہی پڑتی ہے۔ رنڈیوں کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے اور ہم بیوروکریٹس کی نظر باس کے قلم پر۔"

ایک مرتبہ دہش صاحب نے گورنر جگ موہن سے ملنے کی ٹھان لی اور ساتھ میں جنرل منیجر ٹیلی کام اور مجھے لے گئے۔ میں نے ان سے کئی بار گزارش کی کہ جانا ہے تو ہم دو ہی چلے جائیں گے مگر وہ نہیں مانے۔ جگ موہن کے سامنے تینوں بیٹھے تھے، سائیڈ میں ان کے ایڈوائزر وید مرواہا اور جلیل احمد قریشی بیٹھے تھے۔ ابتدا میں گورنر صاحب کو اپنا ٹیلی فون یاد آیا اور اس پر بہت دیر تک جی ایم ٹی سے گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد ان کے پاس ہماری بِپتا سننے کے لیے وقت نہیں تھا، اس لیے ہم سے ہمارے مسئلہ جات پر ایک بریف مانگا جو میں نے خوش قسمتی سے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ بریف ایڈوائزر کے ہاتھ میں دے دیا، نہ کوئی بات ہوئی اور نہ کسی مسئلے کا سمادھان نکلا۔ اٹھ کر واپس چلے آئے۔ جی پی او میں یونین لیڈر کھڑے تھے، دہش صاحب ان سے مخاطب ہوئے۔ "میں ابھی ابھی گورنر سے مل کر آیا ہوں، ان کے سامنے میں نے آپ کی مشکلات رکھیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر کہیں سے گولی آئے گی تو وہ پہلے میرے سینے پر لگے گی اور بعد میں میرے سٹاف پر۔" اچھی ولولہ انگیز سیاسی تقریر تھی۔ پھر میری جانب دیکھ کر کہنے لگے۔ "کیوں دیپک، کیا کہا میں نے گورنر صاحب سے؟" وہی رنڈیوں والا قصہ.....! مجھے تو 'یس سر' کہنا ہی پڑا حالانکہ جی میں آئی کہ کہہ دوں آپ کے منہ سے تو بات تک نہ نکلی۔ سامنے کھڑے یونین کے لوگ مطمئن ہو کر چلے گئے۔

نشے کے تو رسیا تھے۔ اک رات میں نے گھر پر ڈنر کے لیے بلایا۔ شراب پی کر گھر میں وارد ہوئے اور آتے ہی کچن میں گھس گئے۔ میری بیوی کو ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے کچھ کہنے لگے مگر اس نے

دھتکارتے ہوئے کہا کہ وہاں باہر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاؤ، کچن میں آپ کا کیا کام۔ اس کے بعد اسے 'شیرنی' کا لقب دے دیا۔ اسی طرح ایک روز مینادتا، اے پی ایم جی (اس کے نام کے ساتھ آنجہانی کا لاحقہ لگانا کچھ اچھا نہیں لگتا)، نے جموں میں ڈنر پر بلایا، وہاں ان کے فوجی خاوند سے رم کی ایک بوتل لے کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ٹھونس کر چلے گئے۔ ان کی شراب پینے کی حالت یہ تھی کہ اُدھم پور میں رات کو شراب پی کر بستر پر لیٹ گئے اور صبح جب کیئر ٹیکر ان کو جگانے کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ڈور میٹ پر پڑے سو رہے تھے۔

آخرکار کشمیر سے اپنی خلاصی پانے کی خاطر ایک جونیئر افسر این ڈی دیال کو، جس کے ساتھ ان کی دوستی بھی تھی، پھنسایا اور اسے قربانی کا بکرا بنا کر بحیثیت پی ایم جی جے اینڈ کے بھجوا دیا۔ این ڈی دیال، سیدھا سادہ، نیک بندہ، دیانت دار، بے چارہ دنیا کی چالوں سے بے خبر دو سال کشمیر میں اکیلے رہ کر اریموفوبیا (Eremophobia) کا شکار ہو گیا۔ خیر ان کے ساتھ بہت اچھے دن گزر گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مشورہ کر کے کام کرتے تھے۔ ان سے صرف ایک ہی گلہ رہا کہ میں نے ان کی ذمہ داری بہت حد تک سنبھالی اور انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دی مگر انھوں نے اس خدمت کی قدر دانی نہیں کی، نہ میرے سالانہ رپورٹ میں میری غیر معمولی کارکردگی کا ذکر کیا اور نہ ہی مجھے کسی ایوارڈ کے لیے سفارش کی جب کہ میں نے اپنے ماتحت ایس ایس پی کو میگھ دوت ایوارڈ اور دیگر مخلص اور محنتی ملازموں کو ڈاک سیوا ایوارڈ دلوائے۔

مرکزی محکمہ جات کا میں پہلا افسر تھا جس نے اپنے دفتر کا ایک حصہ جموں میں قائم کیا اور وادی سے بھاگے ہوئے مائیگرنٹ سٹاف کو وہاں پر ایڈجسٹ کر لیا۔ میری دیکھا دیکھی میں دوسرے محکموں کے افسروں نے بھی بعد میں ایسی ہی کارروائی کی۔ بات یوں ہوئی کہ مجھے سیکریٹری پوسٹ کیلاش پرکاش صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ ان کو چنتا ہو رہی تھی کہ ان کے جرنلسٹ بیٹے امت پرکاش کو السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا نے دہشت گردی پر رپورٹ بنانے کے واسطے کشمیر بھیج دیا۔ ان دنوں وادی میں دہشت گردی زوروں پر تھی۔ کیلاش پرکاش ٹیلی فون پر کہنے لگے۔ ''میرا بیٹا کشمیر میں دہشت گردی پر رپورٹ تیار کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ روتے روتے اس کی ماں کی جان ہلکان ہو رہی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''سر، آپ انھیں کسی فکر کے بغیر بھیج دیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کرلوں گا۔'' کچھ اور بھی باتیں ہوئیں جن سے ان کو پورا بھروسہ ہوا۔ امت اسی روز آیا، رات بھر جی پی او میں رہا، رات کو وِہسکی پی کر سوگیا، دو دن بعد اہم مقامات دیکھ کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کی خبر میں نے کیلاش پرکاش کو دے دی۔ ''سر، اِمت ہوائی جہاز میں بیٹھ چکا ہے۔ میرا کام یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ وہ بخیر و عافیت ہے۔'' قریب دو گھنٹے بعد پھر ٹیلی فون آیا۔ ''دیپک، بہت بہت شکریہ، امت تمھاری بہت تعریف کر رہا تھا۔ اس کی ماں بھی شکریہ کہہ رہی ہے۔ ..... اچھا یہ بتاؤ کیا میں تمھاری کچھ مدد کرسکتا ہوں؟'' کچھ لمحات کے لیے میں فکر مند ہوگیا۔ پھر شری بٹ کا وہ قصہ یاد آیا جب اسے ایسا ہی سوال سلطان زین العابدین بڈشاہ نے کیا تھا۔ اسی کی تقلید میں میں نے بھی جواب دیا۔ ''سر، مجھے تو اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہیے البتہ اگر آپ مدد کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ یہاں ہمارا ۷۰ رفیصد سٹاف جموں چلا گیا ہے۔ سرکل آفس تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ کب سے بند پڑا ہے۔ جموں و کشمیر میں نو ڈویژن ہیں جن میں دو ہی ڈویژن ملی ٹنسی کی زد میں آچکے ہیں اور باقی سات بھی سرکل آفس بند رہنے سے متاثر ہو رہے ہیں۔ میری یہ تجویز ہے کہ سرکل آفس کی ایک وِنگ جموں میں پی ایم جی کی نگرانی میں کھول دیجیے اور یہاں میں دو ڈویژن بطور ریجنل ڈائریکٹر کے سنبھال لوں گا۔'' چنانچہ دیال صاحب دیش کے خیمے کا آدمی تھا، اس لیے اس کے ساتھ بالکل ہی نہیں بنتی تھی۔ پی ایم جی کے نام کچھ برا بھلا کہہ کر انھوں نے کہا ''تم آنا چاہو گے کیا؟'' میں نے یہ کہہ کر کہ کوئی بھی انتظام مجھے منظور ہے، حامی بھرلی۔ اس پر وہ گویا ہوئے۔ ''تمھیں صبح دس بجے تک آرڈر مل جائے گا۔'' اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ وہ صبح سویرے منسٹر صاحب کے پاس چلے گئے، ان کو ساری بات سمجھائی اور پھر ان سے منظوری لی۔ دس بجے ان کے پرائیوٹ سیکریٹری نے مجھے ٹیلی فون پر دو لائن کا آرڈر سنایا کیونکہ تب تک ای میل وغیرہ کی سویدھائیں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ آرڈر میں لکھا تھا کہ ''دیپک کمار بدکی، ڈائریکٹر پوسٹل سروسز (ہیڈکوارٹرس)، جموں و کشمیر سرکل، مستقبل میں سرینگر کے بدلے جموں سے اپنا کام کریں گے۔'' آرڈر ملتے ہی میں نے پی ایم جی صاحب کے ساتھ مل کر سرکل آفس کا بٹوارہ کرنے کی سکیم بنالی اور جموں میں اس کا بڑا حصہ قائم کرلیا تاکہ مائیگرنٹ سٹاف وہاں پر ایڈجسٹ ہو سکے۔ سرکل آفس ملازموں کے بعد ڈاک خانے کے ملازموں کی باز آبادکاری بھی جموں اور نواحی علاقوں میں کی گئی اور ضرورت کے

مطابق ان کو سرینگر، اننت ناگ اور بارہ مولہ صدر ڈاکخانوں میں بھیجا گیا۔ اُدھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ وادی میں ڈاک خانوں میں سٹاف کی کمی کو کیسے دور کریں۔ چونکہ سب پوسٹ آفسوں میں ہندو سٹاف کے لیے سیکورٹی کا انتظام کرنا مشکل تھا اس لیے وہاں مقامی سٹاف کی تقرری کی گئی جبکہ ہیڈ آفسوں میں جہاں سیکورٹی فورسز تعینات تھے، تین تین مہینے کے لیے جموں و اُدھم پور سے سٹاف بھیجا گیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے کام واپس اپنے ڈھرے پر آتا گیا۔

ہندو سٹاف خصوصاً کشمیری پنڈت جو کشمیر سے بھاگ گئے تھے اکثر و بیشتر جموں اور اُدھم پور میں بس گئے تھے۔ جن کے رشتے دار جموں سے باہر تھے، انھوں نے وہاں پناہ لی۔ بعد میں کئی مرکزی سرکار کے ملازموں کی ایڈجسٹ منٹ جموں و کشمیر ریاست سے باہر ہوگئی، نتیجتاً وہ بھی دوسری ریاستوں میں اقامت پذیر ہوگئے۔ کچھ مسلمان اور سکھ ملازمین، جو ملی ٹینٹوں کے عتاب سے بچنا چاہتے تھے، وہ بھی وادی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ ہر سو عجب افراتفری تھی۔ جوں توں آفس کا کام شروع ہوا۔ سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ تھا مائیگرنٹ پنشنروں کے پنشن جموں ٹرانسفر کروانا۔ پھر پوسٹ آفس میں کھلے ہوئے کھاتوں کے ٹرانسفر کے لیے ایک سیل بنائی جس کا انتظام ایک دیانت دار ملازم راجندر بندرو کے ہاتھ میں دے دیا۔ چند ہی مہینوں میں لاکھوں کھاتے ٹرانسفر کروائے۔ اس طرح رشوت خوری کی جو چند شکایتیں آرہی تھیں، ان کا ازالہ ہوا۔ اس کے علاوہ بچت سرٹیفکیٹوں کا مسئلہ تھا، ہزاروں لوگوں کا سرمایہ ان میں جمع تھا اور وہ ہمارے پاس جوق در جوق آتے تھے۔ ان کی ادائیگی رجسٹریشن آفس کی تصدیق کے بغیر ناممکن تھی۔ میں نے ڈائریکٹوریٹ سے اجازت مانگ لی کہ بیس ہزار تک ہمیں توثیق کے بغیر ہی ادائیگی کی اجازت دی جائے۔ ڈی ڈی جی نے کہا کہ اس کے جینوئین ہونے کی تصدیق کون کرے گا؟ میں نے جواب دیا کہ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں، میں خود ہی کروں گا۔ اس طرح ایک اور بلا میں نے اپنے سر لے لی۔ مگر دل میں یہ تسلی تھی کہ مصیبت میں پھنسے مائیگرنٹوں کا کام تو چلے گا۔ جہاں تک میرا تخمینہ ہے میں نے تقریباً چار کروڑ بچت سرٹیفکیٹوں کی بے توثیق ادائیگی پر دستخط کیے ہوں گے۔ اگر مرتشی ہوتا اور صرف دس فیصد کمیشن باندھا ہوتا تو میری جھولی میں چالیس لاکھ روپے جمع ہوئے ہوتے۔ میرا ماننا ہے کہ روحانی کمائی مادی کمائی سے کہیں زیادہ تسکین دیتی ہے۔

وادی میں تقریباً ٦٥ ڈاک خانوں پر براہ راست حملے ہوئے، کسی کو بم پھینک کر ناکارہ بنایا گیا، کسی میں آگ زنی ہوئی، کسی میں لوٹ پاٹ ہوئی اور کچھ ڈاک خانے سنگ باری کی زد میں آتے رہے۔ ایسے ڈاک خانے بند ہو گئے۔ ادھر کرفیو، سول نافرمانی اور ہڑتالوں کی وجہ سے رہے سہے ملازمین بھی حاضر نہیں ہو پاتے تھے۔ ہم نے کئی سب پوسٹ آفسوں کو ہیڈ آفسوں میں کھول دیا اور سٹاف وہیں پر اپنا کام کرنے لگے۔ دوسری جانب ڈیلیوری سٹاف اپنا کام نہیں کر پا رہے تھے۔ انھیں شورش زدہ علاقوں سے گزر کر ڈاک اور پارسل بانٹنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ بے چارے جان ہتھیلی پر لے کر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، گھر گھر ڈاک بانٹتے پھرتے تھے۔ چونکہ مقامی ملازمین کو بھی بہت تناؤ میں کام کرنا پڑتا تھا اور ان کے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے اس لیے انھیں بھی کچھ مزید الاؤنس دیے جانے لگے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ قدرت نے مقامی ملازمین کی ریاضت اور دیانت داری کا امتحان لے لیا اور اس میں وہ سرخرو ہوئے۔ ایسا ماحول جس میں نہ انسپکشن ہوتے تھے اور نہ کہیں کسی پر نظر رکھی جا سکتی تھی، کشمیر میں ڈاک خانوں میں ہوئی خرد برد اور غبن کے کیسز کی شرح نارمل رہی۔ ایک دو کیسز مثلاً دیال گام اور کاک پورہ ایسے ضرور تھے جہاں پر پوسٹ ماسٹروں نے حالات کا فائدہ اٹھایا اور پولیس کچھ نہ کر سکی مگر میں نے ان کے پیچھے سی بی آئی لگا دی اور ان کو پکڑوانے کی کوشش کی۔ میں تہہ دل سے وادی کشمیر کے ملازمین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے لوگوں کی امانت میں خیانت نہیں کی اور اپنے محکمے کا نام بدنام نہیں ہونے دیا۔ مجھے ہمیشہ ڈاک خانے کی ایمانداری پر ناز رہا ہے۔

ملی ٹینسی کے دوران میں نے کئی اقدامات کسی سے پوچھے بنا ہی اٹھائے۔ ایک تو وادی کے لیے سپیڈ پوسٹ کی سہولت بند کر دی، فارین پوسٹ آفس جہاں بم پھٹ گیا تھا بند کر دیا اور غیر ملکی ڈاک اور پارسل دہلی فارین پوسٹ آفس کے توسل سے آنے جانے لگے کیونکہ سرینگر میں کسٹمز کلیئرنس دستیاب نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وادی کشمیر کی پارسل سروس بند کر دی گئی کیونکہ اندیشہ تھا کہ کسی پارسل میں بم نہ رکھے جائیں اور جنرل پوسٹ آفس میں دھماکہ نہ ہو جائے جسے کئی افراد ہلاک یا زخمی ہو سکتے تھے۔ تین چار برس کے بعد ڈائریکٹوریٹ نیند سے جاگ اٹھا اور مجھ سے یہ سروسز بند کرنے کا جواز پوچھ لیا۔ میں نے کہا کہ اس بارے میں سیکریٹری کی منظوری لی گئی تھی اور یہ بات فائل میں درج ہے۔ کون سی منظوری اور کہاں کی فائل!

...آخر کار کیس بند کر دیا گیا۔

ایک اور واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے جس میں خانیار کے سب پوسٹ ماسٹر عبدالقادر نے اپنی جان کی پروانہ کر کے اپنے ڈاکخانے کے کیش اور سامان کی حفاظت کی۔ ڈاکخانہ دوسری منزل پر تھا اور چڑھنے کے لیے لکڑی کی بنی ہوئی سیڑھی تھی۔ سیڑھی کے نیچے بم رکھا گیا تھا جس کے پھٹنے سے سیڑھی زمین سے اکھڑ کر لٹک گئی۔ مجھے جونہی خبر ملی تو فوراً وہاں پہنچا۔ ساتھ میں یونین لیڈر راین سی بالی تھا۔ اوپر جانے کا راستہ ہی نہیں تھا مگر میں لٹکتی ہوئی سیڑھی کے سہارے ہی اوپر پہنچ گیا۔ بالی بھی کچھ وقفے کے بعد باضابطہ سیڑھی لگا کر اوپر آیا۔ ایس پی ایم بائیں ہاتھ سے چھاتی کو دبا رہا تھا اور دائیں ہاتھ سے حساب ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے گھر جانے کے لیے کہا کہ مجھے لگا کہ اس کو کچھ پریشانی ہو رہی ہے۔ حساب کے بارے میں میں نے کہا کہ ہم خود ہی ملائیں گے۔ بہت کوشش کے بعد اس کے گروپ ڈی نے اس کو کسی خرچ کی یاد دلائی اور اس طرح حساب مل گیا۔ اس نے ڈیلی اکاونٹ بنا کر بالی کے حوالے کر دیا اور دفتر بند کر دیا۔ اس کا بھائی نیچے انتظار کر رہا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کو گاڑی میں گھر پر چھڑوانے کی پیش کش کی مگر وہ اپنے بھائی کے ساتھ چلا گیا۔ دو روز کے بعد وہ ہارٹ فیل کے سبب دنیا کو خیر باد کہہ گیا۔ فرض کے تئیں اس کی وفاداری اور جاں نثاری میں زندگی بھر کبھی نہیں بھول سکتا ہوں۔

وادی کے برانچ پوسٹ آفسوں میں کام کرنے والے ملازمین، جنھیں گرامین ڈاک سیوک (جی ڈی ایس) کہا جاتا ہے اور مستقل ملازم نہیں ہیں، بھی وادی سے بھاگ گئے تھے جس کے باعث کئی برانچ آفس بند ہو گئے۔ ان کو بھی جموں اور آس پاس کے علاقوں میں ایڈجسٹ کیا گیا۔ اس کارروائی میں کتنی مغز پچی ہوئی، میں ہی جانتا ہوں۔ کشمیری میں ایک کہاوت ہے ''نہ خر خوش تہٕ نہ خروول خوش'' (نہ گدھا خوش اور نہ گدھے کا مالک)۔ مطلب یہ کہ نہ وہ خوش جن کی روزی روٹی کا بندوبست ہم کر رہے تھے کیونکہ ان کو لگتا تھا کہ انھیں جو کچھ مل رہا ہے وہ بہت کم ہے اور نہ ہی محکمہ کے اعلیٰ افسران خوش کہ انھیں لگتا تھا کہ ہم سرکل کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔

کشمیری پنڈتوں کی باز آبادکاری میں جو رول میں نے ادا کیا وہ انسانیت کے تقاضے کے تحت کیا مگر فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر کو کیا کہیے، بے پر کی اڑاتے رہے۔ ایک ایسا انسان جس نے

کبھی یہ نہیں سوچا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان، کون سکھ ہے اور کون عیسائی، اس کو بھی فرقہ پرست ہونے کا لیبل لگایا گیا۔ مگر اس وقت میں ان چیزوں کی جانب زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کشمیری پنڈت ملازمین، جن کو میں ہر طرح کی امداد پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا، وہی ملی ٹینسی سے قبل مجھے مسلمان نواز کہا کرتے تھے اور ایس ایس پی کے معیاد عہدہ کے دوران میرے خلاف سازشیں کرتے تھے، سٹرائک کرتے تھے اور مجھے ڈویژن سے نکالنے کی کوششیں کرتے تھے۔

چونکہ سرکل آفس کئی مہینے بند رہا، میں گھر سے ہی سارا انتظام دیکھتا تھا اور افسروں و انسپکٹروں کی تعیناتی اپنی ذاتی ڈائری پر نوٹ کرتا تھا۔ ایک انسپکٹر نے اس افراتفری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ لداخ میں اس کی تقرری کی معیاد ختم ہو چکی ہے۔ افسر ہونے کے ناتے میں نے اس کی باتوں پر یقین کیا اور اس کا ٹرانسفر واپس جموں کر دیا۔ دوسرے افسروں نے جب احتجاج کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے لداخ میں ایک سال کی جگہ صرف تین مہینے کاٹے تھے۔ وہاں سے کسی نہ کسی بہانے چھٹیاں لیتا رہا اور پھر غلط بیانی کی۔ حقیقت معلوم ہونے پر میں نے واپس اس کا ٹرانسفر لداخ کر دیا۔ اس بات پر اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا، پہلے شیڈیول کاسٹ کمشنر اور پھر عدالت سے رجوع کیا۔ ٹرانسفر تو رد کرنا پڑا مگر میں نے اس کی پوسٹنگ ایسی جگہ کی جہاں نہ بالائی آمدنی کی گنجائش تھی، نہ ٹی اے کمانے کی اور نہ ذاتی بزنس کرنے کی۔ پورے دن آفس میں حاضری دینی پڑتی تھی۔ چنانچہ جموں میں اس کی ہارڈ ویئر کی دُکان تھی، وہ اپنی بزنس کی طرف دھیان نہیں دے سکا۔ کچھ مہینے بعد شکست خوردہ محسوس کر کے اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے باوجود میں اس کی کافی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ ڈوگری زبان کا شاعر تھا۔ جموں ہیڈ آفس کی صد سالہ تقاریب میں اس کو مشاعرے میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی۔ میرے ماتحت حیران ہوئے کہ میں اس کو کیوں دعوت دے رہا ہوں مگر میں نے ان سے کہہ دیا کہ ہماری نفرتیں دفتری کارکردگی کے سبب ہیں نہ کہ ذاتی معاملات کی وجہ سے۔ عجیب سی بات یہ ہوئی کہ استعفیٰ اس کے لیے برکت ثابت ہوئی۔ اس نے جموں میں جستہ جستہ بچوں کے لیے سکولوں کا ایک سلسلہ قائم کیا اور کچھ حد تک مقامی سیاست کے ساتھ بھی جڑ گیا۔

ڈاک خانے اور مرکزی بنکوں کو زک پہنچانے کے لیے طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں۔

سننے میں آیا کہ جموں و کشمیر بنک بھی شر پسندوں کی طرف داری اور سرمایہ کاری میں ملوث تھا۔ ایک سوچی سمجھی چال کے تحت افواہ پھیلائی گئی کہ بہت جلدی آزادی ملنے والی ہے، ہندوستانی بنک اور ہندوستانی ڈاک خانے مستقل طور پر بند ہونے والے ہیں، پھر یہ کہیں دکھائی بھی نہ دیں گے اور آپ کا سرمایہ ڈوب جائے گا، اس لیے اپنی ساری جمع پونجی جموں و کشمیر بنک میں ترنت ٹرانسفر کرلو۔ لوگ پریشان ہو گئے اور مرکزی بنکوں اور پوسٹ آفسوں سے بے تحاشہ روپیہ نکالنے لگے۔ بنک تو بہت دن بند رہے مگر جنرل پوسٹ آفس اور اہم سب پوسٹ آفس جو صدر ڈاکخانوں میں منتقل کیے گئے تھے، ڈھیل کے دوران یا پھر جب کرفیو نافذ نہیں ہوتا تھا، کام کرتے رہے۔ کسی ماتحت نے مجھے مشورہ دیا کہ ڈاک خانے میں روپیہ جمع ہونا بند ہو گیا ہے، الٹا لوگ بہت سارا روپیہ نکال رہے ہیں، اس طرح ڈاک خانے کا خزانہ خالی ہو رہا ہے۔ دوسری طرف بنک بند ہونے کی وجہ سے ہم ڈاک خانوں میں بھگتان کے لیے روپیہ بنک سے نہیں نکال پا رہے تھے۔ واضح رہے کہ ڈاک خانہ کا انحصار سٹیٹ بنک کے سرمائے پر ہوتا ہے۔ اس کی رائے تھی کہ ڈاک خانوں میں روپیہ ختم ہونے والا ہے، اس لیے ہمیں نکاسی بند کرنا چاہیے۔ میں نے اس مشورے کو نامنظور کرلیا اور سبھی ڈاک خانوں کو ہدایت جاری کی کہ کسی بھی شخص کا روپیہ نہ روکا جائے۔ جموں میں ہماری سینئر سپرانٹنڈنٹ مینا دتا ایک نڈر اور باہمت عورت تھی، اس سے میں نے بات کرلی۔ دوسرے روز جموں اسٹیٹ بنک سے ایک کروڑ روپیہ نکال کر وہ خود ہی سرینگر لے کر آگئیں اور اس طرح ہم لوگوں کی مانگیں پوری کرتے رہے۔ اس افسر کی بہادری کا کارنامہ آج تک نہیں بھلا پایا۔ حال ہی میں مینا جی کے سورگباش ہونے کی خبر سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ وہ آرمی پوسٹل سروس میں جنرل بن چکی تھی اور وہیں سے والنٹری ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور ہو چکی تھی۔ ہماری اس کارروائی کا مثبت انجام نکلا، حالات میں سدھار ہوتے ہی لوگوں نے ڈاک خانوں کو اپنی اپنی جگہوں پر منتقل کرنے کے لیے بہت مدد کی اور ڈاک خانے پر اپنا اعتماد دوبارہ جتانے لگے۔

یہاں پر ضمنی طور یہ بیان کرنا چاہوں گا کہ سرینگر میں ہیلتھ سروسز ٹھپ پڑ چکی تھیں۔ نہ ڈاکٹر تھے، نہ پیرا میڈیکل سٹاف اور نہ ہی دوائیاں۔ بیماروں کی تیمارداری کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا خاص کر سنٹرل گورنمنٹ ملازمین کے حوالے سے۔ چار پانچ ہسپتال تھے جو گھنی آبادی کے بیچوں بیچ واقع تھے

اور وہاں بے چوک و بے شبہ سیکورٹی کے پختہ انتظام نہیں تھے۔ ڈاک محکمہ ایسا پہلا محکمہ تھا جس نے اپنے ملازموں کو جی پی او کے اندر رہنے کا انتظام کر لیا تھا۔ تقریباً ایک سو کے قریب افسر، انسپکٹر اور کلرک احاطے میں رہنے لگے تھے۔ ان کے رہنے کے لیے چارپائیاں، بستر اور دیگر سہولیات محکمے نے میسر کر لی تھیں۔ ایک روز دفتر میں ایک ملازم کی صحت بگڑ گئی۔ میں اس وقت جموں میں تھا۔ ملازم جلدی سے پی ایم جی کے پاس چلے گئے اور فریاد کی کہ بیمار کو فوراً ہسپتال یا ڈاکٹر کے پاس پہنچایا جائے۔ پی ایم جی صاحب پریشان ہو گئے اور اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر کرن نگر ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ کسی نے ڈاکٹر صاحب کو یوں ہی کہہ دیا کہ اس کلرک کے ساتھ بذاتِ خود پی ایم جی آئے ہیں۔ اب ڈاکٹر کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ اس نے اپنے کلینک کا دروازہ فوراً بند کر لیا، جلدی سے مریض کی تشخیص کی، کچھ دوائیاں اپنے سٹاک میں سے دیں اور کچھ لکھ کر اور پھر ساتھ میں آئے ملازم سے مخاطب ہوا۔ ”بھائی صاحب، یہاں سے فوراً چلے جاؤ، یہاں زیادہ دیر رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ لوگ صاحب کو لے کر کیوں آ گئے؟“ اس واقعے کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ کشمیر میں ان دنوں ہر طرف بدنظامی تھی۔ آئی اے ایس افسروں اور سیاست دانوں نے اپنے اپنے خیمے پختہ کر لیے تھے مگر عام آدمی اور دیگر افسروں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کیا یہ حکمران کی ڈیوٹی نہ تھی کہ وہ ان سبھی ملازمین کے لیے ایک ایسے ہسپتال کا انتظام کروا لیتا جو ملی ٹنسی ایریا میں نہ ہوتا اور جہاں ان کو کسی ڈر و خوف کے بغیر داخل کیا جا سکتا تھا مثلاً ڈل گیٹ ہسپتال یا نرسنگ ہوم کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس طرف کسی نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ البتہ کچھ وقفے کے بعد ہم نے ڈائریکٹوریٹ سے اجازت لے کر ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کا انتظام کیا جو روزانہ ایک گھنٹے کے لیے جی پی او آ جاتا تھا مگر اس کا محنتانہ اتنا کم تھا کہ ایک اچھا ڈاکٹر اس رقم پر ملنا مشکل تھا۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریک دور میں تین چار ملازمین کی موت واقع ہوئی اور ان کی لاشیں میل گاڑی کے ذریعے سرینگر سے جموں ان کے لواحقین کے پاس بھیجنا پڑیں۔ بقول میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی:

؎ زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا الٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

کچھ عجیب سے ذاتی تجربے بھی ہوئے۔ چند افسر ویشنو دیوی کے درشن کرنے کے لیے جموں

چلے آتے تھے۔ ایک افسر نے مجھے رازدارانہ طور پر کہا کہ اس کی ترقی ہونے کا جب بھی امکان ہوتا ہے تو وہ ویشنودیوی کی یاترا ضرور کر لیتا ہے اور اس کی مراد کبھی خالی نہیں جاتی۔ مجھے ہنسی آ گئی اور بڑے ہی مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ’’سر، اس حساب سے تو مجھے ایک بھی ترقی نہیں ملنی چاہیے تھی کیونکہ میں تو مندر مسجد کہیں بھی نہیں جاتا، یاترا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا جواب سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ ویشنودیوی کی یاترا سے ہی جڑا ہوا ایک اور تجربہ بیان کرتا ہوں۔ ڈائریکٹوریٹ میں ایک افسر تھے کے ایل ابرول، وہ ویشنودیوی یاترا کرنے کے لیے جموں آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ قریب چھ گھنٹے کا سفر تھا اور واپسی میں بھی چار گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران وہ بولتے چلے گئے، ایک کہانی ختم ہو جاتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ میں نے کئی بار بیچ میں مداخلت کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ٹوک دیا اور اپنا بیان جاری رکھا۔ مجھے ہمیشہ یہ زعم تھا کہ میں جب بولتا ہوں تو کسی اور کو بولنے کی کیا مجال۔ اس لیے جب ہم واپس انسپکشن کوارٹر پہنچ گئے تو میں نے مذکورہ افسر سے عرض کی۔ ’’سر، ایک بات کہوں۔ آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرا منہ دس گھنٹے کے لیے بند کر دیا۔ میں آپ کو مان گیا۔‘‘

جموں میں پہلی بار آیوروید کا تجربہ ہوا۔ میں بواسیر (Piles) کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا کہ ایک رشتے دار نے مجھے ایک عمر رسیدہ آیوروید حکیم کا ایڈریس بتا دیا۔ ان سے دوائی لیتا رہا کہ اس درمیان میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی ایسی دوائی تو نہیں جس سے میرے چڈّے کی داد اور کھجلی ختم ہو جائے۔ اس نے سرسوں کے بیج کی مانند کچھ دوائی دی اور کہا کہ اس کو سرسوں کے تیل میں گھول کر لگا لینا۔ گھر جا کر جب پہلی بار لگائی تو ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے تیزاب چھڑک دی ہو۔ پورے کمرے میں اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا کہ برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر جگہ بھی تو نازک تھی۔ اس لیے جلدی سے تولیا سے صاف کر لیا۔ دوسرے روز پھر لگا لیا مگر اس بار کل کے مقابلے میں کم پریشانی ہوئی۔ الغرض میں نے دوائی چار پانچ بار لگائی اور اس کے بعد مرض سے ایسا چھٹکارا ملا کہ آج تک کبھی کھجلی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کاش اس دوائی کا نام معلوم ہوتا تو یہاں لکھ دیتا۔ یہ دیسی علاج کی بڑی کمزوری ہے کہ حکیم یا وید آپ کو دوائی کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں دیتے۔ جہاں تک بواسیر کا تعلق ہے، جموں صدر ڈاک خانے کا سینئر پوسٹ ماسٹر مجھے ایک بہت ہی مشہور حکیم، وید وشنودت، جو بعد میں بی جے پی کی جانب سے ایم پی

بھی بنا، کے پاس لے گیا کیونکہ اس کی دُکان پوسٹ ماسٹر کے گھر کے نزدیک تھی اور وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وید جی نے معائنہ کیا اور پھر اسسٹنٹ سے کچھ دوائیاں الماری سے نکالنے کو کہا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا کہ سگریٹ، چائے اور شراب پینا ترک کرنا پڑے گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں مگر چائے نہیں چھوڑ سکتا۔ بچپن ہی سے مجھے ۲۰-۲۵ کپ روزانہ چائے پینے کی عادت پڑی تھی۔ وید جی نے اپنے اسسٹنٹ سے دوائیاں الماری میں واپس رکھنے کو کہہ دیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''پھر تو آپ جا سکتے ہیں، میرے پاس آپ کو صحتیاب کرنے کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔'' میں حیران و پریشان اور سینئر پوسٹ ماسٹر اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ پھر میں نے اسے آشواسن دیا کہ میں کوشش کروں گا کہ کل سے چائے بند کر دوں۔ گھر جا کر بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا مگر وعدہ تو نبھانا تھا سو نبھا لیا، آخر اپنی بھلائی کی ہی تو بات تھی۔ دو تین مہینوں کے اندر ہی میری بواسیر کی بیماری غائب ہو گئی۔

دوسری پاری کا اختتام دسمبر ۱۹۹۱ء میں ہوا کیونکہ مجھے نیشنل ڈیفنس کالج، دہلی کے ۳۲ ویں کورس کے لیے نامزد کیا گیا۔ کورس کی میعاد دس مہینے تھی۔

☆☆☆

نیشنل ڈیفنس کالج کی چند یادیں

۱۹۹۲ء میں مجھے نیشنل ڈیفنس کالج (این ڈی سی) کورس کے لیے دہلی بھیجا گیا۔ یہ کورس دفاعی تربیت کا اعلیٰ ترین کورس ہے جہاں بری، بحری اور ہوائی فوج، تینوں سے متعلق اعلیٰ افسران تربیت پاتے ہیں جن سے مستقبل میں فوج کی اعلیٰ کمانڈ سنبھالنے کی امید ہوتی ہے۔ سِول ایڈمنسٹریشن سے بھی کچھ اعلیٰ افسر شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بیرونی ممالک کی افواج سے کئی امیدوار برائے شرکت چلے آتے ہیں۔ اس کا موازنہ امریکا کے نیشنل وار کالج سے کیا جاسکتا ہے۔ بہت ہی اچھا کورس تھا، کھیل کھیل میں دس مہینے کے اندر بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ طعام وقیام کا انتظام این ڈی سی کی طرف سے کیا جاتا ہے جو کسی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں ہوتا۔ دوپہر کا لنچ کالج میں دیا جاتا تھا جبکہ بریک فاسٹ اور رات کا کھانا گھر پر بنوانا پڑتا تھا۔ جب تک میں اکیلا تھا مجھے انڈیا گیٹ کے پاس رکھشا بھون میں رہنے کے لیے جگہ ملی تھی۔ وہاں کھانا بنانے کے لیے ایک خادمہ کا انتظام تھا جس کا نام سُدھا تھا۔ وہ نہ صرف کھانا بناتی تھی بلکہ صاف صفائی اور کپڑے وغیرہ بھی دھوتی تھی۔ دبلی پتلی چھریرے بدن والی پُرخلوص عورت، وہ دو بچوں کی ماں نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا شوہر گلف کے کسی ملک میں ملازمت کرتا تھا۔ ہاؤس کیپنگ میں وہ اتنی مشتاق تھی کہ بڑے سے بڑے ہوٹل کی ہاؤس کیپر کے بھی کان کاٹ لیتی۔ کچھ مہینوں کے بعد مجھے این ڈی سی کی جانب سے کاکانگر میں فیملی کوارٹر مل گیا اور میں نے وہاں شفٹ کرلیا۔ کچھ ہی دنوں میں میرے بال بچے بھی جموں سے آگئے۔ ٹریننگ ختم ہوتے ہی مجھے دہلی میں ایڈجسٹ کرلیا گیا اور پرگتی وہار ہوسٹل میں سنگل روم ہوسٹل میں شفٹ ہونا پڑا۔

این ڈی سی کورس میں فوجی ٹریننگ کے بدلے عالمی جنگی منظرنامے کے بارے میں جانکاری دی جاتی ہے۔ مختلف ممالک کی فوجی طاقت، امداد باہمی، جنگی گروہ بندی اور اس کا دوسرے ممالک پر اثر،

ماضی قریب میں ہوئی جنگوں کا تجزیہ اور اقوام متحدہ کے رول کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اس کالج میں آپ بے خوف اپنا نظریہ پیش کر سکتے ہیں مگر جو کچھ اس چار دیواری میں کہا جاتا ہے اس کی اشاعت باہر نہیں ہوتی۔ قانون سازیہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے علاوہ آزاد مفکروں کو بحیثیت مہمان مُقرّر (Visiting Lecturer) بلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شرکا کو دفاع سے متعلق ہندوستان کے پہاڑی، میدانی، ریگستانی اور بحری علاقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس کورس کی بدولت اینڈمان نکوبار، آندھرا کے نکسل علاقوں اور راجستھان کے ریگستانی علاقوں خصوصاً پوکھران، جہاں ایٹم بم کا تجربہ کیا گیا تھا، وغیرہ سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ہندوستانی بحریے کے جہازوں اور فضائیہ کے طیاروں میں سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ نیشنل ڈیفنس کالج کے توسط ہی سے چند بیرونی ممالک جیسے دبئی، قاہرہ، روم اور فرانس کا سفر کرنے کی خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ جہاں بھی گئے وہاں کے دفاعی محکمے نے اپنے ملک کی دفاعی تیاریوں کے بارے میں ہمیں آگاہ کیا اور اس طرح ان ممالک کے فکر، فنِ حرب، فوجی تیاریوں اور حکمت عملی کا علم ہو گیا۔ کالج نے مختلف ممالک کے لیے مختلف گروپ بنائے تھے، میں نے یہ روٹ اس لیے چنا تھا کیونکہ مجھے روم میں سسٹین چیپل کی اندرونی چھت پر ۱۵۰۸-۱۲ء کے درمیان میکل اینجیلو (Michelangelo) کی بنائی ہوئی پینٹنگز دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ان تصویروں میں حضرت آدم کا زمین پر نازل ہونا اور بائبل کی دوسری کہانیاں ظاہر کی گئی ہیں۔ میکل اینجیلو کا پرستار میں اس دن سے بنا تھا جب سے میں نے براڈوے میں انگریزی فلم ’دی اگونی اینڈ دی ایکس ٹیسی‘ (The Agony & The Ecstacy) دیکھی تھی، پھر کئی سال بعد اسی عنوان سے وہ سوانحی کتاب بھی پڑھی جس کی بنیاد پر یہ فلم بنائی گئی تھی اور جسے اِروِنگ سٹون (Irving Stone) نے لکھا تھا۔ ان کی وین گوخ (Van Gogh) پر لکھی گئی سوانحی کتاب ’دی لسٹ فار لائف‘ (Lust for Life) نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ سسٹین چیپل کی دیوار پر کئی مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں بھی ہیں۔ بد قسمتی سے جس روز ہم وہاں پہنچے اس روز چیپل بند تھا اور میرا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اٹلی کے دارالخلافہ روم میں ہمارا قیام بس ایک ہی دن کا تھا۔ شہر اپنی قدیم شان و شکوہ کا اشتہار ہے، کچھ خوبصورت گرجا گھر ہیں جن سے رومن سلطنت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور پھر کولوسیم کے کھنڈرات ہیں جو انسانی درندگی اور بہیمیت کی یاد دلاتے

ہیں۔

دبئی اور شارجہ میں بھی ایک روز قیام کیا۔ پیٹرو ڈالروں نے اس ریگستان کو شداد کے اِرم میں تبدیل کیا ہے مگر نہ کہیں تہذیبی روایتیں ملتی ہیں اور نہ ہی انسانی عظمت کی وہ داستانیں سننے میں آتی ہیں۔ ہر طرف اونچے اونچے مال کھڑے ہیں، ٹیکس نہ کے برابر ہونے کے سبب تجارت پھل پھول رہی ہے اور ہر طرف سونے چاندی کی کھنک سنائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس مصر کی راجدھانی قاہرہ اپنی قدیم تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ ہندوستان میں دوبارہ پہنچ گئے۔ وہی بازاروں کا شور وغل، وہی سیخ کباب اور تکّے بنانے والے اور وہی لوگوں کی خرمستیاں۔ مصر کے آثار قدیمہ اب بھی اپنی آب و تاب سے کھڑے ہیں۔ غزہ کے علاقے میں اہرام اور تین ہزار سال قبل مسیح ایک پہاڑ سے تراشا گیا ۱۸۹X۶۵ فٹ کا نرسنگھ جسے ابوالہول (Sphinx) کہا جاتا ہے قدیم عجائبات ہفتگانہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا سر انسان کا ہے اور دھڑ اور پنجے شیر کے ہیں۔ قیاس ہے کہ اس کو سورج دیوتا مان کر پوجا جاتا تھا۔

فرانس کا دارالخلافہ پیرس یورپ کا نمائندہ شہر ہے جو اپنی قدیم تہذیب، آرٹ اور لٹریچر کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کی فضا میں ایک عجیب سی کلاسیکیت اور رومانیت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں کی تاریخی عمارتیں اور میوزیم دیکھ کر میں بہت محظوظ ہوا۔ دل تو چاہتا تھا کہ ایک ایک میوزیم کئی کئی دن دیکھ کر آنکھوں میں سمالوں۔ لوور میوزم میں لیونارڈو ڈاونچی کی مشہور زماں پینٹنگ 'مونالزا' اور اس کی فتنہ پرداز مسکراہٹ دیکھنے کی خوش نصیبی بھی حاصل ہوئی۔ پیرس کے علاوہ جنوبی فرانس کا ساحلی شہر ماسے (Marseille) جو دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک اہم مقام بن چکا تھا، بھی دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

این ڈی سی کلاس میں تقریر کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ لیکچرر دوپہر سے قبل اپنی تقریر ختم کرتا تھا اور کھانا کھانے کے بعد اس سے سوال پوچھے جاتے تھے۔ کچھ نکتوں پر میری گرما گرم بحث ہوئی۔ ایک بار انڈین فارین سروس کے سابقہ رکن اور سابقہ وزیر خارجہ نٹور سنگھ نے 'انڈو سری لنکن اکارڈ' Indo-Srilankan Accord پر لیکچر دیا۔ میں نے اس حوالے سے ایک سوال کیا۔ ''آپ نے اپنے لیکچر کے آغاز میں کہا کہ ہندوستان امن پسند ملک ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ گوا، دمن اور دیو میں

کس نے فوج بھیج دی، سکم کو کس نے یونین کے ساتھ ملایا، مالدیوز میں کس کی فوج گئی اور پھر سری لنکا میں کس ملک نے فوج بھیج دی۔ آپ یہ کہنے سے کیوں کتراتے ہیں کہ ہندوستان اپنی سالمیت اور حفاظت کے لیے اپنے پڑوسی ملکوں میں کسی غیر ملک کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ سری لنکا کا لیڈر پربھاکرن 'ایلام' (آزادی) کی مانگ کر رہا تھا، اس لیے امن بحال کرنے کے لیے سری لنکا کے صدر جے آر جے وردھنے اور پربھاکرن کے درمیان معاہدہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر آپ کی وجہ سے معاہدہ راجیو گاندھی اور جے وردھنے کے درمیان ہوا، جو سفارتی نادانی اور ناسمجھی تھی۔ آپ نے دنیا کو اعلانیہ بتا دیا کہ اگر سری لنکا سرکار ہم سے سمجھوتا کرتی ہے تو وہاں امن بحال ہوگا۔ اس سے یہ بھی تو مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ وہاں جو دہشت گردی کی آگ لگی ہوئی ہے وہ ہماری شہ پر لگی ہے۔ پربھاکرن کو خاموش کرنے کے لیے جے وردھنے کو ہماری ہر بات ماننی پڑے گی۔'' نٹور سنگھ کے تن بدن میں آگ لگ گئی، تحیّر کے عالم میں اس نے توثیق کے لیے پوچھا؛ ''کیا میں آپ کا نام پھر سے جان سکتا ہوں۔'' میں نے کسی خوف یا اندیشے کے بغیر اپنا نام اور محکمے کا نام بتا دیا۔ جواب تو اس کے پاس تھا نہیں اس لیے اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھانے لگا۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد اس نے کمانڈنٹ سے میری شکایت کی کہ ایسے سوالات کی اجازت آپ کیسے دیتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ شرکا کو اس چار دیواری کے اندر کچھ بھی پوچھنے کی چھوٹ ہے بشرطیکہ بات اس چار دیواری تک ہی محدود رہے۔ نٹور سنگھ تو منجھے ہوئے سفارت کار رہے تھے، کیسے ہار مانتے، کہنے لگے۔ ''مگر آپ کو سوچنا چاہیے کہ یہاں پر اتنے سارے غیر ملکی شرکا بھی ہیں وہ کیا پیغام لے کر واپس جائیں گے۔'' کمانڈنٹ کو بات معقول لگی اور اس نے مجھے زود حس سوالات پوچھنے پر پابندی لگا دی۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل تو کر لی مگر ان کو جوابا کہا کہ ''آپ میرا منہ تو این ڈی سی میں بند کر سکتے ہیں مگر اقوام متحدہ میں ایک سو نوے ممالک کے نمائندوں کے منہ بند نہیں کر سکتے۔'' سوالات پوچھنے کے بارے میں ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے حوالہ مارکیٹ پر لیکچر دیا۔ میں سوال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''سر، آپ کو اردو شاعری سے دلچسپی ہے اس لیے پہلے علی احمد جلیلی کا ایک شعر سناتا ہوں:

؎ نشیمن ہی کے لُٹ جانے کا غم ہوتا تو کیا غم تھا
یہاں تو بیچنے والوں نے گلشن بیچ ڈالا ہے

سر، کرپشن شروع ہوتا ہے آپ سیاست دانوں سے۔ سارا معاشرہ ہی کرپٹ ہے پھر آپ کس کس کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے؟'' انھوں نے متانت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''دیکھیے، کرپشن کو ختم کرنے کے لیے میرے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک یہ کہ میں ان لوگوں سے لڑوں جو کرپشن کو تقویت پہنچاتے ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں اور وہ کثرت میں، ایسے تناظر میں ممکن ہے کہ وہ مجھے ہی اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان کے درمیان میں رہ کر ان کے پر کترتا رہوں اور آہستہ آہستہ ان کی بیخ کنی کروں۔ میں نے دوسرا آپشن اختیار کیا ہے۔'' مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس بات کو گرہ باندھ کر رکھ لیا اور خود اس پر عمل کرنے لگا۔ مگر منموہن سنگھ صاحب اپنے قول پر کتنا چلے اور کامیاب ہوئے، وہ تب پتا چلا جب وہ ملک کے وزیر اعظم بنے اور ان کی آنکھوں کے سامنے گھوٹالے پر گھوٹالے ہوتے رہے۔ وہ خاموش بت کی طرح انھیں دیکھتے رہے اور اپنی کرسی بچاتے رہے۔ دیوتا بھی کبھی کبھار جبلی خواہشات کے سامنے سر جھکاتے ہیں!

نیشنل ڈیفنس کالج کے لیے میں نے ایک مقالہ بعنوان 'کشمیر مسئلے کا آغاز اور آرٹیکل ۳۷۰' (Genesis of Kashmir Problem & Article 370 of The Constitution) قلم بند کیا تھا۔ مقالہ طویل تھا، اس کے لیے میں نے بہت محنت کی تھی اور کئی کتابوں اور اخباروں میں چھپے مضامین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ کالج کی پالیسی کے مطابق اس مقالے کو شائع نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے جملہ حقوق کالج کے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ بہر حال یہ مقالہ تیس جنوری مارگ، دہلی پر واقع نیشنل ڈیفنس کالج کی لائبریری میں دستیاب ہے۔

☆☆☆

ڈاک جیون بیمہ-ایک یادگار دور

این ڈی سی کورس کے اختتام پر میری پوسٹنگ ڈائریکٹوریٹ کے پوسٹل لائف انشورنس (پی ایل آئی) سیکشن میں ہوئی۔ دراصل مجھے پوسٹل لائف انشورنس شعبے میں بھیجنے کی سازش میرے ایک سابقہ باس ایس سی سرمانے کی تھی جو خود ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل (پی ایل آئی) سے خلاصی پانا چاہتا تھا۔ ڈی ڈی جی (پی ایل آئی) ایک سکھ خاتون تھیں جن کے ساتھ کوئی بھی کام کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ خود کچھ بھی کام نہیں جانتی تھیں مگر اپنے ماتحتوں سے چکنی چپڑی باتیں کر کے یا پھر جھڑکیوں اور دھمکیوں سے کام نکالنے میں ماہر تھیں۔ صبح دیر سے دفتر آجاتیں، کچھ دیر اپنے پی اے اور سیکشن کے اے ایس پی کے ساتھ گپیں ہانکتیں، پھر لنچ ٹائم پر ان کا شوہر آجاتا جو ان کے ٹیلی فون سے اپنی بزنس کر لیتا۔ تب تک میں اپنا سارا کام نبٹ لیتا تھا۔ چنانچہ مجھے پہلی ہی پوسٹنگ میں اس طرح کی باس کا سامنا کرنا پڑا تھا، میں نے اے ایس پی کو وارننگ دی کہ وہ چاہے جو کچھ بھی کرے مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر میرے خلاف کوئی سازش نہ کرے ورنہ اس کو عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ دفتر میں ڈی ڈی جی کی بیٹی کی بیماری کے بارے میں عام چرچا تھا کہ وہ بہت عرصہ پہلے سخت بیمار ہوئی تھی اور اس کو علاج کے لیے امریکا بھیجا گیا تھا جس کے باعث اس کی ماں کو مالی اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس حوالے سے ایک دفعہ ڈی ڈی جی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ میری بیٹی نے امریکا سے اپنا میڈیکل بل فیکس کے ذریعے بھیج دیا ہے، اس کی توثیق کر لو۔ ایک تو باس کی درخواست اور اس پر بیٹی کی مہلک بیماری سے واپسی کی خبر جو ہر کوئی جانتا تھا، میں نے زیادہ غور کیے بغیر کاغذ پر دستخط کر لیے۔ کچھ دیر بعد اے ایس پی میرے کمرے میں آیا اور باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ آپ تو کہتے تھے کہ میں بڑے احتیاط سے کام کرتا ہوں اور کوئی غلط کام نہیں کرتا تو پھر آج آپ نے یہ کیا کیا؟ کیا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے اوریجنل سرٹیفکیٹ دیکھ لی تھی؟ ہو سکتا ہے یہ فیکس نقلی ہو۔'' میں گہری سوچ میں پڑ

گیا۔ بندہ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ فیکس امریکا سے کوئی بھی بھیج سکتا ہے۔ کیا معلوم اس نام کا کوئی ہسپتال امریکا میں ہے بھی یا نہیں؟ میں اندر ہی اندر پریشان ہونے لگا۔ اے ایس پی چلا گیا۔ میں نے ڈی ڈی جی کو ٹیلیفون ملایا اور کہا۔ ”میڈم، جو اٹیسٹیشن میں نے آپ کے دیے ہوئے کاغذ پر کی تھی وہ صحیح نہیں لگتی کیونکہ اس کا اوریجنل مجھے نہیں دکھایا گیا۔ اس لیے آپ اسے میرے پاس بھجوا دیں تا کہ میں اس پر اپنے دستخط رد کر دوں۔“ وہ بھڑ گئیں اور کہنے لگیں۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو بل میڈیکل برانچ میں بھر دیا ہے۔“ میں نے پھر التجا کی کہ آپ وہاں سے واپس منگوائیے اور مجھے بھیج دیجیے مگر وہ نہیں مانیں۔ میں نے فوراً ایک خط میں ساری کہانی رقم کر کے توثیق شدہ لیٹر واپس بھیجنے کی درخواست کی اور اسے اپنے آفس پیون کے ہاتھ بھجوا دیا۔ ڈی ڈی جی نے خط پڑھ لیا، ترنت اپنے وکیل سے، جو کورٹ میں ان کے ڈیپارٹمنٹل فراڈ کیس کی پیروی کر رہا تھا، ٹیلی فون پر صلاح مشورہ کیا، پھر فوٹو کاپی لے کر میرا خط لینے سے انکار کر لیا۔ میں نے کون سی کچی گولیاں کھیلی تھیں، اپنے بھیجے ہوئے خط کے حاشیے پر آفس پیون سے حرف بہ حرف سارے واقعات لکھنے کو کہا اور سامنے بیٹھی اپنی پی اے سے اس کی تصدیق کروائی۔ پھر اس کی زیراکس کاپی اور اوپر ایک اور چٹھی لکھ کر رجسٹری کر کے ڈی ڈی جی (پی ایل آئی) کے نام بھیج دی۔ ڈاک خانے سے رجسٹری کروا کے میں سیدھے ڈی ڈی جی میڈیکل، جو بنگالی تھے، کے پاس چلا گیا اور ان کو اپنی چٹھی کی نقل تھما دی۔ ان کے سامنے بیٹھے سیکشن سپروائزر اور پی اے، جو دونوں سردار تھے، کی جانب اشارہ کر کے ڈی ڈی جی کو اپنے خلاف ہو رہی سازش سے آگاہ کیا۔ انھوں نے میرا خط واپس تو نہیں کیا مگر فائل سامنے رکھ کر اس پر ثبت کی گئی میری تصدیق کو رد کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے دو اور نقلیں بنوائی تھیں جن پر میں نے سی بی آئی اور چیف وجیلنس کمشنر کا نام لکھ دیا تھا اور جنھیں مصلحتاً دوسرے روز بھیجنے کا ارادہ تھا۔ چنانچہ میرا کام تو ڈی ڈی جی میڈیکل نے کر دیا اس لیے میں نے وہ نقلیں ارسال نہیں کیں۔ ڈی ڈی جی پی ایل آئی کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ مجھے ڈھونڈنے لگیں مگر تب تک تو میں پوری کارروائی کر کے آرام سے اپنے گھر چلا گیا تھا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دوسرے روز میرا اے ایس پی میرے کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔ ”سر، ایک بات آج بہت دنوں کے بعد بتانا چاہتا ہوں۔ جب آپ یہاں پوسٹنگ پر آنے والے تھے کسی نے مجھ سے کہا کہ تمھارا جو ڈائریکٹر آ رہا ہے اس سے تو اس کے باس بھی ڈرتے ہیں۔

میں نے سوچا ایسا کیسے ہوسکتا ہے، یہ تو ناممکن ہے۔ مگر کل جو دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا۔" سالانہ خفیہ رپورٹ لکھتے وقت ڈی ڈی جی نے مجھے پریشان کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے سیکریٹری کے نام ایک درخواست بھیج دی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا اے سی آر (Annual Confidential Report) نہیں لکھا گیا ہے، مہربانی کرکے ڈی ڈی جی کو لکھنے کی ہدایت دیں۔ نہ لکھنے کی حالت میں مجھ پر کوئی ذمے داری عاید نہ ہوگی۔ میری درخواست شمس الرحمن فاروقی، ممبر ڈیولپمنٹ، کے پاس پہنچ گئی۔ وہ خفا ہوگئے کہ مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے جواباً عرض کی۔ "چونکہ میں آپ کو جانتا ہوں اس لیے دفتری کام میں اس جانکاری کا فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔" انھوں نے ڈی ڈی جی سے ٹیلی فون پر بات کی اور جلد از جلد میرا اے سی آر بھیجنے کی تاکید کی۔ رپورٹ آیا، فاروقی صاحب نے اس کی مثبت تصدیق کی اور ہائی ایوریج گریڈ دے کر داخل دفتر کر دیا۔

اِدھر ایک بلا ٹل گئی اور اُدھر دوسری چلی آئی۔ پہلی ڈی ڈی جی تو جذباتی قسم کی پھوہڑ عورت تھیں جن کو اگر میں چرب زبان ہوتا، خوش کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہوتی مگر ان کی جگہ جو نئے ڈی ڈی جی، بی کے موہانتی، آئے وہ تو رنگے سیار تھے۔ نرم لہجہ، خوشامدی، بغل میں چھری اور منہ میں رام رام۔ ان کو دیکھ کر رینگتے کیڑے، جس سے جسم میں سنسنی پیدا ہوتی ہے، کی یاد آتی تھی۔ ادنیٰ یونین لیڈر بھی آتا تو کھڑے ہوکر اس سے بغل گیر ہوتے، خود اڑیہ تھے مگر بنگالی ممبر کو اس کے کمرے میں بھائی کہتے اور کمرے سے باہر نکل کر گالیاں دیتے۔ موہنتی خود کو مورخ سمجھتے تھے۔ جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کی موت کا سبب جگن ناتھ پوری کا اپمان بتاتے تھے جو ان کی تنگ نظری اور تعصب کا آئینہ دار تھا۔ ایسے افسر کی تعظیم کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ ان دنوں انشورنس سیکٹر میں حکومت بدلاؤ لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چونکہ میں ذاتی طور پر شیئرس کے ساتھ وابستہ تھا، میرے پاس بزنس انڈیا میگزین آتا تھا۔ اس میں ملہوترا کمیٹی فار ریفارمز ان اِنشورنس سیکٹر (Malhotra Committee for Reforms in Insurance Sector) کے بارے میں کافی اچھا مضمون چھپا تھا۔ میں نے کمیٹی کے کنسلٹنٹ سے رابطہ قائم کرلیا اور اس سے شکایت کی کہ محکمہ ڈاک انشورنس سیکٹر میں بہت بڑا کھلاڑی ہے، پھر ہمیں شرکت کی دعوت کیوں نہیں دی گئی۔ اس نے ایک بریف بھیجنے کے لیے کہا جو میں نے ایک ہی دن میں تیار کرکے شمس الرحمن

فاروقی، ممبر ڈیولپمنٹ کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے ان کو اپنے منصوبے کے بارے میں پہلے ہی اطلاع دی تھی۔ فاروقی صاحب تو بہت ہی قابل اور رجائیت پسند ایڈمنسٹریٹر تھے، انھوں نے میرا بریف پڑھ لیا اور بہت خوش ہوئے۔ صرف ایک لائن کاٹ لی جس میں لکھا تھا کہ پوسٹل لائف انشورنس میں پورا معاوضہ نہ ملنے کی وجہ سے ڈاک ملازمین کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ فائنل کاپی پر دستخط کر کے انھوں نے کہا کہ اس کو بھجوا دو۔ میں نے پوچھا کیا سیکریٹری صاحب کو پہلے دکھانا ضروری نہیں ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ کام میں خود ہی کر لوں گا، تم فی الحال بھیج دو اور پھر فائل مجھے واپس بھیج دینا۔ ایک دو روز کے بعد جب فائل سیکریٹری صاحب نے دیکھی تو انھوں نے کچھ منفی تاثرات لکھے اور یہ ہدایت دی کہ زبانی دلالت کے وقت یہ سب باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ میں نے فاروقی صاحب سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا تو ہنس کر کہنے لگے چنتا مت کرو، جا کر فائل اپنے پاس رکھ لو، دیکھا جائے گا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ فاروقی صاحب نے فائل پہلے ہی سیکریٹری صاحب کو کیوں نہیں بھیجی۔

یہاں پر شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ فاروقی صاحب کے ساتھ میرا تعارف ان دنوں ہوا تھا جب میں یوپی میں پروبیشنر تھا۔ بینا کو لے کر ان کی رہائش پر کال آن کرنے گیا تھا۔ میرا خیال تھا شاعر آدمی ہیں، شاعر کی طرح رہتے ہوں گے۔ مگر ان کی وضع قطع تو مغربی انٹلکچول کی سی لگ رہی تھی۔ چھوٹا قد، موٹا چشمہ، خوش لباس اور منہ میں پائپ۔ وہ کسی طور بھی ہندوستانی شاعر نہیں لگ رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ مجھے بھی اپنے ساتھ کسی ادبی محفل میں لے جاتے۔ ان کی بدولت میں صابری برادرس کی قوالی سے محظوظ ہوا۔ البتہ ادبی معاملات میں ان سے بات کرنے میں جھجک ہوتی تھی۔ ایک بار دفتر میں ان کو اپنے افسانے پڑھنے کے لیے دیے۔ دو تین دن کے بعد جب پوچھا تو انھوں نے زیادہ کچھ نہ کہا صرف افسانے یہ کہہ کر لوٹا دیے کہ اچھے ہیں مگر بدنی زبان کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں میرے افسانے پسند نہیں آئے ہیں مگر منہ سے کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ البتہ ایک تجریدی افسانے 'جاگو' پر انھوں نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا۔ ''اس کہانی میں آخری پیراگراف غیر ضروری ہے۔'' تعجب کی بات یہ رہی کہ انھوں نے اپنی رائے ۱۹۷۷ء میں ظاہر کی، اس کے بعد میں نے اپنی ساری چھپی ان چھپی کہانیاں آگ کی نذر کر لیں، پھر اسی کہانی کو ۱۹۹۶ء کے آس پاس از سر

نو قلمبند کر لیا اور رسالہ 'اثبات ونفی' کے ایڈیٹر عاصم شہنواز شبلی کو، جو فاروقی کے پیروکاروں میں سے ہیں، بھیج دیا اور انھوں نے بھی وہی بات کہی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کہانی کا آخری پیراگراف حذف کرلوں گا۔ مجھے حیرت ہوئی اور دل سے آواز آئی کہ یہ جدیدیے تو سب کے سب ایک تھان کے ٹکڑے ہیں۔ میں نے اجازت دی اور پھر جب یہ کہانی میری کتاب میں چھپی وہاں بھی اس پیراگراف کے بغیر ہی شائع ہوئی۔

میں نے اپنے کیریر کے دوران بہت افسر دیکھے ہیں مگر فاروقی صاحب کی بات ہی کچھ اور تھی۔ آرٹسٹک مزاج ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے کی تخلیقیت کی قدر کرتے تھے۔ اپنے ماتحتوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پروبیشن اور بیشتر سروس کیریئر میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا مگر جب وہ ممبر ڈیولپمنٹ تھے اس وقت ان کے ساتھ کام کرنے میں بہت مزہ آیا۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش ہے اور وہ کسی کو بھی قائل کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ لکھنؤ میں ان کی رہائش پر یوں ہی حاضری دی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ کی یہ جدید شاعری میرے پلے نہیں پڑتی، سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کے شعرا کیا لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ ''پیچھے الماری سے کوئی بھی جدید شاعری کی کتاب نکالو''۔ مجھے جو کتاب سامنے نظر آئی، اٹھالی۔ کہنے لگے۔ ''اس میں سے کوئی سی نظم پڑھ لو۔'' جب نظم پڑھ لی، پھر کہنے لگے ''کچھ محسوس ہوا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا ''ہاں، یہ تو سمجھ میں آیا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔'' انھوں نے کہا۔ ''تو پھر کیا سمجھ میں نہیں آتا ہے؟ شاعری سمجھنے کی چیز نہیں ہے بس محسوس کرنے کی چیز ہے۔'' اس روز شاعری کے متعلق میرے ذہن کا ایک اور دریچہ وا ہوا۔ فاروقی صاحب سے ملاقات ہونے سے پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ جدیدیوں کا حال 'بگڑا شاعر مرثیہ گو' والا ہے مگر ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ادب کے بحر بیکراں کو پار کر کے اب دوسرے کنارے پر نئے سمندروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

پی ایل آئی سیکشن کے جس اے ایس پی کا پہلے بھی ذکر آیا ہے، اس کو زعم تھا کہ وہ لائف انشورنس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ پہلے پہل مجھے انشورنس سمجھنے میں کچھ دقتیں ضرور آئیں مگر بعد میں میں نے مطالعہ کر کے مہارت حاصل کر لی۔ اپنی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے میں نے

ممبئی میں واقع انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا کے انشورنس کالج میں دو مہینے کا کورس کرنے کا پروپوزل ڈی ڈی جی کو بھیج دیا۔ حاسد اور خود غرض بی کے موہنتی نے سفارش نہیں کی، فائل فاروقی صاحب کے پاس پہنچ گئی اور انھوں نے اجازت دے دی۔ اس طرح میں ممبئی پہنچ گیا۔ وہاں محمد علی روڑ پر واقع مچھلی مارکیٹ کے پاس ایک گندے سے انسپکشن کوارٹر میں رہنا پڑا کیونکہ وہ انسٹی ٹیوٹ کے بالکل نزدیک تھا اور میں وہاں پیدل جاسکتا تھا۔ جوں توں وہ دو مہینے (جنوری تا مارچ ۱۹۹۴ء) گزار لیے اور لائف انشورنس کی مبادیات سے بہرہ یاب ہوگیا۔ یہیں پر مجھے انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا کی فیلوشپ حاصل کرنے کے لیے پرائیویٹ طور پر امتحانات پاس کرنے کی تحریک ملی۔ اگلے دو تین برسوں میں میں نے لائسنس شی ایٹ اور ایسوسی ایٹ شپ کے امتحانات بالترتیب ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۷ء میں کامیاب کیے۔ بدقسمتی سے مجھے علم الحساب میں کوئی مہارت حاصل نہ تھی کیونکہ میں حیاتیات کا طالب علم رہا تھا اس لیے فیلوشپ میں آٹھ پرچوں کی جگہ چھ ہی پرچے پاس کرسکا جبکہ بہت کوششوں کے باوجود سٹیٹسٹکس اور ایکچویریل میتھس (Statistics & Actuarial Maths) کے پیپر پاس نہ کرسکا۔ اس لیے میں صرف ایسوسی ایٹ آف انشورنس انسٹی ٹیوٹ ہی بن سکا اور فیلوشپ پاس نہیں کر پایا۔ میری دیکھا دیکھی میں مذکورہ اے ایس پی نے بھی امتحان میں شرکت کی مگر دو تین بار کوشش کرکے بھی لائسنس شی ایٹ کا امتحان پاس نہ کرسکا اور پھر تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اس کا یہ فائدہ ضرور نکلا کہ اس کو خود پر جو گھمنڈ تھا وہ جاتا رہا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ پی ایل آئی سے میرے رخصت ہوتے سمئے اس نے ڈی ڈی جی کے سامنے قبول کرلیا کہ میں نے اب تک جتنے بھی ڈائریکٹرس کے ساتھ کام کیا ہے ان کو میں انشورنس کے بارے میں سکھاتا رہا مگر بدکی صاحب سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو مل گیا۔

انشورنس میں دلچسپی کے باعث میں نے ملہوترا کمیٹی فار ریفارمز ان انشورنس سیکٹر سے دیہاتی ڈاک بیمہ یوجنا منظور کروالی جس کے باعث ڈاک محکمے کے لیے ہندوستانی دیہی علاقوں میں لوگوں کو بیمہ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس سے قبل پی ایل آئی کو صرف سرکاری۔ مرکزی، ریاستی، پی ایس یو اور دیگر خود مختار اداروں وغیرہ۔ ملازمین کا بیمہ کرنے کی اجازت تھی۔ دیہی انشورنس مارکیٹ پچاس ہزار کروڑ کا تھا جو میری محنت کے سبب ڈیپارٹمنٹ کے لیے کھل گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے جب میرا پروپوزل

کمیٹی کو بھیجا گیا، محکمے کے سیکریٹری صاحب ناراض ہو گئے تھے۔ انھوں نے تنبیہ کی تھی کہ زبانی ملاقات میں اِن باتوں پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے۔ جب زبانی براہین کا وقت آیا تو میں نے سوچا کہ سیکریٹری صاحب تو دو مہینے کے بعد ریٹائر ہونے والے ہیں تب تک کمیٹی کی رپورٹ کہاں آئے گی، اس لیے جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ مگر ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ رات نو بجے کی دوردرشن نیوز پر پہلی ہی خبر نشر ہوئی: ''ملہوترا کمیٹی کی سفارشات کے مدنظر پی ایل آئی کو دیہی سیکٹر میں بیمہ کرنے کی اجازت۔'' میرا تو سانس ہی رک گیا، سوچنے لگا کل کس منہ سے سیکریٹری صاحب کے پاس جاؤں گا۔ پوری رات تذبذب میں گزری۔ صبح ساڑھے نو بجے دفتر پہنچا۔ ابھی دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ سیکریٹری صاحب کے پی ایس کا ٹیلی فون آیا۔ ''آیئے سیکریٹری صاحب بلا رہے ہیں۔'' میرا تو دل دھڑکنے لگا۔ بوجھل قدموں سے میں لفٹ کی بجائے سیڑھیوں سے اترا اور یہی سوچتا رہا کہ آج نہ جانے صبح سویرے کیا کیا سننا پڑے گا۔ اندر کمرے میں داخل ہوا، گڈ مارننگ کہا، وہاں تو وہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے اور پرتپاک لہجے میں بولے۔ ''مسٹر بُدکی، مبارک ہو، بہت اچھا کام ہوا ہے۔ میں تمھارے ڈی ڈی جی کو ڈھونڈ رہا تھا تاکہ اس کو مبارک باد کہوں مگر وہ ابھی تک شاید دفتر نہیں آئے ہیں۔ یہ لو ملہوترا کمیشن کی رپورٹ کی کاپی، اسے اپنے پاس رکھ لو۔'' مجھے ان کا ردعمل دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ دراصل رپورٹ کی کاپی ان کو ٹیلی کام کے ممبر یوایس پرساد نے، جو بذاتہ محکمہ ڈاک ہی سے تعلق رکھتے تھے، بھیجی تھی اور منسلک خط میں انھیں دِلی مبارکباد بھی دی تھی۔ اس سکیم کو جلدی ہی لاگو کیا گیا۔ میں نے اس سکیم کا سافٹ ویئر بنانے کے لیے پی ایل آئی مینول بھی لکھ ڈالا جس کے لیے مجھے نئے سیکریٹری پوسٹ نے ایک خط بطور تحسین بھیج دیا۔ یہی خط تھا جس نے میرا سالانہ خفیہ رپورٹ برباد ہونے سے بچا لیا ورنہ میرے، کرم خصلت و بدطینت ڈی ڈی جی مجھے کہیں کا نہ چھوڑتے۔

کچھ اپنی نیک نیتی اور خلوص کام آیا اور کچھ قسمت نے یاوری کی۔ کچھ ہی برسوں کے بعد میں نے اپنے کیریئر کا ایک اور پائیدان طے کر لیا اور پوسٹ ماسٹر جنرل بن گیا۔ تاہم بی کے موہنتی سے جتنا ہو سکا کر لیا، مجھے ڈائریکٹوریٹ سے نکلوا کر پوسٹل سٹاف کالج ٹرانسفر کروا دیا اور میرے کیے ہوئے کام پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ بہرحال ایک بات میرے ذہن پر نقش ہو گئی کہ کام کا نتیجہ خود ہی اپنا انعام ہوتا ہے۔ کبھی کبھی قدر شناسی اور استحسان کی کمی آدمی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے مگر آخر کار جب وہ اپنی محنت کا ثمر خود اپنی آنکھوں سے

دیکھتا ہے تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یہی اصول آگے جا کر میری ادبی زندگی میں بھی رہنمائی کرتا رہا۔

اس دور میں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی خاصی ترقی کرلی۔ شیئرس میں میری خوب کمائی ہو رہی تھی حالانکہ ہرشد مہتہ کے گھوٹالے کے سبب شیئر مارکیٹ لڑھک گیا تھا۔ البتہ میں نے کچھ سرمایہ بچا کر املاک میں ڈال دیا تھا۔ روہنی میں غیر منظور شدہ زمین کا پلاٹ خریدا، اندراپورم غازی آباد اور گروگرام میں فلیٹ بک کر لیے۔ شومئ قسمت کہ گھریلو انتشار کے باعث میں نے نہ صرف زمین خسارے پر بیچ ڈالی بلکہ دونوں فلیٹوں کے لیے جمع شدہ رقم واپس نکالی۔ آج اس جائیداد کی قیمت دو کروڑ سے کم نہ ہو گی۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ میں ایک حسینہ گائنری کی زلف گرہ گیر کا دیوانہ ہو گیا تھا اور زندگی سے فرار کا متمنی تھا۔ بقول عبیداللہ علیم:

؎ کچھ عشق تھا کچھ مجبوری تھی، سو میں نے جیون وار دیا
میں کیسا زندہ آدمی تھا ایک شخص نے مجھ کو مار دیا

لوگ سچ کہتے ہیں کہ 'آدمی پیار میں اندھا ہو جاتا ہے'۔

☆☆☆

ذِکرِ خوباں کا

؎ سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

(مرزا غالبؔ)

زندگی کے سفر میں کئی دوشیزاؤں سے ملاقات ہوئی۔ بادنسیم کی طرح آئیں اور خوشبوئیں پھیلا کر نہ جانے کہاں گم ہوگئیں۔ کچھ پل دو پل ساتھ رہیں۔ ان سے کوئی توقع نہ تھی ماسوائے اس کے کہ چند گھڑی ایک دوسرے کی قربت سے محظوظ ہوتے رہے۔ البتہ چند ایک کے ساتھ جینے اور مرنے کے خواب دیکھے تھے جو حالات کے سبب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔ میں کسی کو دوش نہیں دیتا کیونکہ انسان حالات کا قیدی ہوتا ہے اور ان سے کسی نہ کسی طور سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک طرف میرا ادبی تجسس تھا جو مجھے نئے نئے چہروں کو پرکھنے اور ان کی نفسیاتی گرہوں کو کھولنے کی تحریک دیتا تھا۔ میرا یہ ماننا ہے کہ حقیقت نگاری کے لیے صنف نسواں سے قربت حاصل کرنا اور ان کی نفسیات سے روشناس ہونا بہت ضروری ہے۔ دوسری طرف ناکام ازدواجی زندگی کے باعث میں اور میری اہلیہ ایک دوسرے سے اکثر و بیشتر کتراتے رہے اور اس خلیج کو پاٹنے کے لیے دوسرے سہارے تلاش کرتے رہے۔

بچپن میں چند جنسی تجربے ہوئے تھے مگر ان کو کوئی اہمیت دینا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ایسی بچگانہ حرکتیں تو ہر کسی سے ہوتی ہیں۔ پوسٹ گریجویشن کے دوران ایک نیک اور خوبصورت پڑوسی حسینہ پر دل آگیا۔ چونکہ میں بہت ہی شرمیلا تھا اور اس لڑکی کی بڑی عزت کرتا تھا اس لیے کسی بھی طور اس کو بدنام کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ پرائیویٹ سکول میں معلمہ تھی، شام کو جب سکول سے آتی تھی تو کھڑکی کی اوٹ میں بیٹھ جاتی۔ میں بھی اپنی کھڑکی پر بیٹھ کر کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھ جاتا تھا۔ آمنا سامنا تو نہیں ہوتا تھا

مگر ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس دل کو سکون بخشتا تھا۔ دونوں کے دلوں میں نہ جانے کیسا ڈر بیٹھا ہوا تھا، اس لیے نہ روبرو آتے اور نہ ہی آپس میں کوئی بات کرتے تھے۔ جب کبھی اچانک ایک دوسرے سے نظریں ملتیں تو علیک سلیک ہو جاتی اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ میں نے کئی بار ہمت جٹا کر بات کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کئی پریم پتر لکھے اور ارسال کیے بغیر انھیں پھاڑ ڈالا۔ عجیب سا سنکوچ تھا۔ جس دن اس کی شادی تھی میں نے اس کے لیے خوبصورت ویُوگ (رنگولی)، جو میرے دل کی تمناؤں کی عکاسی کرتا، بنانے کی ٹھان لی تھی مگر قسمت نے دوسرا ہی کھیل کھیلا۔ مجھے دفتر کی جانب سے ہفتے بھر کی ٹریننگ کے لیے گلمرگ بھیجا گیا اور میں اس کو نہ دلہن کے روپ میں دیکھ سکا اور نہ ہی اس کے لیے دلکش ویُوگ بنا سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی آنکھیں بھی مجھے تلاشتی رہی ہوں گی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس حوالے سے اس کے والدین نے میری بڑی بہن سے رابطہ کیا تھا مگر اس نے مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی انکار کر دیا تھا جس کا قلق میرے دل میں آج تک ہے۔

۱۹۷۲ء میں پرگتی میدان دہلی میں پہلی بار انڈیا ٹریڈ فیئر کا انعقاد کیا گیا۔ وہاں کشمیر ایمپوریم کا سٹال بھی لگایا گیا تھا۔ میں ایمپوریم کے اشوکا ہوٹل برانچ میں منیجر تھا اور میرا دوست و رفیق کار نثار حسین کناٹ پلیس برانچ میں منیجر تھا۔ ہم دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ روز و شب عام طور پر اکٹھے گزارتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں اگر میں کچھ حاصل کر سکا اس میں نثار حسین کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ نومبر میں نمائش کے افتتاح کے کئی روز بعد ہم دونوں اکٹھے چلے گئے حالانکہ نثار اس سے پہلے بھی کئی بار جا چکا تھا۔ وہ ایک گرل گائیڈ فرزانہ کو چاہنے لگا تھا مگر اس سے اپنے دل کی بات کہنے میں ہچکچا رہا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے قلعہ فتح کرنے چلے گئے مگر ہوا کچھ اور ہی۔ نثار کو فرزانہ تو ملی نہیں البتہ میں ایک مراٹھی گرل گائیڈ جیوتی کلکرنی کے دام میں پھنس گیا۔ وہ حسین، خوش طبع، خوش اندام اور خوش گلو لڑکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کئی ریستورانوں میں چائے و کافی پی لی یا پھر کبھی کبھار لنچ بھی کیا، دہلی کے تاریخی مقامات دیکھے، بدھا گارڈن میں بہت دیر تک گھومتے رہے لیکن اس کے باوجود اپنے پیار کا اظہار نہیں کر پائے۔ چنانچہ میں اس میدان میں نیا تھا اس لیے بہت محتاط رہا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے اس کو پیار نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ جن

دنوں میں جیوتی کی محبت کا اسیر ہوا تھا انہی دنوں میں نے ایمپوریم میں نمبر دو کا مال بھی کمانا شروع کیا تھا۔ آخر خرچہ کہاں سے آتا؟ خیر اوپر والا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس زمانے میں شوروم میں ایسے ایسے خریدار آئے کہ دولت کی برسات ہونے لگی جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ ہماری جوڑی اتنی سجتی تھی کہ آئی این اے مارکیٹ، دہلی میں ایک فوٹو گرافر نے کئی برس تک ہمارے دو سٹڈیو فوٹو اپنے شو ونڈو میں لگا رکھے تھے۔ چنانچہ وہ بلیک اینڈ وہائٹ تھے اس لیے کلر فوٹو گرافی کے آتے ہی اس نے پوری شو ونڈو بدل دی۔ آخر کار نمائش اختتام کو پہنچ گئی۔ کوئمبٹور واپس جانے سے ایک روز پہلے جیوتی نے ریستوران میں میری گود میں اپنا سر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے باراں برسنے لگی۔ اس نے دبے الفاظ میں پیار کا اقرار تو کیا مگر ساتھ ہی انتباہ کیا کہ اس کے والدین کٹر اور قدامت پرست مراٹھی برہمن ہیں اور اس کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے۔ اس کی آنکھوں میں رواں سیلاب کو دیکھ کر میں جذباتی ہو گیا اور اس کی ہمت باندھنے کی کوشش کی۔ ''اگر ہمارا پیار سچا ہوگا تو ہم ضرور مل جائیں گے۔ یہ میرا یقین ہے۔ اور اگر بچھڑ بھی گئے تو ہمارا پیار ہی ہماری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوگا۔'' کہنے کو تو میں نے یہ ڈائیلاگ فلمی انداز میں کہہ دیا مگر مجھے اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ میں اس خلا کو عمر بھر کبھی بھی پُر نہ کر سکوں گا اور جیوتی ایک معمہ بن کر میرے ذہن پر ہمیشہ سوار رہے گی۔ ہوا بھی وہی جو ہونا تھا۔ وہ جب اپنے گھر پہنچ گئی تو وہاں سے کوئی خط نہیں لکھا۔ مایوس ہو کر میں نے ہی پہل کی۔ اس نے جواب میں لکھا کہ اس کے والدین یہ بات سن کر ناراض ہوئے اس لیے وہ میرے ساتھ خط و کتابت جاری رکھنے سے قاصر ہے۔ اس خط کے ساتھ ہی ہماری کہانی ختم ہوئی۔

مجھے یاد ہے میرے چند قریبی دوستوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو، لڑکی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، کون جانے کب ہاتھ سے نکل جائے مگر میں عشق کی پاکیزگی کو غبار آلود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال میں سنی ان سنی کر دیتا کیونکہ میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ جیوتی کے بعد میں نے کسی لڑکی کو نہیں چاہا لیکن اس پہلے پیار کی معصومیت، پاکیزگی اور نفاست کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ایک لڑکی جس کے ساتھ میری رفاقت ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں رہی آج تک میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ جنوب سے آنے والے ہر شخص سے پوچھ لوں کہ تم نے کہیں جیوتی کو تو نہیں

دیکھا...؟ وہ کہاں پر ہے...؟ کس حال میں ہے...؟ ایک دن سچ مچ ہی شیلانگ میں ایک ملٹری نرسنگ سروس آفیسر لیفٹننٹ زیتون نے، جو سالانہ چھٹی پر اپنے گھر کوئمبٹور چلی گئی، وہاں سے یہ خبر لائی کہ جیوتی خوشحال ہے اور ناگپور میں بیاہی جا چکی ہے۔

ایمپوریم کے سرینگر ہیڈکوارٹر میں تعیناتی کے بعد میں اکثر نوکری کے لیے درخواست بھیجتا رہتا تھا۔ اس لیے نزدیک ہی جنرل پوسٹ آفس جانا پڑتا تھا۔ ایک روز ابھی پورے دو نہیں بجے تھے کہ رجسٹریشن کلرک نے بکنگ کھڑکی بند کردی۔ اس بات پر اس کے ساتھ کافی تو تو میں میں ہوگئی مگر وہ بے چاری مجبور تھی، بنڈ پر موٹر سائیکل پر سوار اس کا بوائے فرینڈ ہارن پر ہارن بجائے جا رہا تھا۔ بعد میں جب وہ میری ماتحت بنی تو میں ہنس کر اس کو 'لڑایہ گر' (جھگڑالو) کہتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور مسلم لڑکی کھڑی تھی جس نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا، میرے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور مجھے ساتھ ہی فلیٹلی (Philately) کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ جب تک وہ رجسٹری کی رسید لے کر آگئی تب تک اس نے میرے لیے چائے منگوائی۔ اس مخصوص کمرے میں صرف ٹکٹیں اور فرسٹ ڈے کور بکتے ہیں جو ٹکٹ اندوزی کے کام آتے ہیں۔ وہاں اس کے علاوہ اس کی ہندو سہیلی بھی تھی۔ تعارف دوستی میں بدل گیا۔ اس کے بعد جب بھی کبھی رجسٹری کرنے جاتا تھا تو اس کے پاس بالراست چلا جاتا۔ تب تک میری خوش وضعی برقرار تھی۔ ایک روز وہ دونوں مجھے مائسمہ کے ٹیمپو اڈے پر ملیں۔ مجھے تھری وھیلر میں کشمیری میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر وہ چونک گئیں کیونکہ وہ مجھے اس وقت تک غیر کشمیری سمجھ رہی تھیں۔ پھر سوچا شاید کشمیری مسلمان ہوگا مگر ان کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا کیونکہ میں نے نہ صرف اپنا نام بتایا بلکہ مہاراج گنج میں اپنی سکونت کے بارے میں بھی بتایا۔ اس کے باوجود ہماری دوستی برقرار رہی۔ وہ میری بہنوں سے بھی متعارف ہوئی۔ ادھر رفتہ رفتہ میری آمدنی کے سوتے خشک ہوتے گئے جس کے باعث مجبوراً میں نے واپس اپنی پرانی وضع قطع اپنائی اور آخرش حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ ایک روز اس کی نظر میرے پھٹے ہوئے سویٹر پر پڑی۔ اس کو میرا پھٹا ہوا لباس پسند نہیں آیا، میرے ایک دوست کا، جس کی چال ڈھال میری جیسی تھی، ناپ لے کر میرے لیے ایک سفید پٹی دار ہرے رنگ کا سویٹر تیار کروایا اور میری بہن کے ہاتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ "اپنے بھیا سے کہہ دو کہ یہ پھٹے ہوئے کپڑے نہ پہنا کرے۔" مجھے اس کی یہ ادا من کو بھائی

مگر کشمیر کے ماحول کے مدنظر ہمارا کھلے عام ملنا جلنا مشکل تھا جس کا دونوں کو احساس تھا۔ اس کا قد میرے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا مگر اس کا دل بہت ہی بڑا تھا جس کی میں عمر بھر قدر کرتا رہا۔ اس کا وہ تحفہ میری زندگی کا سب سے حسین تحفہ تھا کہ ایسے سمے پر جب انسان مایوسیوں میں ڈوبا ہوتا ہے کسی ہمدرد کے دو چار بول یا محبتوں میں ملفوف ایک چھوٹا سا تحفہ من میں آشاؤں کے دیپ فروزاں کرتا ہے۔ اتفاق سے جب میں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا تو انڈین پوسٹل سروس میں الاٹ ہوا۔ اب وہ میری ماتحت بن چکی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور میری بھی، تاہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کا راستہ نہیں کاٹا۔ صرف کبھی کبھار ٹرانسفر کے سلسلے میں گلے شکوے ہوتے تھے۔

اسی دور میں دو پنجابی لڑکیوں، سدھا اور اوشا، سے تعارف ہوا جو گاندھی کالج، سرینگر میں بی ایڈ کرنے کے لیے آئی تھیں۔ کسی دوست نے میرا حوالہ دیا تھا۔ وہ پڑھائی اور چارٹ بنانے میں میری مدد چاہتی تھیں۔ اس لیے میں کبھی کبھی ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ایک روز اوشا کی سہیلی ریتا اور اس کی ماں، جو ڈاکٹر تھیں، اس کے گھر میں وارد ہوئیں۔ وہ سیاحت کی غرض سے کشمیر آئی تھیں۔ ریتا کے ساتھ 'نظریں ملی اور دل دھڑکا' والا معاملہ ہو گیا۔ میں نے ماں بیٹی دونوں کو مغل باغات اور ڈل جھیل کی سیر کرائی اور وہیں شکارے میں ریتا اور میرا عشق پروان چڑھا۔ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ بہت ہی بھولی بھالی اور نازوں کی پلی لڑکی تھی، اپنی مرضی سے کم اور دوسروں کے کہنے پر زیادہ عمل کرتی تھی۔ لوٹتے سمے ماں نے مجھے ویشنو دیوی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ بھلا ایسی دعوت کون ٹھکرا سکتا ہے۔ سوچا چلو کچھ دن اور عشق کریں گے۔ بٹوت میں کسی دھرم شالہ میں رات گزاری اور پھر ایک رات اوپر مندر کے احاطے میں گزاری۔ ویشنو دیوی کے درشن کر کے وہ لوگ دہلی چلے گئے اور میں اور اوشا واپس سرینگر آ گئے۔ اس کے بعد میرا دہلی آنا جانا باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا، کبھی نوکری ڈھونڈنے کے چکر میں، کبھی انٹرویو کے لیے اور کبھی سینٹرل سروسز کے امتحان کی تیاری کرنے کی خاطر۔ ریتا ہوسٹل میں رہتی تھی اور میں اپنے دوست نثار کے پاس۔ چنانچہ نثار کا شوروم کناٹ پلیس میں تھا جو لیڈی ہارڈنگ کے نزدیک ہی تھا، ہم دونوں اکثر ملا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی برس تک چلتا رہا۔ ریتا سے زیادہ مجھے اس کی ڈاکٹر ماں سے انس تھا، مجھے ان میں اپنی ماں کی شبیہ نظر آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کے ساتھ اپنے اور ریتا کے درمیان رشتے کی بات نہ

کرسکا۔ ریتا سے کئی بار کہا کہ وہ اپنی ماں سے بات کرے اور ان کے خیالات معلوم کرے لیکن وہ تو مجھ سے بھی ڈرپوک نکلی۔ میں جب بھی اس کے گھر جاتا اس کی ماں میرے ساتھ اپنے بیٹے کی طرح برتاؤ کرتیں۔ مجھے یہ بھی تو ذہن نشین رہتا تھا کہ کہاں میں دو سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پانے والا ملازم اور کہاں ان کی اکلوتی بیٹی ریتا جو ڈاکٹر بننے والی تھی اور دہلی میں دو مکانوں، جن کی قیمت اس وقت کے حساب سے ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی، کی اکلوتی وارث تھی۔ یہ تو مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگانے کے مترادف تھا۔ اتنا ہی نہیں، ریتا کی ماں کی چاہت تھی کہ وہ شادی کے بعد ان کے ساتھ ہی رہے یا کم سے کم بہت قریب رہے۔ مگر میرے گھر کے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ گھر میں پتا جی تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی بچوں کے لیے وقف کردی تھی، ماں سمان پوپھی تھیں اور دو چھوٹی غیر شادی شدہ بہنیں تھیں۔ میں اسی سوچ وفکر میں الجھا رہا۔ اس کے باوجود ہمیں پورا یقین تھا کہ ہم دونوں شادی کے بندھن میں ضرور بندھ جائیں گے۔ میں نے دہلی میں محکمہ تعلیم میں ملازمت حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی، جوکھم اٹھا کر ایمپوریم سے استعفیٰ دیا اور دہلی چلا گیا مگر قسمت نے یاوری نہیں کی اور مجھے لوٹنا پڑا۔ آخر کار میں نے مایوس ہوکر ریتا کو ایک طویل خط لکھا جس میں اپنے گھر کے حالات، نوکری کے بارے میں ناکامیاں اور دونوں کے والدین کی آرزوؤں کا خلاصہ کیا اور اس پس منظر میں اس سے علیٰحدگی اختیار کرنے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ خط پڑھ کر اس کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ بیمار پڑ گئی اور کئی روز تک ہسپتال میں داخل رہی جہاں ایک زیر تربیت ڈاکٹر نے اس میں کافی دلچسپی لی۔ انجام کار ریتا کی ماں نے غنیمت جان کر دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے میں پہل کی۔ اُدھر سرینگر میں ایک روز صراف صاحب نے گفتگو کے دوران اپنی بے جوڑ شادی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کیسے انھوں نے اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی نبھائی۔ ان کی گفتگو نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں دوڑتا بھاگتا ایک بار پھر دہلی پہنچا تا کہ ریتا سے معافی مانگ لوں اور کسی بھی حالت میں اس سے شادی کرنے کا بھروسہ دلا دوں۔ لیکن وہاں معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ اس لیے واپس سرینگر لوٹ آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ریتا اس حادثے کو اب تک نہیں بھول پائی ہے اور اس نے آج تک مجھے معاف نہیں کیا۔ ایک بار میری ازدواجی ناکامی کی خبر سن کر کہنے لگی۔ ”دیپک، دراصل تم کو میری بددعا لگ گئی ہے۔“

زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ میں ایس این داس گپتا کالج، دہلی میں سِوِل سروسز امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ وہاں نیلور، آندھرا پردیش کی ایک سیاہ فام لڑکی، للتا، جنرل انگلش اور جنرل نالج کلاسز میں میری ہم جماعت تھی۔ اس کے ساتھ کچھ نظر بازی ہوئی اور کچھ دل لگی بھی۔ اس کے بعد اس کو پولیٹکل سائنس کی کلاس میں جانا تھا جبکہ میں ہسٹری کلاس میں چلا گیا۔ وہ اپنی کلاس چھوڑ کر ہمارے دروازے پر کھڑی ہوگئی اور مجھے باہر بلانے لگی۔ باہر کالج کے پرنسپل بھی کھڑے تھے۔ میں سمجھا کہ شامت آگئی شاید اس نے شکایت کی ہوگی۔ بوجھل قدموں سے باہر نکلا مگر وہ مجھے ساتھ لے کر صدر دروازے سے باہر نکلی۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلی بھی تھی۔ بولی ''کیا آپ نے میرے لیے کرایے کا کمرہ تلاش کیا؟'' ساتھ ہی آنکھ ماری۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اس لیے یہ کہہ کر کہ ابھی میری اہم کلاس چل رہی ہے بعد میں بات کرلیں گے، میں نے اس سے پہلوتہی کرلی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد اس کو گیٹ کے پاس اپنا منتظر پایا۔ باہر نکلے، بس سٹاپ کے پاس بات کرتے رہے، اس نے کہا ''مجھے تم سے پیار ہوگیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ پیار ویار میں نہیں جانتا، اگر سیکس چاہیے تو حاضر ہوں، ابھی اور اسی وقت۔'' دراصل میں کیریئر بنانے کی فکر میں تھا اور ان باتوں میں وقت گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس سے گریز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مایوس ہوکر بولی۔ ''کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ میری توہین کر رہے ہیں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''جیسے بھی تم سمجھ لو۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ پیار ویار سب سیکس پر ہی ختم ہوتا ہے۔'' وہ روٹھ کر بس سٹاپ کی طرف چل دی۔ میں وہیں کھڑا اس کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر کچھ منٹوں کے بعد وہ لوٹ آئی اور کہنے لگی۔ ''مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ تم میرے ساتھ پیار جتا کر سب کچھ کر سکتے تھے پھر بھی تم نے براہ راست سیکس کی طلب کی۔ مجھے ایسا لگا کہ تمھارے اندر کھوٹ نہیں ہے اور تم دوسروں سے کچھ مختلف ہو۔ خیر چلو، جو جی میں چاہے کرلو۔ مجھے جہاں مرضی لے چلو، ابھی اور اسی وقت۔'' اس کی بات سن کر میں پریشان ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ سیدھا پلازہ سینما چلا گیا اور فلم 'ساونڈ آف دی میوزک' دیکھ لی اور وہاں سے اپنی عارضی رہائش پر لے گیا جہاں ہم دونوں ایک دوسرے میں گم ہوگئے۔ اس کی رنگت کالی تھی اور بال اتنے گھنے اور لمبے کہ اس کی پنڈلیوں کو چھو رہے تھے جنھیں کھول کر یوں لگا کہ بستر پر چادر بچھائی گئی ہے۔ معطر بدن میں اتنی گرمی تھی کہ اس کی آغوش میں روح پگھلنے لگی۔ رات کو اسے ڈی ٹی

سی بس میں بٹھا کر آ گیا۔ بعد میں کئی اور ملاقاتیں ہوتی رہیں اور جب ہم بچھڑ گئے تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ اچھی آرٹسٹ بھی ہے۔ اس نے ایک بار دو سو صفحات کی ایک نوٹ بک پر اول سے آخر تک مجھے لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اس نے اپنی زندگی، اپنے عشاق اور نیلور کے گرد باد میں گھر کی تباہی کے بارے میں تفصیلات درج کی تھیں۔ خط کیا تھا سوانح حیات قلم بند کی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس کا پہلا عاشق اس کی آنکھوں کے سامنے سائیکلون کی وجہ سے غرقِ آب ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار مجھ سے ملنے مسوری بھی آئی تھی مگر میں وہاں نہیں تھا، ولیج ٹور پر چلا گیا تھا۔ یہ شاید عشق کی پہلی داستان ہوگی جس میں پہلے بدن ہم کنار ہوئے اور پھر روحیں ہمکلام ہوئیں۔ کچھ برسوں کے بعد میں دہلی میں اس سے ملنے اس کی نئی رہائش پر چلا گیا اور اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے ایک ایم پی فلیٹ میں اکیلے رات گزارنے کا موقع فراہم ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی کسی پنجابی لڑکے سے شادی ہو چکی تھی اس لیے وہ نہیں آ سکی۔ البتہ واپسی پر ایک لڑکی سے اچانک ملاقات ہوگئی جو میرے ہمراہ آنے کو تیار ہوئی۔ چھوٹے قد کی سولہ سترہ برس کی الھڑ لڑکی، بڑی دل پھینک، بہت دیر میرے ساتھ رہی، اکٹھے کھانا بھی کھایا اور رات بھر میرے ساتھ رہنے کی تمنائی تھی مگر میں ایسا جوکھم اٹھانے کو تیار نہ تھا کیونکہ ہو سکتا تھا کہ مالک مکان آ جاتا۔ اس لیے میں نے اس کو حقیقت سے روشناس کرایا۔ وہ بوجھل قدموں سے الوداع کہہ کر چل دی۔ نہ آٹو کا کرایہ لیا اور نہ ہی میرے دیے ہوئے پانچ سو روپے لیے۔ کچھ دوشیزائیں سچ مچ مستانی و متوالی ہوتی ہیں۔

دہلی میں میری زندگی نے اس وقت کروٹ لی جب میں ۱۹۹۳ء میں نیشنل ڈیفنس کالج سے واپس آ کر پوسٹل لائف انشورنس میں ڈائریکٹر بن گیا۔ پرگتی وہار ہوسٹل میں فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر میں جھگڑے کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے تھے۔ طلاق کے آثار پھر نظر آ رہے تھے۔ بینا نے کہا کہ میں اپنی ماں، جو قریب المرگ تھی، کا انتظار کر رہی ہوں، اس کے بعد ہم دونوں باہمی طلاق لے کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ شاید اس کو یہ وہم تھا کہ اب اس سٹیج پر مجھے کوئی رفیق زندگی نہیں مل سکے گی۔ بہر کیف ایک خلاف توقع حیرانی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک روز میں بس کا انتظار کر رہا تھا کہ ہوسٹل میں رہ رہی ایک سنگل لیڈی آفسر بھی میرے ساتھ بس کا انتظار کر رہی تھی۔ بس بہت دیر تک نہیں آئی۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ’’اگر دونوں مل کر آٹو کرایہ پر لے لیں تو جلدی دفتر پہنچ جائیں گے۔‘‘ بھلا

ایسا آفر جو ایک لیڈی آفسر کے منہ سے نکلا ہو میں کیسے مسترد کر دیتا۔ جلدی سے ہاں کر لی، آٹو لے لیا اور چل دیے۔ راستے میں تعارف ہوا اور پھر دوستی ہوئی۔ میں اکثر لنچ کرنے کے لیے اس کے دفتر پٹیل بھون، جو میرے دفتر کے بالکل سامنے تھا، چلا جاتا۔ وہ بھی کبھی کبھار میرے پاس ڈاک بھون آ جاتی تھی۔ پھر اس کے گھر بھی آنا جانا ہوا۔ مجھے محسوس ہونے لگا شاید میری زندگی سنورنے والی ہے۔ دونوں ہم دم و ہم سفر لگ رہے تھے۔ وہی انتظار، وہی پیار بھری باتیں، وہی گلے شکوے۔ گایتری بنگلور کی برہمن لڑکی تھی۔ سادہ لوح و سگھڑ، سیدھے سادے کپڑے زیب تن کر لیتی تھی اور گوشت خوری سے مکمل پرہیز کرتی تھی۔ بہت مذہبی قسم کی تھی مگر بینا کی طرح فرسودہ رسم و رواج، جادو ٹونے اور ڈھونگی باباؤں پر یقین نہیں کرتی تھی۔ انڈین اکنامک سروس کی افسر تھی۔ بہت ذہین اور اپنے کام میں ماہر۔ کیبنٹ سیکریٹریٹ (پبلک گریوانسز) کے محکمے میں ڈیپوٹیشن پر تھی اور سرکار کے نام شکایتوں کا نپٹارا کرتی تھی۔ ہماری نزدیکیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ انھی دنوں میں ممبئی انشورنس کالج میں تربیت پانے چلا گیا۔ تب موبائیل کا زمانہ نہیں تھا۔ ہر رات ٹیلی فون پر باتیں ہوتی تھیں۔ نہ اس کو ریسیور رکھنے کو جی کرتا تھا نہ مجھے۔ کچھ دنوں بعد اس نے دفتری کام کا بہانہ بنا کر ممبئی کا پروگرام بنایا اور وہاں سنٹرل ریلوے کے گیسٹ ہاؤس میں رہنے لگی۔ میں بھی دو تین روز اسی کے ساتھ ٹھہرا۔ اس کو میں دل سے چاہنے لگا تھا۔ دہلی میں ہمیں ایک دوسرے کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ ایک روز ہم دونوں بس میں جا رہے تھے کہ اس کی سونے کی چین یا تو کہیں گر گئی یا پھر کوئی کاٹ کر لے گیا۔ بے چاری کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ میں نے بہت دلاسہ دے دیا اور اسی روز دفتر بند ہونے کے بعد اسے اپنے ساتھ کناٹ پلیس میں تربھون داس کی دُکان پر لے گیا اور ایک سونے کی چین خرید کر دے دی۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ میں اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی دوران اس کو مرکزی حکومت نے ہارورڈ یونیورسٹی امریکا میں ٹریننگ کے لیے نامزد کر لیا۔ دراصل نامزد تو وہ ایک سال پہلے ہو چکی تھی مگر آئی اے ایس لابی نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ انھوں نے اس کو ٹریننگ کے لیے سرمایہ فراہم کرنے میں آنا کانی کی تھی۔ مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ ہر دروازہ، جہاں سے مدد کی توقع تھی، کھٹکھٹایا۔ آخر میں اس امریکن عورت سے دہلی میں ملی جس نے ایک سال قبل اس کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے گایتری کو بھیجنے کے لیے حکومت پر زور ڈال دیا۔ اس سلسلے میں مجھے

یاد ہے کہ میں اس کے ساتھ جینز خریدنے کے لیے موہن سنگھ پیلس اور گرم کوٹ خریدنے کے لیے قرول باغ گیا تھا کیونکہ جنوبی لڑکی ہونے کی وجہ سے گرم کوٹ کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ میں من ہی من میں بہت خوش تھا کہ وہ اپنا کیریئر بنانے کے لیے ہارورڈ، امریکہ جارہی ہے۔ اس کے واپس آنے تک میرے آزاد ہونے کی امید تھی۔ اسی درمیان بینا کو ہمارے رشتے کی خبر ہوئی جس کا اسے گماں بھی نہ تھا۔ وہ یہ بھول گئی کہ اس نے خود ہی الگ ہونے کا فیصلہ لیا تھا۔ شاید اس کی جلن اور سوتاپے نے اس کے ذہن پر غلبہ پالیا۔ وہ گایتری کے دفتر اور اس کے گھر پہنچ گئی اور بہت بڑا ہنگامہ برپا کرلیا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ اس کے والدین سے ملنے بنگلور چلی گئی تھی۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا، اس کو جاننے کے لیے میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ قد کاٹھی سے گایتری میری بیوی کا کہاں مقابلہ کرپاتی۔ بے چاری چپ چاپ میری زندگی سے رخصت ہوگئی اور پھر کبھی نظر نہیں آئی۔ میں نے بھی مصلحتاً دوری اختیار کی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری بیوی کس حد تک جاسکتی ہے اور ممکن ہے گایتری کو امریکہ جانے میں مشکلیں پیش آتیں۔ اس لیے میں نے اس کے راستے سے ہٹنا ہی مناسب سمجھا۔ اِدھر میرے ساتھ مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں سرکاری ملازم تھا اور دوسرے میری بہت ساری پراپرٹی اور شیئرش بیوی کے نام پر تھے جن کے بارے میں گایتری کو جانکاری تھی۔ میں جستہ جستہ اپنی اور بینا کی پراپرٹی فروخت کرنے لگا تھا مگر ان چیزوں میں ٹائم لگتا ہے۔ اس درمیان اتنا بڑا ہنگامہ ہوگیا۔ خیر پراپرٹی تو بک گئی مگر مجھے ایک کروڑ سے زیادہ کا نقصان اٹھانا پڑا ۔ تب تک گایتری عنقا ہوچکی تھی۔ اس وقت میری دنیا بس گایتری تک ہی سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اور کوئی وجود نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس بارے میں گایتری کو سمجھایا بھی تھا مگر اس کی شرافت اس کے آڑے آگئی۔ وہ مزید بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ سو دونوں بچھڑ گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ دل گیا رونق حیات گئی۔ اس کے بعد مجھے اس کے بارے میں کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی۔ بقول خمار بارہ بنکوی:

؎ کہانی میرے ہی گذرے ہوئے لمحات رنگیں کی
مجھی کو اب حدیث دیگراں معلوم ہوتی ہے

☆☆☆

تدریسی تجربہ- ایک دیرینہ خواب

پوسٹل لائف انشورنس کے ساتھ کچھ سال کام کرنے کے بعد تعلیمی ادارے کے ساتھ جڑنے کی باری آئی۔ بہت اچھا لگا۔ سوچا، چلو سکول میں استاد تو بنے نہیں، سٹاف کالج ہی سہی۔ ان دنوں اس ادارے کا نام پوسٹل سٹاف کالج، غازی آباد تھا جو بعد میں تبدیل ہو کر رفیع احمد قدوائی نیشنل پوسٹل اکیڈمی ہو گیا۔ اس اکیڈمی میں دو طرح کے افسر تربیت پاتے ہیں۔ ایک، نوجوان افسر جو براہ راست سِول سروسز کا امتحان پاس کر کے انڈین پوسٹل سروس میں داخل ہوتے ہیں اور دوسرے، ادھیڑ عمر کے افسر جو ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آخری مرحلے میں گروپ بی افسر بن جاتے ہیں۔ تقرری کے وقت میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ کالج کے ڈائریکٹر کے ایس بھٹ تھے جو بنگلور سے تعلق رکھتے تھے اور نیکی، ہمدردی، مروت اور ایمانداری کا مجسمہ تھے۔ انھوں نے میرا رویہ دیکھ کر مجھے نہ صرف آئی پی ایس آفسرس کی تربیت کا چارج دیا بلکہ کالج کی ایڈمنسٹریشن کا کام بھی سونپ دیا تا کہ کنٹریکٹ وغیرہ کاموں کی مناسب نگرانی ہو اور کہیں کوئی بے ایمانی نہ ہو۔ میرے ساتھ جو دوسرا جوائنٹ ڈائریکٹر تھا اسے یہ بات پسند نہ آئی اور وہ شرارت انگیزی کی تاک میں لگا رہا۔

میں نے پوسٹل سٹاف کالج میں کئی تعمیری کام کیے جن کا زیادہ چرچا نہ ہو سکا کیونکہ میرے گھریلو حالات نے میری حصولیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ وہاں کے انتظامی ڈھانچے کو بدل کر کرپشن کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ پروبیشنروں کے نصاب کو معقول حد تک بدل دیا۔ اور سب سے بڑی حصولیابی یہ رہی کہ وہاں بہت ہی خوبصورت باغات کی وضع کاری کی۔ آج جو باغ وہاں پر موجود ہے اس کا ڈھانچہ میں نے ہی بنایا تھا اور دھوپ میں گھنٹوں کھڑے رہ کر اپنے سپنے کو ساکار کیا تھا۔ آج بھی جب کبھی وہاں جانے کا موقع ملتا ہے تو باغ کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور خود ہی اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ چلو زندگی میں کوئی تو اچھا

کام کیا۔

سات آٹھ مہینوں کے بعد ڈپٹی ڈائریکٹر ایل کے پوری نے چارج سنبھالا۔ انھوں نے دوسرے جوائنٹ ڈائریکٹر ایچ کے شرما سے مل کر اپنا پنجابی گروپ الگ بنالیا اور ڈائریکٹر کو، جو ریٹائر ہونے والے تھے، حاشیے پر ڈال دیا۔ میری بدنصیبی یہ کہ جب بھٹ صاحب نے میری سالانہ خفیہ رپورٹ لکھ کر ڈائریکٹوریٹ کو بھیج دی تو پوری صاحب نے یہ کہہ کر واپس منگوائی کہ ڈائریکٹر میری رپورٹ لکھنے کا مجاز نہیں ہے۔ ڈائریکٹر کو دو تین مہینوں میں ریٹائر ہونا تھا اس لیے میں نے اس بات کو اچھالنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میرے من میں پوری صاحب کے تئیں کافی اندیشے تھے۔ چپ چاپ دوسری رپورٹ تیار کر کے ان کے سامنے رکھ دی۔ انھوں نے کیا کچھ لکھ دیا وہ وہی جانیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ ان کی کارستانیوں کا نتیجہ کچھ ہی برس میں ان کے سامنے آگیا۔ وہ جس سیکریٹری کی پوسٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھے وہ ان کے ہاتھ سے چلا گیا کیونکہ ان پر خرد برد کرنے کے الزام میں چارج شیٹ لگائی گئی۔ اسی طرح ان کے ہم رنگ و ہم ساز جائنٹ ڈائریکٹر بھی پوسٹ ماسٹر جنرل کے پوسٹ سے آگے نہ بڑھ سکے۔

مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی، آتی تو ہاتھی کی چال سے لیکن جاتی تو چیونٹی کی چال سے۔ پوسٹل سٹاف کالج میں اکثر گھریلو جھگڑے ہوتے رہے۔ دہلی کی ناچاقی یہاں بھی بدستور جاری رہی۔ میں اپنے بال بچوں سے الگ رہتا تھا اور میس میں کھانا کھاتا تھا۔ ایک روز غصے میں آکر اپنے ساری تصویریں جلا ڈالیں۔ کئی بار مار پیٹ کی نوبت بھی آئی۔ بچے بیچارے بہت چھوٹے تھے۔ ان پر نفسیاتی دباؤ بڑھتا گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ بینا نے ایک دو بار خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہی۔ دو بار جب دونوں کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوا اور میں نے اس پر ہاتھ بھی اٹھایا تو اس نے اپنا لباس تار تار کر کے میرے خلاف پولیس سٹیشن غازی آباد میں ایف آئی آر درج کرایا مگر لگتا ہے پولیس افسر نے اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا اور بات رفع دفع ہوگئی۔ شاید مقامی اخبار میں بھی خبر شائع ہوئی تھی مگر میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔ پوری زندگی میں مجھے کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا حالانکہ لکھنؤ میں پڑوسی کے ساتھ جو واردات پیش آئی تھی اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ بینا کو ان باتوں سے کوئی فرق

نہیں پڑتا ہے۔ اس کے یہاں تو شرم نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ اس سے قبل متھرا میں بھی پولیس کیس کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر دہلی ویمنز پولیس سیل، دھولہ کنواں میں بھی شکایت درج کی جس کی میں نے خود ہی پیروی کی اور کیس کو بند کروا دیا۔ واپسی پر میں ڈائریکٹوریٹ چلا گیا، وہاں اپنی رفیق کار منجولا پراشر سے ملا جو اس حوالے سے فکر مند تھی۔ کہنے لگی چاہو تو ہم تم لوگوں کے درمیان ثالثی کرنے غازی آباد آئیں گے۔ میں نے اس بارے میں سوچا اور اس کو بھروسہ دلایا کہ میں خود ہی جا کر مفاہمت کی کوشش کرلوں گا۔

چھٹی کے دن میں اپنی گرل فرینڈ گایتری کے پاس دہلی چلا جاتا تھا۔ بینا نے کئی بار میرا پیچھا کیا مگر ناکام رہی۔ گایتری کے آفس اور گھر میں ہنگامہ کیا اور بعد میں سنا کہ بچے لے کر اس کے والدین سے بھی بنگلور میں مل آئی۔ گھر سے دو تین روز غائب تو رہی تھی۔ بدلے کی بھاونا سے میں نے اپنے کینرا بنک، گرین پارک کے لاکر کی ڈپلی کیٹ چابی بنوا کر [لاکر کی چابی اس کے پاس تھی جس میں اس کا سونا پڑا تھا] لاکر کھلوایا اور سارا سونا اپنے دوسرے لاکر، جو پنجاب نیشنل بنک میں تھا، میں منتقل کر دیا۔ واپسی پر جب اسے معلوم ہوا تو ہکا بکا رہ گئی۔ چنانچہ میں نے اپنی رفیق کار کو بھروسہ دلایا تھا کہ میں مفاہمت کی کوشش کروں گا، میں نے اپنے لہجے میں نرمی لا کر اس کو سونا لوٹانے کا بھروسہ دلایا اور دوسرے ہی روز سارا سونا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ مثبت نکلا۔ ہم سب دوبارہ ایک ساتھ رہنے لگے۔

پولیس سٹیشن کے علاوہ بینا دہلی میں یو ایس پرساد، سیکریٹری پوسٹ سے بھی جا ملی اور میرے خلاف شکایت کرلی۔ انھوں نے کان دھر کے سب کچھ سن لیا مگر بعد میں جب میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے وقت مانگا تو انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ بدنامی کا بیرومیٹر اوپر ہی اوپر جا رہا تھا۔ ادھر ایل کے پوری نے، جو پوسٹل سٹاف کالج کے ڈائریکٹر بن چکے تھے، میرے خلاف شکایت کرلی اور میری پوسٹنگ منی پور کروادی۔ پوسٹنگ کہیں نزدیک کرانے کے لیے میں ممبر پرسنل کے پاس حاضر ہوا مگر دیکھا کہ وہ بھی خار کھائے بیٹھے ہوئے ہیں کیونکہ میں نے بہت عرصہ پہلے سیکریٹری پبلک گریوانسز کے سامنے ڈائریکٹر ڈاک بیمہ ہونے کے ناتے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ انھوں نے میری بات نہیں سنی البتہ منی پور کے بدلے تریپورا بھیج دیا۔ دریں اثنا بینا کے ساتھ مفاہمت ہوئی اس لیے اس کو میرا اتنی دور جانا گوارا نہ ہوا۔ وہ ایک دو روز ہی میں نہ جانے کس منسٹر سے مل کر آئی اور میرا تبادلہ رکوا دیا مگر تب تک میں نے اپنا بوری بسترا

باندھ لیا تھا اور اگرتلا کے لیے بذریعہ طیارہ روانہ ہو چکا تھا۔ تلخیاں پھر ابھر آئیں۔ جس روز میں نے جوائن کرلیا اسی روز ممبر پرسنل کا ٹیلی فون آیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ کیا تم نے جوائن کرلیا ہے؟ میں نے حامی بھرلی۔ پھر کہنے لگے ہم نے تمھارا ایک اور ٹرانسفر آرڈر نکالا ہے جو ایک دو روز میں مل جائے گا، اس لیے اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم نے جوائن کرلیا ہے۔ یہ نیا آرڈر میری بیوی نے نکلوایا تھا مگر میری مرضی واپس آنے کی نہیں تھی۔ اس طرح اس کی محنت رائگان ہوئی۔ پوسٹل سٹاف کالج میں میں فروری ۱۹۹۵ء سے جولائی ۱۹۹۶ء تک کام کرتا رہا۔

حیرت انگیز بات یہ رہی کہ پوری صاحب کی کوششوں کے باوجود مجھے اگرتلا میں ایک سال رہنے کے بعد ہی ترقی ملی اور ڈبروگڑھ میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر جنرل تقرری ہوئی۔ خود پوری صاحب نے اپنی نظر بالراست سیکریٹری پوسٹ کی کرسی پر جما رکھی تھی جس کے امکانات بہت ہی روشن تھے۔ ہوا یوں کہ پوری صاحب کسی کیس میں پھنس گئے، بہت عرصہ تک معطل رہے اور 'سیکریٹری، سیکریٹری' کرتے ہوئے ریٹائر ہو گئے۔ کہاوت ہے کہ چاہ کن را چاہ در پیش۔ (Whoever digs a pit, will fall into it; Bible)۔ وقت بڑا کارساز ہوتا ہے، نشیب و فراز کو ہموار کر دیتا ہے۔

☆☆☆

نارتھ ایسٹ - خستہ حال و زبوں زار

میں اگرتلا ، تریپورا پہنچ گیا۔ یہاں پوسٹل ڈویژن کا سربراہ سینئر سپرانٹنڈنٹ کے بدلے ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے اتنی مدت کے بعد پھر سے ڈویژنل ہیڈ کی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ اس حوالے سے میں نے کئی بار سیکریٹری پوسٹ یو ایس پرساد کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح ہمارے انسانی وسائل کا مناسب استعمال نہیں ہورہا ہے۔ جس کام کو بیس ہزار کا تنخواہ دار کرسکتا ہے اسی کام کو چالیس ہزار کے تنخواہ دار سے کروانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ مگران کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ قابلیت چاہے جو کچھ بھی تھی مگر قسمت کے دھنی تھے۔ سیکریٹری کے عہدے پر سب سے زیادہ وقت کے لیے براجمان رہے۔ ان کے دور میں ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۸ سے بڑھا کر ۶۰ کردی گئی اور اس طرح انھیں مزید دو سال نوکری کرنے کا موقع مل گیا۔ جہاں تک محکمے کی کارکردگی کا سوال ہے مجھے نہیں لگتا کہ ان کو محکمے کے بارے میں زیادہ جانکاری تھی۔

اگرتلا میں میرا قیام جولائی ۱۹۹۶ء سے لے کر جولائی ۱۹۹۷ء تک رہا۔ تریپورا میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں؛ تریپوری قبائل جو یہاں کے اصلی باشندے ہیں اور مہاجر بنگالی جو بٹوارے کے وقت سلہٹ، بنگلہ دیش اور آس پاس کے علاقوں سے آئے ہیں اور جن کی زبان کولکتہ اور ڈھاکہ کے بنگالیوں سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے علاوہ سرحدی علاقوں میں کہیں کہیں چکما قبائل بھی رہتے ہیں۔ رفیوجیوں نے تو اب پورے تریپورا پر قبضہ کرلیا ہے اور تریپوری اقلیت بن کر رہ گئے ہیں۔ بنگالیوں کا رنگ گیہواں ہوتا ہے جبکہ قبائلوں کا رنگ سنگ مرمر جیسا گورا ہوتا ہے۔ نرم و گداز سڈول جسم، خوبصورت آنکھیں، خوش طبع، شریف اور مہمان نواز البتہ جب اِن قبائلیوں کو زندہ رہنے کے لالے پڑ گئے تو ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ تریپورا کا جنوبی حصہ دہشت گردی سے کافی متاثر تھا۔ ہمیں جب بھی اگرتلا سے شیلانگ سرکل آفس

جانا پڑتا تھا تو راستے میں کچھ فاصلہ کانوائے (Convoy) کے ساتھ طے کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس ایریا میں دہشت گرد کبھی بھی حملہ کر سکتے تھے۔ میرے ڈرائیور چندن نے ایک بار کسی سی آر پی ایف کی گاڑی کے ساتھ بغیر بدرقہ کے جوکھم اٹھایا تھا، ساتھ میں میری پیش رو ڈائریکٹر مسز آریہ ویر اور اس کی بیٹی تھی، راستے میں سی آر پی ایف گاڑی پر گولیوں کی برسات ہوئی تھی اور پوسٹل گاڑی بھی اسی زد میں آچکی تھی مگر تینوں بال بال بچ نکلے تھے۔ اس کے بعد جب بھی چندن اس جگہ پہنچتا تھا تو اس کے بدن میں اچانک جھرجھری پیدا ہوتی تھی۔ دراصل وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ نارتھ ایسٹ میں ہر مقام پر دہشت گردی اپنے انتہا پر پہنچ گئی تھی۔

بنگالی لٹریچر سے متاثر ہو کر مجھے بہت پہلے سے بنگالی سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مسوری ٹریننگ کے دوران بنگلہ زبان اختیاری طور پر منتخب کی تھی۔ اگرتلا میں لکھنے اور پڑھنے کی مشق روزانہ کرنے لگا یہاں تک کہ میں کچھ حد تک اخبار پڑھ لیتا تھا اور لکھ بھی سکتا تھا مگر بولنا ہمیشہ میری کمزوری بنی رہی۔ اگرتلا سے تبادلے کے سبب یہ مشق ادھوری رہ گئی اور پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پائی۔

بینا پوسٹل سٹاف کالج، غازی آباد میں گورنمنٹ مکان لے کر بیٹھ گئی۔ مگر بچوں کا کیا کرتی؟ ان کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ بچے اس کے زیر سایہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ شروعاتی علامات تو نظر آنے لگے تھے۔ بڑا لڑکا، سندیپ، بارہویں میں فیل ہو گیا اور جیسا اس نے بتایا وہ تناؤ کی وجہ سے بغیر کچھ لکھے امتحان ہال چھوڑ کر گھر لوٹ آتا تھا۔ چھوٹے لڑکے، ونیت، نے عقل مندی سے کام لیا اور اپنی پڑھائی پر فوکس کرتا رہا لیکن تناؤ نے اس پر بھی کافی اثر ڈال دیا اور اس کے ہاتھوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو گیا۔ میں خود کو خطا وار گرداننے لگا۔ ونیت کی یہ عادت آگے جا کر خود غرضی کی حدوں کو چھونے لگی اور وہ اسی طرف سجدہ ریز ہوتا جہاں سے سرمائے کی امید ہوتی۔ بینا نے ایک ایک کر کے دونوں بچوں کو اگرتلا میں میرے پاس چھوڑ دیا۔ پہلے چھوٹے کو، جس کا ایڈمشن سنٹرل سکول میں آسانی سے ہو گیا اور پھر بڑے کو، جس کے ایڈمیشن میں بہت ساری مصیبتیں کھڑی ہو گئیں۔ بارہویں میں فیل ہونے کے سبب اس کو سنٹرل سکول میں دوبارہ ایڈمشن نہیں مل سکتا تھا۔ ایک دو سکولوں میں بات کی، سبھی نے رائے دی کہ اس کو پرائیویٹ طور پر فارم بھر والیں۔ مگر اس کی ماں کہاں ماننے والی تھی۔ سنٹرل سکول کی ماسٹرانی تھی،

نہ جانے کہاں سے اس کی گیارہویں پاس کرنے کی جعلی سرٹیفکیٹ بنوا کر بھیج دی۔ میں ایسے کام کرنے سے دور ہی رہتا ہوں مگر اس وقت سوچا کہ اگر میں انکار کروں گا تو پھر کوئی نیا بکھیڑا کھڑا کر لے گی۔ سرٹیفکیٹ اور بیٹے کو لے کر سکول کے پرنسپل سے جا ملا، اس نے تب تک ایڈمشن دینے سے انکار کیا جب تک متعلقہ سکول سے اس کی تصدیق نہ ہو۔ اس نے سرٹیفکیٹ رکھ لی اور مجھے پندرہ دن کے بعد آنے کو کہا۔ میں نے تکرار کی کہ اس طرح بچے کی پندرہ دن کی پڑھائی ضائع ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ میں اس کا ایڈمشن کسی اور سکول میں کراؤں۔ اس طرح بڑی حجت کے بعد میں اس سے سرٹیفکیٹ واپس لینے میں کامیاب ہوا۔ بیٹے کو میری خجالت کا اندازہ ہو گیا۔ سکول سے باہر نکلا، بیٹے سے بات کی، اس نے کہا۔ ’’جیسے آپ ٹھیک سمجھیں ویسے کر لیں۔‘‘ میں نے ہندو سکول اگرتلا سے اس کا بارہویں کا فارم بطور پرائیویٹ امیدوار بھر لیا اور وہ کامیاب ہوا۔ کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ اگر تصدیق کے لیے سرٹیفکیٹ چلی جاتی اور مجھے خبر نہ ہوتی تو میری عزت کا کیا حشر ہو جاتا۔ بیٹے نے جونہی امتحان پاس کیا، میں نے ٹمکر، کرناٹک میں اپنی بہن سے رابطہ کر کے اس کو سِدھ گنگا پالی ٹیکنک میں کمپیوٹر انجینئرنگ ڈپلومہ میں داخل کروا دیا۔ فارم بھرتے وقت مجھے کچھ پیش آگاہی سی ہوئی۔ سوچنے لگا کہ کمپیوٹر کا کیا بھروسہ کل کو متروک ہو جائے تو پھر کہیں کا نہ رہے گا، میکنکل شعبہ قدرے بہتر رہے گا۔ مگر اس کی تقدیر میں کمپیوٹر انجینئرنگ ہی لکھی تھی سو اسی میں داخلہ ہو گیا۔ آج بھی میں اپنے اس فیصلے سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ میرے بیٹے کا ذہن میکنکل کاموں کی طرف زیادہ مائل ہے۔ وہاں اس کی پہلے سال کی کارکردگی بہت عمدہ رہی مگر بعد میں ماں کی مداخلت کے باعث بگڑتی چلی گئی یہاں تک کہ اس کو ڈپلومہ لینے کے لیے تین کے بدلے چار سال لگ گئے۔

اگرتلا میں میرے دونوں بیٹے میرے ساتھ رہتے تھے۔ گھر میں ایک جواں سال بنگالی لڑکی کام کرتی تھی۔ پرخلوص، ہوشیار اور صاف ستھری تھی مگر منہ ہمیشہ پان سے بھرا رہتا تھا۔ حلوائی کی بیٹی تھی اس لیے گھر ہی میں بچوں کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں بنا لیتی تھی۔ اسے بچوں سے بہت پیار تھا۔ اُس کے خلوص کو دیکھ کر میں چاہتا تھا کہ جہاں جاؤں اس کو ساتھ لے کر جاؤں مگر اس کے گھر کی حالت اسے اجازت نہیں دیتی تھی۔ جب بینا دوسرے بچے کو چھوڑنے کے لیے اگرتلا آئی تو بڑے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ’’چلو اچھا ہوا یہاں تو عورتوں کے منہ میں ہمیشہ پان رہتا ہے اس لیے میرے پتی کو پسند نہیں آئیں

گی۔'' شاید اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ جنسی ضروریات آدمی کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ ان قبائلی علاقوں میں سے جتنے بھی افسر سول سروسز میں آتے ہیں وہ شراب اور کباب میں اکثر مست رہتے ہیں اور ان کے ماتحت ان کے بدلے سارا نظام چلاتے ہیں۔ کمائی ان کے نام سے ہوتی ہے اور ان کا حصہ، نقد یا جنس، ان تک پہنچایا جاتا ہے۔ تاہم جو افسر باہر سے ان علاقوں میں آتے ہیں وہ ہر لمحے اپنی گھڑی دیکھتے رہتے ہیں کہ کب ان کا معیادِ عہدہ ختم ہو اور وہ واپس گھر پہنچ جائیں۔ دو برس کے معیادِ عہدہ میں وہ اکثر چھٹی لے کر اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ میں نے جونہی چارج لیا تو میرا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ اس روایت کو کس طرح بدل دوں۔ دس دس برسوں سے ڈاکخانوں میں کام کرنے والے ملازمین اپنے عہدوں سے ہلے نہیں تھے۔ یونینوں میں سب سے طاقت ور یونین مارکس وادی تھی۔ ان کا دبدبہ خوب چلتا تھا کیونکہ تریپورا میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی سرکار تھی۔ وہ کسی بھی افسر کو اپنی مرضی سے کام نہیں کرنے دیتے تھے۔ میرے لیے یہ چیلنج سے کچھ کم نہ تھا۔ کچھ مہینے مجھے حالات کو سمجھنے میں لگ گئے اور پھر دھیرے دھیرے میں نے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میں نے بہت سارے دفتروں کو جدید کاونٹروں اور سامان سے لیس کرنے کا کام کیا۔ برس ہا برس سے چلے آرہے سیکریٹریٹ ڈاک خانے کے مسئلے، جہاں برسات میں پانی جمع ہوتا تھا، وہاں کے چیف سیکریٹری سے حل کروا دیا اور اس کی تجدید کاری بھی کروا دی۔ ملازمین اور کچھ حد تک یونینوں کو احساس ہونے لگا کہ یہ افسر کچھ مختلف ہے اور ملازمین کے مفاد کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے بعد ٹرانسفر آرڈر رالیشو کیے۔ دونوں یونینوں کے لیڈر احتجاجاً میرے دفتر میں آگئے اور میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پی ایم جی سے ٹیلی فون پر بات کر لی اور انھیں ٹھوک بجا کے کہہ دیا کہ یہاں یونینیں مجھے پسند نہیں کرتی ہیں، آپ ان کے لیے کسی اور افسر کا انتظام کر لیجیے، میں چھٹی پر جا رہا ہوں۔ یونین لیڈر میری گفتگو سن کر ششدر رہ گئے۔ میرا انشورنس ایسوسی ایٹ شپ کا امتحان ایک مہینے کے بعد تھا۔ میں نے چھٹی کی درخواست بھیج دی اور گھر میں امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ ایک مہینے سے ایک روز پہلے یونین لیڈر گھر پر آئے اور ندامت کا اظہار کرنے لگے۔ انھوں نے تجویز رکھ لی کہ آپ ٹرانسفر کر لیں مگر انسانی مجبوریوں کا بھی خیال رکھ لیں اور شمالی اور جنوبی اگرتلا دونوں جگہ خالی اسامیوں کو تناسب سے تقسیم کر لیں۔ معاہدہ

ہونے کے بعد دوسرے روز میں نے دونوں یونین لیڈروں کو سامنے بٹھا کر دس سال سے پڑے سبھی ٹرانسفر یک مشت ایشو کر لیے اور کسی نے کوئی عذر نہیں کیا کیونکہ انھوں نے دیکھ لیا کہ میرے پاس سب لوگوں کا کچا چھٹا، ان کی ماضی میں پوسٹنگ کا ریکارڈ اور ان کی کارکردگی اور چوری چکاری کا ریکارڈ موجود ہے جس کو بنیاد بنا کر میں نے تبادلے کے آرڈر جاری کر لیے۔ ٹرانسفروں نے سارے ڈویژن میں ہلچل مچادی مگر ڈویژن پر میری گرفت بہت مضبوط ہوگئی۔

اُدھر چیف پوسٹ ماسٹر جنرل، نارتھ ایسٹ سرکل، شیلانگ کے دفتر میں کافی تجسس بڑھ گیا کیوں کہ اگرتلا کے چند بنگالی افسر وہاں اہم عہدوں پر براجمان تھے۔ ان کی نہ صرف آمدنی بند ہوگئی بلکہ دبدبہ بھی ختم ہوگیا۔ چیف پوسٹ ماسٹر جنرل انسپکشن کرنے کے واسطے تین سال سے اگرتلا نہیں آرہے تھے۔ وہ میزورام کے قبائل تھے اور سننے میں آیا کہ ان کے ساتھ گذشتہ دورے کے موقع پر کسی یونین لیڈر نے بدزبانی کی تھی۔ میں نے ان کو ذاتی طور پر دعوت دی اور وہ مان گئے۔ ان کا پروگرام بہت شاندار رہا اور وہ خوش ہوکر واپس چلے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری بہت عزت کرتے تھے۔ اس سال میں نے ڈویژن میں کلرکوں کی بھرتی بھی کی۔ چنانچہ تریپورا بہت ہی چھوٹی ریاست ہے اس لیے میرے انٹرویو لینے کے طریقے کی جانکاری ریاستی سرکار کو بھی مل گئی جنھوں نے اپنے آبزور کچھ سمئے کے لیے بھیج دیے۔

ایک اور اہم بات جس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں یوں ہے کہ میرے ماتحت ایک اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ پوسٹ آفسز، جس نے پہلے کبھی میرے عہدے پر قائم مقامی کی تھی اور رادھا کرشنا پور صدر ڈاکخانے کے ہیڈ پوسٹ ماسٹر، جو اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے، کام کرتے تھے۔ ایک سب پوسٹ آفس کے انسپکشن کے دوران میں نے حاضری رجسٹر کا معائنہ کرتے ہوئے تریپوری قبائل سب پوسٹ ماسٹر سے پوچھا کہ سٹیمپ وینڈر کہاں ہے تو اس نے صاف صاف جواب دیا کہ وہ کبھی آتی ہی نہیں ہے اور میں کچھ کر بھی نہیں سکتا کیونکہ وہ اے ایس پی صاحب کی بیوی ہے۔ مجھے قبائلی لوگوں کا یہ وصف بہت اچھا لگتا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ ڈرتے نہیں اور سچ بولتے ہیں۔ اے ایس پی وہی تھا جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ میں نے اس کو فوراً بلوانے کے لیے دفتر کے گروپ ڈی کو بھیج دیا۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں آگئے۔ بیوی سیدھے سٹیمپ وینڈر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے بلوا کر پوچھ لیا کہ تم کام پر کیوں نہیں

آتی ہو؟ وہ خاموش رہی۔ اس کے بدلے اے ایس پی بولنے لگا سر آج کچھ کام پڑ گیا تھا ورنہ ہر روز آتی ہے۔ میں نے حاضری رجسٹر دکھائی تو کہنے لگا کہ ای ڈی سٹاف کے لیے حاضری کرنا ضروری نہیں ہے۔ میں نے کہا مجھے اس کی رولنگ دکھاؤ، جواب دیا۔ ''اپنے دفتر سے ڈھونڈ کر دکھاؤں گا۔'' اس نے سوچا جان چھوٹ گئی، لاکھوں پائے مگر میں کون سی کچی گولیاں کھیلا تھا، اپنے انسپکشن رپورٹ میں سٹیمپ وینڈر کی غیر حاضری کے بارے میں لکھ دیا، حاضری رجسٹر ضبط کی اور ان دونوں کا سٹیٹمنٹ ریکارڈ کیا جس میں انھوں نے حاضری ضروری نہ ہونے کی بات لکھ دی۔ پھر کیا تھا۔ واپس اپنے دفتر پہنچا، اپنی الماری میں پڑا ہوا اے ایس پی کے بارے میں دو سال پرانا وِجلنس رپورٹ نکالا، جس پر کسی نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی اور دو دنوں میں نہ صرف اس کی اس غلط بیانی پر چارج شیٹ بھیج دی بلکہ وِجلنس رپورٹ پر مبنی چالیس صفحات کا میجر چارج شیٹ بنا کر بھیج دیا۔ اُدھر دوسری جانب میں نے رادھا کرشن پور میں پوسٹ ماسٹر کے آفس میں نقدی کی کمی ہونے کے سبب اس کو بھی چارج شیٹ بھیج دی۔ پوسٹ ماسٹر کے بارے میں یونین لیڈر کہنے لگے کہ وہ چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کا خاص الخاص آدمی ہے۔ میں نے ان کے سامنے ہی چیف پوسٹ ماسٹر جنرل سے ٹیلی فون پر بات کی اور چوبیس گھنٹے میں دونوں کا ٹرانسفر آرڈر ایشو کرنے کی استدعا کر لی۔ دوسرے روز آرڈر میری میز پر تھا اور اس کے ساتھ ہی یونین لیڈروں کی ساری پھونک نکل گئی۔

ایک اور کیس اگرتلا صدر ڈاکخانے سے متعلق سامنے آیا۔ ایک لیڈی پوسٹل کلرک کا شوہر پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، چنڈی گڑھ (پی جی آئی) میں بحیثیت سپیشلسٹ ڈاکٹر کے کام کرتا تھا۔ وہ دو تین سال سے دفتر سے غائب تھی اور چنڈی گڑھ سے رخصت بیماری کی درخواستیں بھیجتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار چھ ماہ یا ایک سال کے بعد دو چار دن جوائن کر لیتی اور پھر غائب۔ پوسٹ ماسٹر، اگرتلا کو حقیقت معلوم تھی مگر وہ شترمرغ کی مانند کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا، صرف نظام پر انگلیاں اٹھاتا تھا۔ یہ ہماری خصلت ہے کہ خود اپنا فرض پورا نہیں کریں گے مگر نظام پر دوش دیں گے۔ یہ نہیں سوچیں گے کہ نظام تو ہماری وجہ ہی سے چلتا ہے۔ مجھے جب اس بات کا پتا چلا تو میں نے سارا کیس اپنے دفتر میں منگوالیا، ایک خط پی جی آئی کے ڈائریکٹر کو یہ لکھ کر بھیج دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دفتر مہر لگانے کا اڈّہ بن چکا ہے۔ خط کے ساتھ ان سبھی میڈیکل سرٹیفکیٹوں کی زیراکس کاپیاں منسلک کر دیں

جواس کلرک نے صدر ڈاکخانے میں جمع کی تھیں۔ میں نے ڈائریکٹر کو ان سرٹیفکیٹوں کی توثیق کرنے کی درخواست کی۔ اس خط کی نقلیں چنڈی گڑھ کے ڈائریکٹر میڈیکل ہیلتھ اور سی بی آئی کو بھی بھیج دیں۔ جواب فوراً ملا، لکھا تھا کہ یہ سرٹیفکیٹیں ان کے دفتر سے ایشو نہیں ہوئی ہیں اور جعلی ہیں اور متعلقہ افسر کے خلاف تعزیری کارروائی کی جارہی ہے۔ جواب ملتے ہی اس کلرک کے خلاف میجر چارج شیٹ ایشو کر دیا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ کلرک نوکری سے استعفیٰ دینے پر مجبور ہوگئی۔

میرے والد صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے مجھے بھیک مانگنا، قرض اٹھانا یا پھر چوری کرنا پڑے (Beg, Borrow or Steal)، میں کروں گا۔ انھیں تو ایسا کرنے کی نوبت نہیں آئی مگر تر پورا کے ایک دور دراز علاقے میں ایک ایسی مثال میرے سامنے آئی جس نے اپنے بیٹے کے ایڈمشن کے لیے سرکاری روپیہ عارضی طور پر غبن کیا۔ میں ایک سب پوسٹ آفس کا انسپکشن کر رہا تھا کہ ایک سادھو منش قبائل کو وہاں پوسٹل کلرکی کرتے ہوئے پایا۔ سبھی اس کی پارسائی کی داد دیتے تھے مگر اس پر سرکاری روپیہ غبن کرنے کا الزام لگا ہوا تھا۔ اسے پورا قصہ دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بیٹے کو نیہرسٹ (NEHRIST) میں انجینئرنگ سیٹ مل گئی تھی اور دو تین روز ہی میں وہاں روپیہ جمع کرنا تھا۔ چونکہ اس کے پاس فوری طور پر سرمایہ نہیں تھا اس لیے اس نے کیش سے روپے نکال کر بیٹے کی فیس یہ سوچ کر بھر دی کہ ہفتے دس دن میں جی پی فنڈ اور دوسرے ذرائع سے بھرپائی کرلوں گا۔ بدقسمتی سے دوسرے ہی روز انسپکٹر نے ڈاکخانے کا معائنہ کرلیا اور کیش کی کمی کی رپورٹ بھیج دی۔ کلرک کو سسپنڈ کیا گیا اور پھر چارج شیٹ دی گئی۔ اس بے چارے نے سارا روپیہ اُدھار مانگ کر پوسٹ آفس میں جمع کروادیا مگر دس سال گزر جانے کے باوجود اس کا کیس بند نہیں ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ بنگالی افسروں نے جان بوجھ کر اس کو لٹکا کر رکھ دیا تھا تاکہ اس کو پرموشن نہ ملے۔ وہی شیڈول ٹرائب (قبائلی ذات) والا معاملہ تھا۔ میں نے واپس دفتر جا کر اس کے کیس میں فوراً انکوائری افسر نامزد کیا اور اس کو ہدایت کی کہ روزانہ کیس کی سنوائی کر کے مجھے دس روز کے اندر رپورٹ بھیج دے۔ اس طرح اس کا کیس اختتام کو پہنچا اور اس کی تین سال کی انکریمنٹ بطور سزا بند کر دی گئی۔

اسی اثنا میں میرا پرموشن آرڈر بحیثیت پی ایم جی ڈبرو گڑھ آسام ایشو ہوا مگر وہی یونین لیڈر

جنھوں نے اس سے قبل مجھے کام کرنے سے روکا تھا، تریپورا کے چیف منسٹر کے پاس یہ فریاد لے کر گئے کہ پی ایم جی کا پوسٹ شیلانگ سے تریپورا شفٹ کر دیا جائے اور بُدکی صاحب کو یہیں رہنے دیا جائے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ نے یہ تجویز نہیں مانی اور مجھے ڈبروگڑھ آسام جانا پڑا۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے ریاستی سرکار میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے میرے لیے کنج بن میں اچھا سا رہائشی مکان الاٹ کروایا تھا۔ ان محبتوں کے لیے میں ہمیشہ ان کا شکر گزار رہوں گا۔

انھی دنوں اگرتلا ہیڈ پوسٹ آفس کی نئی عمارت مکمل ہوئی جبکہ میرا ٹرانسفر آرڈر آچکا تھا اور مجھے چار دن میں چارج دے کر جانا تھا۔ چیف پوسٹ ماسٹر جنرل شیلانگ نے اپنے ڈائریکٹر سے کہا کہ کسی بھی طریقے سے بُدکی سے کہہ دو کہ ہیڈ پوسٹ آفس کو شفٹ کر کے ہی پوسٹنگ پر چلا جائے۔ دراصل کچھ مہینے پہلے اس حوالے سے کولکتہ پی ایل آئی آفس کی شفٹنگ کا بہت بڑا کانڈ ہوا تھا جس میں ڈائریکٹر نے کئی لاکھ روپے خرد برد کر دیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چیف پی ایم جی چاہتے تھے کہ میں ہی یہ کام نبٹا لوں کیونکہ انھیں میری دیانت داری پر پورا بھروسہ تھا۔ میں نے بھی اس بات کو چیلنج سمجھ کر منظور کر لیا۔ سب سے پہلے ڈاک خانے کو پرانی بلڈنگ سے نئی بلڈنگ میں شفٹ کروا دیا، پھر چند والنٹیر وں، جس میں بیشتر یونین لیڈر تھے، کی مدد سے سارا پرانا کاغذ اکٹھا کروا کر اس کو فروخت کیا، پندرہ ہزار روپے جو وصول ہوئے اس کو گورنمنٹ اکاونٹ میں ڈلوا دیا، پھر پرانے ڈاکخانے کی عمارت کی لپائی پتائی کروائی جس پر دس ہزار روپے خرچ ہو گئے اور اس کے بعد اپنا ڈویژنل آفس کرائے کے مکان سے اس عمارت میں شفٹ کروا دیا جس کی ڈھلائی میں تقریباً تین ہزار خرچ ہو گئے۔ غرض یہ کہ ردی کاغذ کی بکری میں سے سارا خرچہ نکل آیا اور پھر بھی دو ہزار روپے بچ گئے۔ اس کے علاوہ ڈویژنل آفس کا ماہانہ کرایہ بھی بچ گیا۔ بعد میں میں نے چیف پی ایم جی سے درخواست کر کے سبھی ملازمین کے لیے، جنھوں نے اس کام میں میری مدد کی تھی، اعزازیہ بھی منظور کروایا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یونین لیڈروں نے اعزازیہ لینے سے انکار کر دیا۔ اگلے روز میں بوریا باندھ کر گواہاٹی کے لیے روانہ ہو گیا۔

اگرتلا میں مارکسی یونین، این ایف پی ای کے ساتھ ایک اور مجادلہ ہوا۔ میں نے سنا کہ تریپورا میں ہمارے ملازمین شراب اور جوئے میں اپنی ساری جمع پونجی لٹاتے ہیں جبکہ ان کے بال بچے بھوکے اور

ننگے رہتے ہیں۔ جب دیکھو جنرل پراویڈنٹ فنڈ سے روپے نکالتے رہتے تھے۔ کسی کے بیٹے کا منڈن تین چار بار ہو جاتا ہے اور کسی کی بیوی بار بار بیمار پڑ جاتی ہے، کوئی اپنے مکان کی مرمت ہر دو سال کے بعد کراتا ہے اور کوئی اپنی فرضی بیٹی کی شادی دو تین بار کراتا ہے۔ کچھ نہ کچھ بہانہ تو چاہیے تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی ڈویژنل ہیڈ کا کام کیا تھا مگر وہاں اس طرح روزانہ چار پانچ درخواستیں نہیں آتی تھیں۔ مجھے شک ہوا کہ یہ لوگ اپنے جمع شدہ جی پی فنڈ کو بھی جوئے اور شراب میں اڑا دیتے ہوں گے۔ اس لیے میں نے کلرک سے سخت تنبیہ کی کہ ان درخواستوں کو باریکی سے جانچ لیا کرے اور جتنی بھی لوازمات ہیں ان کو پوری کروا کر ہی فائل میرے پاس بھیج دے۔ سارے ڈویژن میں ہاہا کار مچ گیا۔ یونین لیڈر دوڑتے دوڑتے میرے پاس آئے اور سٹرائیک کی دھمکی دے کر چلے گئے۔ مگر مجھے اپنے کام پر بھروسا تھا سو ڈٹا رہا۔ جہاں چاہ وہاں راہ۔ کچھ ہی دنوں میں ایک واقعہ پیش آیا۔ جی بی ہسپتال میں ایک پوسٹ ماسٹر کی موت واقع ہوئی۔ جب میں وہاں پہنچا تو یونین کا ڈویژنل سیکریٹری بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے کہا اب دیر کرنے سے کیا ہوگا، ٹیکسی منگواؤ اور لاش کو اس کے گھر بھیج دو۔ ٹیکسی کے بدلے آٹو لایا گیا۔ لاش کو کوئی ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ پوچھا کیا بات ہوئی؟ کسی نے کہا کہ ابھی مہتر آئے گا تو لاش کو اٹھا کر نیچے لے جائے گا۔ مجھے تعجب ہوا کہ چند منٹ پہلے جوان کا رفیق کار تھا اس کی لاش اٹھانے سے بھی وہ کترا رہے ہیں۔ میں نے سٹریچر منگوایا، دونوں بازو کمر اور ٹانگوں کے نیچے گھسیڑ دیے اور لاش کو اٹھا کر سٹریچر پر رکھ دیا۔ پھر چند رفیق کاروں نے سٹریچر کو سیڑھی سے نیچے اتار دیا۔ جب لاش کو آٹو رکشا میں رکھا گیا تو اس کی بیوی کے پاس رکشا والے کو دینے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ سننے میں آیا کہ اس کے شوہر کی موت شراب کے سبب ہوئی تھی اور اس کے پاس کچھ بھی بچا ہوا روپیہ نہیں تھا کیونکہ اس کا شوہر اپنی تنخواہ اور جی پی ایف سب کچھ دارو اور جوئے میں خرچ کرتا رہا۔ یہ سن کر یونین لیڈر کھسیانا ہو گیا اور مجھ سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ دوسرے روز وہ پھر میرے دفتر آیا اور آرڈر میں تھوڑی بہت نرمی برتنے کو کہنے لگا تاکہ وہ بھی یونین ممبروں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل رہ جائے۔ میں نے اس کی لاج رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

کئی سال یوں ہی گزر گئے۔ ایک پنجابی لیڈی افسر نے اگرتلا کا چارج سنبھالا۔ میں اس وقت وڈودرا گجرات میں پوسٹ ماسٹر جنرل تھا۔ ایک روز اس نے اچانک مجھے ٹیلی فون کیا۔ ”سر گڈ مارننگ،

میں اگرتلا کی ڈائریکٹر بول رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''گڈ مارننگ۔ کیسی ہیں؟'' کہنے لگی۔ ''سر میں ٹھیک ہوں۔ ایک پرابلم کی وجہ سے آپ سے مشورہ لینا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کہیے، کیا پرابلم ہے؟'' وہ گویا ہوئی۔ ''سر، یہاں اگرتلا میں میں اپنی جانب سے بہت اچھا کام کرتی رہی مگر یہ لوگ تو مجھے کام ہی نہیں کرنے دیتے۔ ہر بات میں یونینیں ٹانگ اڑاتی ہیں۔ سر یہاں جس سے بات کرو، وہ آپ کی مثال دیتا ہے۔ کہتا ہے یہاں ایک ہی افسر تھا جس نے ڈویژن کو اپنے قابو میں رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ سے صلاح مشورہ لے لوں۔'' میں نے سنجیدگی سے اپنی رائے دی۔ ''آپ پنجاب سے وہاں گئی ہیں، اگرتلا کا کلیان کرنے کے لیے نہیں بلکہ آپ کی اپنی مجبوری تھی۔ ہماری پرابلم یہی ہے کہ ہم نارتھ سے ایک ڈیڑھ سال کے لیے وہاں پوسٹنگ پر جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ترپورا کو پنجاب بنا دیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہر جگہ کی اپنی روایت ہوتی ہے، کام کرنے کی اپنی رفتار ہوتی ہے اور اپنا ورک کلچر ہوتا ہے۔ اس کو بدلنے کے لیے بہت سمے چاہیے مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کیونکہ ہم ہر روز اپنی گھڑی میں دیکھتے رہتے ہیں کہ آج کونسی تاریخ ہے اور اب کتنے دن باقی رہ گئے۔ انھیں معلوم ہے کہ ہم عارضی طور پر وہاں اقامت پذیر ہیں اور ہمارے جانے کے بعد انھیں پھر اسی ڈھرے پر آنا پڑے گا جس پر وہ اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے وہ بدلاؤ سے کتراتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ تیز روی کو چھوڑ کر کچھ مثبت قدم اٹھالیں اور ان کو اپنا لیں۔ سنا ہے کہ یونینوں نے آپ کے خلاف سٹرائیک بھی کی ہے۔ آپ ان کے ساتھ مل بیٹھ کر ان کی پرابلمز کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' ٹیلی فون کا ریسیور رکھنے کے بعد مجھے دل میں اتنی تو خوشی ہوئی کہ چلو لوگ میرے کام کو اب بھی وہاں سراہتے ہیں۔

اگرتلا سے پرموشن پر ڈبروگڑھ، آسام ٹرانسفر ہوا۔ وہاں جولائی ۱۹۹۷ء سے جولائی ۱۹۹۸ء تک قیام رہا۔ آسام کی ریاست میں دو پوسٹل ریجن ہیں، پہلا آسام ریجن چیف پوسٹ ماسٹر جنرل آئی کے دیوری صاحب کے تحت تھا اور دوسرا ڈبروگڑھ ریجن میرے تحت تھا۔ یہ علاقہ چائے باغان کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ان باغات میں مزدوری کرنے کے لیے سرحد پار سے لوگ جوق در جوق آتے رہے ہیں اور یہاں بستے رہے ہیں۔ مقامی مزدوروں کے مقابلے میں وہ کم مزدوری لیتے ہیں۔ بنگلہ دیشیوں کی دراندازی کے سبب مقامی قبائلیوں کی آبادی کم ہوتی جا رہی ہے اور اب ان کو خطرہ نظر آنے لگا ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ یہاں پر طرح طرح کی دہشت گرد تنظیمیں فعال ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ابتدا میں آسام رقبہ کے حساب سے بہت بڑی ریاست تھی مگر آزادی کے بعد اس میں سے کئی ریاستیں، جو اب سات بہنوں (Seven Sisters) کے نام سے مشہور ہیں، الگ کر دی گئیں۔ دیوری صاحب بہت ہی شریف، ایمان دار اور ہمدرد افسر تھے۔ ان کے ساتھ میری اچھی بنتی تھی۔ دونوں کے درمیان کبھی انا کی دیوار کھڑی نہیں ہوئی۔ ہم نے باہمی مشورہ کر کے کئی بلڈنگ پروجیکٹس کی منظوری دے دی اور اس کے علاوہ ملازمین کے بہت سارے کام نپٹا لیے۔

میرے تحت سِلچر ڈویژن بھی آتا تھا جہاں زیادہ تر مہاجر بنگالی رہتے ہیں۔ چنانچہ سلچر کے پرکائستھا صاحب، ہمارے منسٹر تھے اور سیکریٹری صاحب کو وہاں کے حالات کا جائزہ لینا پڑا اس لیے میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ گیسٹ ہاؤس میں وہاں کا سپرانٹنڈنٹ پانی کی بند بوتلیں لے کر آیا۔ ابھی ان کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ سیکریٹری کے کمرے میں رکھ دو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مانا ہی نہیں۔ گفتگو کے دوران وہ اپنی کارروائی کو جائز ٹھہرانے لگا اور اس کے منہ سے نکلا۔ ''جب تک صبح اٹھ کر بھگوان کے سامنے دس پیسے کا چراغ نہیں جلاتے ہیں، مراد بر نہیں آتی۔'' مجھے ایسا لگا کہ اس نے میری دیانت داری پر سوال اٹھایا ہے۔ اس کا مکالمہ گانٹھ باندھ کر رکھ لیا۔ واپس دفتر پہنچا، چھان بین کی، معلوم ہوا کہ اس نے چالاکی سے ایک درجہ فہرست افسر کا حق مار کر سلچر میں پروموشن پوسٹنگ لی تھی۔ چند ہی دنوں میں میں نے ایک اور آرڈر ایشوع کیا اور اس کو واپس ریجنل آفس میں تعینات کیا اور جس کا حق مارا گیا تھا اس کو وہاں کا سپرانٹنڈنٹ بنا لیا۔ کچھ اور بھی کام کیے جن سے درجہ فہرست ذات اور قبائل ذات کو ان کا حق مل گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک قبائل افسر نے مجھ سے ملنے کی درخواست کی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا، میں نے اسے سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور وہ بیٹھ گیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''ہاں، کہیے آپ کس لیے آئے ہیں؟'' وہ مودبانہ لہجے میں بولا۔ ''سر میں آپ کو ذاتی طور پر دیکھنے اور ملنے کے لیے آیا ہوں۔ کچھ مانگنے کے لیے نہیں۔ میں نے پہلا افسر دیکھا ہے جو انصاف کرتا ہے۔'' اس کے بعد اس نے کرسی سے اٹھ کر جانے کی اجازت مانگ لی۔ میں حیرت میں پڑ گیا مگر ساتھ ہی یہ بشاشت ہوئی کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں اور اچھے کام کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایسی ہی

کئی وارداتیں میرے ساتھ ہوئی تھیں۔

سلچر میں ایک پوسٹل سٹاک ڈپو تھا جو ایک ویران سی جگہ میں بنایا گیا تھا کیونکہ وہاں پر محکمے نے زمین خرید لی تھی۔ بلڈنگ تو محکمے کی میزان کے مطابق بنائی گئی تھی مگر سچ تو یہ ہے کہ دفتر اور سٹورز نے اس کا دسواں حصہ بھی نہیں گھیرا تھا جبکہ باقی نو حصے بے کار پڑے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ جگہ ایسی تھی جہاں بلڈنگ کو کرائے پر اٹھانا بھی مشکل تھا اس لیے اس بے کار حصے پر لگایا گیا سرمایہ ضائع ہو رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں، سٹاف کو آنے جانے میں بہت تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ ایسی صورت حال میں نے ملک میں کئی جگہوں پر دیکھ لی۔ کشمیر میں اننت ناگ پوسٹ آفس کی عمارت اتنی بڑی تھی کہ اس میں ملی ٹنسی شروع ہونے کے بعد سی آر پی ایف کی ایک پوری بٹیلین سما گئی۔ اسی طرح آنند گجرات کے ہیڈ آفس میں دو ہیڈ آفس سما سکتے تھے۔ کٹھوعہ، جموں میں اتنی خالی جگہ تھی کہ لائف انشورنس کے دفتر کو کرائے پر دی گئی۔ ایک مثال تو غضب کی تھی۔ بٹوت، جموں وکشمیر میں بلڈنگ بنائی گئی، پی ایم جی سے ایک منزل کی منظوری لی گئی، مگر معلوم ہوا کہ عمارت تو سڑک کی سطح سے بہت نیچے بن گئی ہے، اس طرح وہاں پر ایک کے بدلے تین منزلیں بنائی گئیں جب کہ وہاں پر صرف ایک کلرک اور ایک گروپ ڈی کام کرتا تھا۔ کہیں کوئی احتسابی کارروائی نہیں ہوئی۔ ایسی تو بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ دراصل ہمارے محکمے کو زمینیں مفت یا پھر کم قیمت پر الاٹ ہو جاتی تھیں اور ہمارے افسران اندھا دھند زمینیں خرید لیتے تھے چاہے ان پر عمارتیں بنانے کے لیے محکمے کے پاس سرمایہ ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ محکمے کے پاس سیکڑوں جگہوں پر زمینیں بے کار پڑی تھیں، ان کی حفاظت کے لیے ان کے گرد دیواریں بنانی پڑتی تھیں، جو تب تک گر جاتیں جب تک عمارت کھڑی ہو جاتی۔ اس طرح ان پلاٹس کی دیکھ ریکھ اور نگرانی میں محکمے کو بہت سرمایہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ ڈاک محکمے میں افسروں کو مالیاتی نظم ونسق کی ہمیشہ کمی رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے افسروں نے آرکیٹیکٹ کا رول بھی ادا کرنا شروع کر دیا تھا، منظور شدہ نقشے میں بے تحاشہ بدلاؤ کیے جاتے تھے جس سے اس عمارت کا حلیہ ہی بگڑ جاتا تھا۔ سرینگر جی پی او کی مثال تو سامنے کی ہے۔ اس وقت کی پی ایم جی نے چنڈی گڑھ کے کسی آرکیٹیکٹ سے ایسا نقشہ بنوایا تھا کہ پوری عمارت نہ تو ماحول کے ساتھ مخلوط ہو رہی تھی اور نہ ہی کشمیر کے موسم کے حساب سے مناسب تھی۔

عمارتیں تو عمارتیں، پھر ایک دور ایسا بھی چلا کہ موڈرنائزیشن کے تحت ڈاکخانوں کی اندرونی ڈیکوریشن تبدیل کردی گئی۔ پہلے تو عمارتیں بن رہی تھیں اب ان کی توڑ پھوڑ میں سرمایہ خرچ ہونے لگا۔ نئے نئے تصورات پیش کیے گئے اور کروڑوں روپے اس میں بہہ گئے۔ کوئی کاؤنٹر ایک سال میں موڈرنائزیشن کے تحت توڑا جاتا اور دوسرے ہی سال وہی کاؤنٹر فائنانشل سروسز کو بہتر بنانے کے لیے دوبارہ توڑا جاتا۔ بات تو تب بنتی کہ ڈاکخانے میں کام میں سدھار آجاتا یا پھر محکمے کی آمدنی بڑھ جاتی۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے اب تو ڈاکخانہ اپنا بنیادی کام ہی بھول گیا ہے۔ اب نہ تو ڈاک کہیں نظر آتی ہے اور نہ ڈاکیے۔

ڈبروگڑھ میں ایک انسپکشن کوارٹر کرائے پر لیا گیا تھا۔ حالانکہ وہاں پی ایم جی کا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا گیا تھا مگر ہر کوئی گواہاٹی ہی میں رہنا پسند کرتا تھا کیونکہ وہاں پر بچوں کی پڑھائی کا اچھا انتظام ہے۔ سکول اور کالج بہت اچھے ہیں، ہسپتال اور دیگر سہولیات بھی میسر ہیں۔ ڈبروگڑھ میں اس کے برعکس ایسی کوئی بھی سہولت دستیاب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پی ایم جی آفس بننے کے باوجود دفتر کئی برس تک گواہاٹی میں کام کرتا رہا۔ ڈبروگڑھ کے انسپکشن کوارٹر پر محکمہ مہینے کے نو ہزار روپے کرایہ دیتا تھا جبکہ پی ایم جی دو تین مہینے میں صرف ایک دو بار چلا جاتا اور ایک دو دن رہ کر واپس آجاتا۔ عام طور پر اور کوئی افسر اس ایریا میں نہیں جاتا تھا۔ فرض کرلیں کہ پی ایم جی وہاں ہر مہینے تین روز کے لیے جاتا تھا، اس کا مطلب وہ سال میں ڈبروگڑھ میں اوسطاً ۳۶ دن رہتا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مہینے چھ دنوں کے پی ایم جی کے قیام کے لیے محکمہ ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے بطور کرایہ دیتا تھا، غرض ایک دن کا کرایہ تقریباً ۳۰۰۰ روپے بن جاتا ہے۔ یہ ہے اس غریب ملک میں ہماری افسر شاہی کی اصلیت۔ گورنمنٹ وسائل کا بے دریغ خرچ کرنا ہمارے ملک کے افسروں نے اپنی روش بنائی ہے۔

پرکاستھا صاحب بار بار گواہاٹی آیا کرتے تھے۔ میرا ہیڈ کوارٹر ڈبروگڑھ تھا لیکن دفتر ابھی گواہاٹی ہی میں کام کرتا تھا۔ انھیں نہ جانے کیوں مجھ سے انس پیدا ہوگیا۔ ہر میٹنگ میں بلاتے تھے اور کبھی کبھار مجھ سے صلاح مشورہ بھی کرلیتے تھے۔ دیوری صاحب غنیمت جان کر مجھے سامنے کردیتے۔ ہم نے آسام کی ترقی کے لیے کئی منصوبے بنائے جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک روز انھوں نے جنرل منیجر ٹیلی

کام کی کارکردگی پر اپنی ناراضی کا اظہار کیا اور ان کو ٹرانسفر کی دھمکی دی۔ کچھ دیر کے بعد میرے منہ سے نکلا۔ ''سر، میرا ٹرانسفر بھی آ رہا ہے۔ میں کشمیر جا رہا ہوں۔'' اس نے مزید کچھ سنے بغیر ہی ممبر پرسنل کو ٹیلی فون پر جھاڑ دیا کہ میرے پوچھے بغیر بُدکی صاحب کا ٹرانسفر کیوں کیا گیا۔ اُدھر ممبر صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے کہ میں نے انھیں یہ خبر کیوں دی۔ دوسرے روز میں منسٹر صاحب سے پھر ملنے چلا گیا اور ان پر یہ بات واضح کر دی کہ کشمیر میری جائے پیدائش ہے اور میں وہاں جانے کے لیے بے تاب ہوں۔ اب کے ٹرانسفر رک گیا تو بہت سال انتظار کرنا پڑے گا۔ اس طرح انھوں نے ٹرانسفر کی اجازت دے دی۔ منسٹر سے ایسا براہ راست تعلق پہلی بار ممکن ہوا کیونکہ میں کسی سیاست دان کے در پر حاضری دینے کا عادی نہیں تھا۔ کسی دفتری فنکشن پر علیک سلیک ہوتی تو الگ بات تھی ورنہ ان سے دور ہی رہتا تھا۔ پرکائستھا صاحب کا کرم اور سرپرستی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

☆☆☆

طوافِ لالہ زار

ہمارے خون کے چھینٹے ہیں پتی پتی پر
سنو تباہیِ گلشن کی داستان ہم سے

(اعجاز صدیقی)

اپنی دھرتی کی مٹی نے مجھے پھر بلا لیا تھا اور میں اس کی پکار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ جولائی ۱۹۹۸ء سے لے کر اپریل ۲۰۰۰ء تک میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر جنرل جموں و کشمیر سرکل کے کام کرتا رہا۔ کشمیر کے حالات کے بارے میں تو پہلے ہی بہت کچھ قلم بند کر چکا ہوں۔ حالات میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی تاہم وہ پہلی سی شدّت نہ تھی۔ اکثر علاقوں سے دہشت گردی کا قلع قمع کیا گیا تھا مگر سرحد پار سے ملی ٹینٹوں کی در اندازی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ سوپور، شوپیاں اور اننت ناگ کے دیہی علاقوں اور آس پاس کے جنگلوں تک محدود ہو چکے تھے مگر بم پھٹنے اور گولی باری کی وارداتیں وادی میں کہیں نہ کہیں ہر روز ہوتی رہتی تھیں۔ ریاستی سرکار کے ملازمین سیکورٹی کے تحت ہوٹلوں میں رہتے تھے، صبح وہاں سے سیکریٹریٹ جاتے اور دفتر بند ہوتے ہی واپس ہوٹلوں میں چلے آتے۔ ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگائی گئی تھی۔

محکمہ ڈاک کے ملازمین جنرل پوسٹ آفس ہی میں رہتے تھے اور محکمے نے انھیں قریب ایک بیڈ کی جگہ، پانی اور بجلی میسر کیے تھے۔ علاوہ ازیں انھیں دو ہاؤس رینٹ الاونس (ایچ آر اے) مل رہے تھے، ایک اپنے لیے اور دوسرا فیملی کے لیے۔ سرکار نے ایک ایچ آر اے پر روک لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اُدھر مقامی ملازمین کو بھی دفتر آنے جانے کا الاونس دیا گیا۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ ان حالات میں جتنا ہو سکے مالی فائدہ اٹھایا جائے یہاں تک کہ بڑے بڑے افسر تو بالواسطہ طور پر چار ایچ آر اے، دو نقدی

اور دو جنس میں لینے لگے۔ خود تو سرینگر یا جموں میں انسپکشن کوارٹر (گیسٹ ہاؤس) میں رہتے تھے، فیملی کے لیے دہلی اور دوسری جگہوں پر گورنمنٹ کوارٹر لے رکھے تھے، اس کے باوجود دو ایچ آر اے نقد بھی لے رہے تھے۔ اس بارے میں میں نے کیس ڈائریکٹوریٹ کو بھیج دیا تھا مگر کوئی کارروائی نہیں کی گئی کیونکہ کرنے والے خود ہی اس دھاندلی میں ملوث تھے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ اتنی لوٹ ملی ٹینٹوں نے نہیں مچائی جتنی کہ جموں وکشمیر کی افسر شاہی نے مچا رکھی تھی۔

وادی میں ڈاک خانے بحال کیے جا چکے تھے اور ان میں سیونگس کا کام بھی شروع کیا گیا تھا۔ برانچ آفسوں میں نئی بھرتی ہو چکی تھی۔ بزنس ڈیولپمنٹ کا کام بھی بڑھنے لگا تھا اور اس حوالے سے سرکل میں پریس کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔ ایسی ہی ایک تقریب میں سٹیٹسمین کی سینئر کارسپانڈنٹ کویتا سوری سے جان پہچان ہوئی جو ایک اچھے لیکھک اور ڈرامائسٹ وجے سوری کی بیٹی تھی۔ بدقسمتی سے والد کا کچھ سال بعد انتقال ہو گیا۔ بعد میں وہ جموں یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئی۔

ایک روز اُدھم پور صدر ڈاکخانے کے معائنے کے دوران ایک درجہ فہرست ملازم، سائیں داس سے ملاقات ہوئی۔ تین ہزار روپے کے غبن کے لیے اس کا کیس سی بی آئی کو سونپ دیا گیا تھا جبکہ اونچی ذات والوں کے لاکھوں کے غبن کی ان دیکھی کی جاتی رہی اور ان پر ڈیپارٹمنٹل کیس کیا جاتا۔ سائیں داس کو دس سال کے بعد کورٹ نے بری کر دیا مگر ہمارے 'نو برہمن' افسر کہاں ماننے والے تھے، کیس کو سپریم کورٹ تک لے گئے۔ اب سوچ لیجیے ایک اکیلا غریب ملازم سپریم کورٹ میں اپنے کیس کی پیروی کیسے کر سکتا تھا۔ خیر جوں توں کر کے وہاں سے تو بری ہوا مگر وہ سب ترقیاں جو اسے ان برسوں میں ملنی چاہیے تھیں وہ نہ ملیں۔ ساری رام کہانی سنائی مگر اب تو دیر ہو چکی تھی، کورٹ نے فیصلہ دیا تھا اور اس کو پروموشن تو دی تھی لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی تھی کہ بغیر کسی اونچے پوسٹ پر کام کرنے کے اس کو مرحلہ وار ترقی دی جائے یا نہیں۔ میں نے اس کی ساری بات سن لی اور کیس پر روشنی بھی ڈال دی۔ پھر وہ سنبھل گیا۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ ''سر اس کیس کی وجہ سے میری بیوی مر گئی، میرا بیٹا مر گیا اور میں دس سے زائد برسوں سے نوالوں کو ترستا رہا۔ مگر آج بہت خوشی ہوئی۔ اس سے پہلے کسی افسر نے میری بات اطمینان سے نہیں سنی۔ ایک آپ ہیں جنھوں نے میری بات غور سے سنی۔ اب تو مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔ کم سے کم کسی نے

میری بات تو سن لی۔'' اس کے اندر کے آکروش کو میں سمجھ سکتا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس درجہ فہرست ذات کے ملازم پر اونچی ذات کے دو افسروں نے عمداً سی بی آئی میں کیس درج کیا تھا۔ اپنی دفتری زندگی کے دوران میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ ذات پات کے چکر میں کبھی کبھار اونچی ذات کے افسر اور انسپکٹر بے چارے غریب ملازموں سے بدلا لینے کی در پے رہتے ہیں۔

ذات پات کے حوالے سے ایک اور دھاندلی سامنے آئی۔ آر ایم ایس میں کئی لوگ درجہ فہرست ذات/قبائل ذات کے کوٹا میں یو پی، بہار سے بھرتی ہو چکے تھے جنھوں نے درجہ فہرست ذات میں ہونے کی جعلی سرٹیفکیٹیں دائر کی تھیں۔ آخر کیوں نہ کرتے، حکومت کتنی بھی کوشش کرے آخر نظام تو اونچی ذات کے لوگوں کے پاس ہی ہے۔ وہ جس کو چاہیں اس کو درجہ فہرست کی سند عطا کریں، کون پوچھنے والا ہے۔ یہاں تک کہ جب یہ کیس سی بی آئی کو بھیجا گیا تو انھوں نے کئی سالوں کے بعد اسے واپس بھیج دیا اور محکمے کو اس پر خود ہی کارروائی کرنے کو کہا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہے کہ سارے ملک میں کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو ایسی جعلی سندیں دائر کر کے پیشہ ورانہ کالجوں اور سرکاری عہدوں پر براجمان ہوں گے۔ اس ملک کا تو ایشور ہی نرالا ہے۔

اسی دوران ۱۹۹۹ء میں کرگل کی جنگ ہوئی۔ میں نے فوج میں نو سال نوکری تو کی تھی مگر جنگ دیکھنے یا اس میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سری لنکا میں فوجی کارروائی کے دوران ہم متھرا میں تیار بیٹھے تھے مگر آخری مرحلے پر روک لگا دی گئی۔ اس لیے میں نے کرگل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لداخ ڈویژن کا سپرانٹنڈنٹ اے کے ہانجورا میرے ساتھ چلا آیا۔ جنگ اپنی انتہا پر تھی۔ ہم نے مولبیکھ کے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں رات گزاری جہاں سے سرحد پار سے داغے جا رہے گولے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں کرگل رفیوجی کیمپ دیکھنے گیا تو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہمارے ڈاکخانے جو اوپر پہاڑیوں پر تھے وہ اپنے اپنے رفیوجی کیمپوں میں عارضی طور پر کام کر رہے تھے اور سبھی ڈاک سیوائیں لوگوں کو مہیا کر رہے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوا اور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ایسا ہی منظر بارہمولہ میں بھی زلزلہ آنے کے بعد کسی اخباری رپورٹر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کی باتصویر رپورٹ انڈین ایکسپریس میں شائع کی تھی۔

اس دفعہ ایک عجیب سا تجربہ حاصل ہوا۔ جموں سے ایک امیدوار اجے دوبے انڈین پوسٹل سروس میں پاس ہوا تھا، پروبیشن ختم کر کے اسے سرینگر میں تعینات کیا گیا۔ اس کو میں جموں کا پہلا افسر تو نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس سے پہلے کرنل شیوناتھ بھی، جن سے میں پوسٹل سٹاف کالج میں ملا تھا اور جو ڈوگری کے بہت اچھے قلم کار تھے، جموں ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ اجے دوبے کی یہ پہلی پوسٹنگ تھی اور مجھے اپنی پہلی پوسٹنگ کی یادیں ابھی بھی ذہن پر سوار تھیں، اس لیے میں نے کئی بار اس کو ڈاک خانے میں دیانت داری سے کام کرنے کے گُر سکھانے کی کوشش کی اور سچ تو یہ ہے کہ میں اسے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح برتاو کرتا رہا۔ اس سے پہلے بھی سرکل میں کئی افسر پروبیشن کے بعد بالراست پہلی پوسٹنگ پر آچکے تھے مگر انھوں نے دھیرے دھیرے کام سیکھنے کی کوشش کی۔ ایک افسر پی ایس نیگی کی کارکردگی کو دیکھ کر میں نے میگھ دوت انعام کے لیے اس کی سفارش کر کے اس وقت کے پی ایم جی کے توسط سے ڈائریکٹوریٹ کو بھجوائی اور نتیجے میں اس کو وہ ایوارڈ مل گیا۔ اس کے برعکس اجے دوبے کے ساتھ تجربہ کچھ تلخ سا رہا چاہے اس کا جو کچھ بھی پس منظر رہا ہو۔ ایک تو یہ کہ اس کے پتا جی خود غیر منقسم محکمے میں ملازم رہے تھے اور شاید کشمیری پنڈتوں سے خار کھائے بیٹھے تھے اور دوسرے ہجرت کے سبب جو تناؤ کشمیری پنڈتوں اور ڈوگروں میں پیدا ہوا تھا، جموں کے کئی فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے افسروں نے کوٹ کوٹ کر اس کے ذہن میں بھر دیا۔ نتیجتاً وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ جب میں نے کشمیر میں اس کی غیر فطری حرکتیں دیکھیں تو اس کو جموں یہ سوچ کر بھیج دیا تاکہ اپنے گھر میں رہ کر وہ شاید سدھر جائے مگر یہ اقدام بھی توقع کے خلاف نکلے۔ جموں میں وہ زیادہ ہی دلیر ہو گیا۔ کشمیر میں اس نے کئی مہینے گزارے تھے، تعجب اس بات کا تھا کہ اس نے ایک بھی انسپکشن نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی آفس کا دورہ کیا تھا۔ ڈائریکٹر نے اس کی پہلی خفیہ رپورٹ لکھی تو میں نے اسے منفی ریمارکس لکھنے سے روک لیا کیونکہ مجھے ابھی اس افسر میں میچورٹی کی کمی نظر آرہی تھی اور امید تھی کہ آگے وہ سنور جائے گا۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ جموں میں تو پانی سر سے اوپر ہو گیا۔ وہ کافی ہٹیلا نکلا اور کسی بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے میں نے دوسری بار ڈائریکٹر کو منفی تصریحات لکھنے سے نہیں روکا۔ اجے نے اس کے خلاف اپیل درج کی اور ایک افسر، جس کی اس نے کشمیر میں خاطر تواضع کی تھی، نے اس کو بچا لیا۔ مزے کی بات یہ رہی کہ اجے کا ٹرانسفر ویسٹ بنگال ہوا جہاں اسی افسر کی بیوی چیف پی ایم جی

تھی اور وہ سال بھر میں اس سے اتنی تنگ آگئی کہ اپنے کان پکڑنے لگی۔ ایک روز جب اس نے مجھ سے ڈائریکٹوریٹ میں اس حوالے سے بات چھیڑی تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے لیے تمھارا شوہر ذمے دار ہے۔ آخر کار اجے نے نوکری سے استعفیٰ دے کر اپنی بزنس شروع کر لی۔

اِدھر میں نے بیوی کے خلاف عدالت میں باضابطہ طلاق کی عرضی دائر کر لی کیونکہ اس نے پوری طرح علیحدگی اختیار کر لی تھی اور دبئی چلی گئی تھی۔ وہاں پر وہ انڈین ہائی سکول میں نوکری کرنے لگی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی میں نے غازی آباد عدالت میں طلاق کی عرضی دائر کی تھی مگر اسے واپس لینا پڑا تھا کیونکہ ہم دونوں کے بیچ صلح ہو گئی تھی۔ جموں فیملی عدالت نے طلاق کی عرضی منظور کر لی کیونکہ بینا عدالت میں حاضر نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا کوئی وکیل حاضر ہوا۔ بہت عرصہ بعد مجھے پھر اپنے بچوں کی خاطر اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی اور اپنے قدم واپس لینے پڑے۔ بچے بڑے ہو چکے تھے اور ہماری مراجعت میں انھوں نے اہم رول ادا کیا۔ طلاق کے سبب مجھے اپنی زندگی پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ عدالت میں طلاق کی پیروی کرنے کے دوران متعلقہ ڈاک خانے میں رجنی سوپوری سب پوسٹ ماسٹر تھی، اس نے میری بہت مدد کی۔ میں نے اس کو تب دیکھا تھا جب وہ محکمے میں نئی نئی بھرتی ہوئی تھی۔ کیا حسن تھا، کیا نزاکت تھی اور اس پر انگریزی زبان پر کیا دسترس تھی، میں تو اس کی چال ڈھال اور بول چال سے کافی متاثر ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اس نوکری میں کیا رکھا ہے، بہتر ہے کہ تم آگے پڑھنے کی کوشش کرو اور اچھی نوکری حاصل کر لو۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ خوش گلو بھی ہے اور اسے موسیقی کے ساتھ کافی لگاؤ ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیتوں کی آبیاری کرتی تو کافی نام کماتی۔ اس کے علاوہ طلاق کیس میں میرے ہی دفتر سے سبکدوش ہوئے ملازم، بی ایل تعمیری نے میرے کیس میں کافی دلچسپی لی اور میری مدد بھی کی۔ وہ شاید جج کو جانتے بھی تھے اس لیے کیس کو جلدی نپٹانے کے لیے ان سے درخواست بھی کی تھی۔

جن دنوں میں لداخ دورے پر گیا تھا، میرا افشار خون بہت اونچا ہو گیا۔ اس کے بعد آج تک اس مرض سے چھٹکارا نہیں ملا۔ چھٹکارا تو دور کی بات رہی، یہ مرض تو بڑھتا ہی چلا گیا، پہلے دل کا عارضہ ہوا اور پھر ذیابطس کی بیماری لگ گئی۔ دونوں بیماریاں بالترتیب بیس اور دس سال سے مسلسل جھیل رہا ہوں۔ حال ہی میں پروسٹیٹ کی پرابلم بھی شروع ہوئی۔ ایک بار ہارٹ اٹیک بھی آیا تھا مگر اس کا پتہ ہی نہ

چلا۔ شاید کشمیر میں جن دنوں امرناتھ یاترا کی ایجی ٹیشن چل رہی تھی، انہی دنوں آ گیا تھا۔ ان وجوہات کے سبب مجھے اپنے بارے میں بہت غور وفکر کرنا پڑا۔ اسی دوران میں نے سگریٹ، شراب اور گوشت خوری سے پرہیز کرنے کا قصد کرلیا اور تب سے آج تک میں ان اشیا سے بالکل دور رہتا ہوں۔ اس میں کسی مذہب یا عقیدے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

باغ مہتاب کشمیر میں بنایا ہوا مکان فروخت کیا۔ قریب دس سال بعد مجھے صرف چھ لاکھ ہاتھ آئے کیونکہ ملی ٹینسی شروع ہونے کے بعد فرمان جاری ہوتے رہے کہ کشمیری پنڈتوں کے مکانات کوئی نہ خریدے، کشمیر تو الگ ہونے ہی والا ہے تو پھر یہ ساری ملکیت ہماری ہی ہوگی۔ آہستہ آہستہ جب غبارے کی ہوا نکل گئی، تو خرید وفروخت کا بازار گرم ہوا۔ ضرورت مند کشمیری پنڈت مختار نامہ (Power of Attorney) دے کر اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول بیچنے لگے۔ میرے مکان کی قیمت دو لاکھ سے بڑھ کر چھ لاکھ ہوگئی اور میں نے غنیمت جان کر اسے فروخت کرلیا۔ سوچا اب جو اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہے گا وہ کہیں اور سرمایہ کاری کر کے بھی تو ممکن ہے، کم سے کم وہاں ذہنی پریشانی تو نہ رہے گی۔ اسی سلسلے میں بوڑی، جموں میں زمین خرید کر اس پر یک منزلہ مکان تعمیر کیا۔ کشمیر کے مکان کے لیے میں نے خود ہی نقشہ بنالیا تھا، جموں میں بھی میں نے اسی طرز پر خود ہی نقشہ تیار کرلیا البتہ جے ڈی اے سے پاس کروانے کے لیے اس کو باضابطہ طور پر آرکیٹیکٹ سے کاغذ پر اتروایا۔ مکان کا ڈیزائن بہت ہی اچھا تھا۔ دو سیٹ تھے جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہوتے تھے اور جُڑ بھی جاتے تھے۔ سامنے والے حصے میں ایک کرائے دار رکھ لیا اور پچھلے والے حصے میں خود رہنے لگا۔ کرائے دار بہت اچھا مل گیا تھا۔ بنسی لال کول کے ساتھ میرے گھریلو مراسم قائم ہوگئے۔ وہ اور اس کی بیوی بہت ہی شریف اور ہمدرد تھے۔ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں تھیں۔ میں تو گرمیوں میں سرینگر میں رہتا تھا مگر سردیوں میں جموں آجاتا تھا۔ وہ اپنی جائیداد کی طرح میرے مکان کی رکھوالی کرتا تھا اور جب میں جموں میں ہوتا تو میری خاطرداری میں دونوں میاں بیوی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ ۲۰۰۹ء میں میرا ٹرانسفر دہلی ہوا۔ دونوں بیٹے دہلی میں کام کررہے تھے اور ان کے جموں آنے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ بیوی سے صلاح تو ہوئی تھی مگر وہ چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہنے کی خواہاں تھی۔ بہت کوشش کی کہ وہ اور میں جموں کو مستقر بنائیں اور بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ

دیں تاکہ ان کو ذاتی آزادی مل جائے مگر وہ نہ مانی۔ ناکام ہو کر میں نے مکان بیچنے کا ارادہ کر لیا، اس لیے کرایہ دار کو رخصت کرنا پڑا۔ وہ پہلے فرید آباد میں رہنے لگے اور پھر شالیمار گارڈن میں۔ شومئی قسمت کہ کچھ برس بعد کول صاحب کی خوبصورت، اعلیٰ ظرف اور نیکو کار بیوی کینسر کی وجہ سے انتقال کر گئی۔

میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے شائع شدہ اردو افسانوں کے مجموعوں کا ہندی میں ترجمہ کرواؤں۔ جموں میں ایک ہندی افسر تھی، دلجیت کور، جو مرکزی سرکار کے مختلف محکموں میں ملازمین کو ہندی سکھاتی تھی۔ ہندی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے رکھی تھی، گیہواں رنگ تھا، البتہ کچھ من موجی اور متلون مزاج تھی۔ اکیلی رہتی تھی، جب جو جی میں آتا تھا کر لیتی تھی، کوئی روک ٹوک نہیں۔ میں نے اس سے درخواست کی اور اس نے بغیر کسی پس و پیش کے ہاں کر دی۔ اس کو اردو کی تھوڑی بہت جانکاری تھی مگر اتنی نہیں کہ میری مدد کے بغیر ہی ترجمہ کر لے۔ ہم دونوں ایک ساتھ میرے آفس یا پھر میرے انسپکشن کوارٹر میں بیٹھ جاتے۔ میں اردو میں کہانی پڑھ لیتا اور وہ ہندی میں ترجمہ کر کے لکھتی رہتی۔ سامنے چار پانچ ڈکشنریاں بھی رکھی رہتیں کیونکہ کئی بار مجھے کسی لفظ کا ہندی متبادل صحیح نہیں لگتا تھا اس لیے لغت میں اس کا کوئی مترادف ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ کئی بار میں اس کے گھر بھی گیا۔ چنانچہ وہ اکیلی تھی، اس لیے میرے لیے ہوم سروس سے ڈنر آرڈر کر لیتی اور ہم دونوں اکٹھے کھا لیتے اور گفتگو میں مصروف ہو جاتے۔ اس نے میرے دو افسانوں کے مجموعوں، 'ادھورے چہرے' اور 'چنار کے پنجے' کا ترجمہ کیا جو جلدی ہی شائع بھی ہوئے۔ یہاں پر دلجیت کور کا شکریہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بقول عزلتؔ سلونوی:

؎ سدھارے گل کہاں، سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے
گئی ہیں بلبلیں کیدھر، جلا کر آشیاں اپنا

☆☆☆

ادب ۔ ایک نئی شروعات

ہم خاک میں ملنے پہ بھی ناپید نہ ہوں گے
دنیا میں نہ ہوں گے تو کتابوں میں ملیں گے

(ولی انصاری)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھریلو تناؤ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا گیا۔ جس گھر کو بچانے کے لیے میں نے ادب۔ سے کنارہ کشی کر لی تھی وہ اور بھی زیادہ منتشر ہو گیا۔ ۱۹۹۶ء میں جب میں گھریلو زندگی کی جنگ ہار کر غازی آباد سے تر پورا ٹرانسفر ہوا تو میں نے قلم کی سیاہی کو اکسیر اعظم سمجھ کر دوبارہ اس کا سیون کیا۔ ویدک ریتی رواج کے تحت برہمن کو دوجہ جنما کہا جاتا ہے۔ پہلے اس کا جسمانی جنم ہوتا ہے اور جب وہ لڑکپن میں پہنچ جاتا ہے تو اس کا دوسرا یعنی روحانی جنم ہوتا ہے اور وہ وید اور شاستروں کا ادھین کرتا ہے۔ جنم سے تو میں برہمن تھا ہی مگر یہاں تو ادبی زندگی میں بھی میں نے اس کا پالن کیا۔ پہلی بار جنم تو ہوا تھا مگر ادب میں کوئی خاص مقام نہیں پا سکا۔ اب کے بحیثیت ادیب دوسرا جنم ہوا اور یہ جنم لگ رہا ہے سپھل ہو جائے گا۔

میرے افسانے اب با قاعدہ طور پر عالمی سطح پر شائع ہونے لگے۔ ان میں کچھ بالکل نئے تھے مثلاً رشتوں کا درد [سخنور کراچی]، بٹی ہوئی عورت [تعمیر سرینگر]، ڈرفٹ ووڈ [انشا کولکتہ اور بادبان کراچی سالنامہ]، ڈائننگ ٹیبل [اسباق پونے]، ایک ہی خط [خوشبو کا سفر حیدرآباد]، ادھ کھلی [بیسویں صدی، دہلی]، بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب [سب رس حیدرآباد] وغیرہ۔ کچھ ایسے افسانے تھے جو ساتویں دہائی میں تخلیق کیے گئے تھے اور سرینگر کے مقامی اخباروں مثلاً روزنامہ آفتاب [ریزے، اچانک، اڑن کھٹولہ، آؤ کچھ اور لکھیں، یوم حساب]، روزنامہ ہمدرد [سلمیٰ/خودکشی]، ہفت روزہ عقاب، ہفت روزہ نشیمن [ایک

دو اور تین] اور چند ریاستی و غیر ریاستی رسالوں مثلاً ماہنامہ تعمیر سرینگر [جاگو، بنی ہوئی عورت] ہفت روزہ رفتار جموں [کینچلی]، تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ [ادھورے چہرے]، چیتنا مسوری [راکھ کا ڈھیر]، رگ سنگ کانپور و گنگ و جمن کانپور [پلاسٹک کے پھول/ کالا گلاب، راکھ کا ڈھیر، سپنوں کا شہر]، میل ملاپ [آج جانے دو] اور سینک سماچار دہلی [کون سا نام] میں شائع ہو چکے تھے۔ شیلانگ میں طیش میں آکر میں نے انھیں نذر آتش کر دیا تھا تاہم وہ میرے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ تھے۔ دوبارہ لکھنے کے اس عمل سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اب ان افسانوں میں جذباتیت کم اور فکر و تخیل کے ساتھ پختگی زیادہ نظر آنے لگی۔ کئی افسانوں میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور چند ایک کے عنوان بھی بدل دیے۔ مذکورہ افسانے، ماسوائے دو تین کے، میرے پہلے افسانوں کے مجموعے 'ادھورے چہرے' (اشاعت: ۱۹۹۹ء) میں شامل ہیں۔ اس طرح یہ ققنس راکھ سے پھر پیدا ہو گیا اور میرا اہم راز بن گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تین چار افسانے ابھی تک نہیں لکھ پایا ہوں گو وہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ امید ہے دیر سویر انھیں بھی رقم کر لوں گا۔

یہ سلسلہ یونہی ڈبروگڑھ کی پوسٹنگ کے دوران جاری رہا۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھیے، ڈبروگڑھ میں اس زمانے میں معروف جدید افسانہ نگار انیس رفیع بھی تعینات تھے۔ حالانکہ وہ جدیدیت پسند تھے پھر بھی ان کے ساتھ ادب خاص کر افسانے کے بارے میں گفتگو کرنا مفید ثابت ہوا۔ اصلاً بہاری ہیں مگر بنگال میں پلے بڑھے ہیں۔ کمیونزم سے متاثر ہونا تو لازمی بات ہے۔ قبائلی علاقوں میں بھی ان کے تجربات نرالے رہے ہیں اور اردو ادب کے لیے اہم اضافہ۔ انیس رفیع نے ایک تعارفی خط کے ساتھ میری کہانی 'ڈرفٹ وُڈ' ایک جانب انشا کولکتہ کو بھیج دی اور دوسری جانب بادباں کراچی کو۔ کہانی 'ڈرفٹ وُڈ' تزویج محرمات کے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ ف س اعجاز، مدیر انشا نے موضوع اور کلائمکس کے بارے میں کئی سوالات اٹھائے جن کا میں نے دل کھول کر جواب دیا۔ انھوں نے انشا کا اگلا شمارہ جنسی موضوع کے لیے مختص کر لیا۔ اُدھر پاکستان میں 'بادباں کراچی' کا سالنامہ شائع ہوا جس میں میری کہانی شامل کی گئی تھی جو میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ اس افسانے کے بعد میں کئی اور رسالوں کو اپنی نگارشات بھیجتا رہا اور وہ چھپتے رہے۔ دو ماہی 'گلبن' احمد آباد میں ایک افسانہ 'وہ الھڑ لڑکی' شائع نہ ہو سکا کیونکہ مدیرہ کو اس میں فحشیت نظر آئی۔ خیر افسانہ تو کسی اور رسالے میں چھپ گیا مگر مجھے حیرت ہوئی کہ فحش مثنویوں کو تو کلاسیکی

ادب کہا جاتا ہے، ان کی تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں مگر اس افسانے پر انگلی اٹھائی گئی۔ ’گلبن‘ بعد میں لکھنؤ شفٹ ہوا۔ اسی طرح انشاء کولکتہ میں میری ایک کہانی بعنوان ’ٹھنڈی آگ‘ شائع ہوئی۔ اس کے ردِ عمل میں چند ایک قدامت پسندوں کے منفی تاثرات پڑھ کر اچنبھا ہوا کہ ہم اردو والے ابھی بھی لکیر کے فقیر بنے رہنا پسند کرتے ہیں۔

اسی دورانیے میں میں نے اپنے پہلے مجموعے کو ترتیب دینے کی سعی کرلی اور انیس رفیع نے بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔ انھوں نے مجموعے کا پیش لفظ بھی رقم کیا جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ کتاب کا مسودہ لے کر میں دہلی چلا گیا، ارادہ تو اہلووالیہ بک ڈپو سے بات کرنے کا تھا مگر یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے پہلے موڈرن پبلشرز اور پھر سیمانت پرکاشن کے پاس چلا گیا۔ سیمانت کے مالک، نریندر ناتھ سوز نے کتاب کو اپنے سرمائے سے چھاپنے کی حامی بھرلی اور مسودہ رکھ لیا۔ بہت ہی جذباتی قسم کے بزرگ تھے، اردو سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے اور اپنی کتابوں کے کاغذ اور ٹائٹل کوّر پر خاص دھیان دیتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میری دونوں کتابوں، ’ادھورے چہرے‘ اور ’چنار کے پنجے‘ کے ٹائٹل کوّر مشہور پینٹر امروز (امرتا پریتم کے شوہر) سے بنوائے گئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اول الذکر کتاب کا ٹائٹل کوّر دیکھ کر دل خوش ہوگیا اور پھر میں نے چنار کے پنجے کا ٹائٹل کوّر بنوانے کے لیے کشمیر سے چنار کے سوکھے پتے منگوا کر ناشر کو بھیج دیے تا کہ ان کی پینٹنگ میں آسانی ہو۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ آرٹسٹ چنار کے پتے بناتے وقت یا تو کینیڈا کے میپل درخت (Maple tree) کا پتہ ذہن میں رکھتے ہیں یا پھر انگور (Wine) کا پتہ، کیونکہ دونوں چنار کے پتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ خیر دونوں کتابوں کے کوّر دیدہ زیب تھے البتہ پہلی کتاب میں پروف ریڈنگ کی کافی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ میں نے سوز صاحب سے کمپوز کر کے کتاب مجھے بھیجنے کی درخواست کی تھی تا کہ میں اس کی کاپی ریڈنگ خود کرلوں مگر انھوں نے مجھے آشواسن دیا تھا کہ کتاب میں کوئی غلطی نہیں رہے گی کیونکہ کاپی ریڈنگ ہیرانند سوز صاحب کرتے ہیں۔ آخرش ہوا وہی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ کتاب میں ایک سو سے زیادہ غلطیاں تھیں، مثلاً ’ققنس‘ کو ’قفس‘ لکھا گیا تھا وغیرہ۔ خیر کتاب میں اغلاط نامہ لگایا گیا اور دوسری کتاب ’چنار کے پنجے‘ کی پروف ریڈنگ میں نے خود ہی کی۔ نریندر ناتھ سوز کے بیٹے اس کاروبار میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، والد کے ہوتے ہوئے ہی گھر میں تناؤ بڑھ گیا تھا۔ اسی

تناؤ میں انھوں نے مجھے کچھ ایسا لکھا کہ میں نے ان کو مزید کتابیں بھیجنا بند کر دیا۔ حالانکہ کئی برس بعد وہ جموں میں مجھ سے ملے اور اپنے خط میں لکھی ہوئی تحریر پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ مگر اس کے بعد وہ بات پھر سے نہ بن پائی جو پہلے بنی تھی۔ میں نے سرینگر کشمیر میں میزان پبلشرز کے مالک شبیر احمد سے کتابیں چھپوانا شروع کر دیا۔ گذشتہ بیس برسوں کے دوران میرے چھ افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور چند ایک کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ نام یوں ہیں: (۱) ادھورے چہرے [تین ایڈیشن ۱۹۹۹ء/ ۲۰۰۵ء/۲۰۱۴ء]، (۲) چنار کے پنجے [دو ایڈیشن ۲۰۰۵ء/۲۰۱۴ء]، (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی [دو ایڈیشن ۲۰۰۷ء/۲۰۱۸ء]، (۴) ریزہ ریزہ حیات [۲۰۱۰ء]، (۵) روح کا کرب [۲۰۱۵ء]، (۶) اب میں وہاں نہیں رہتا [۲۰۱۷ء]۔ ان کے علاوہ ایک افسانچوں کا مجموعہ، مٹھی بھر ریت [۲۰۱۵ء] بھی شائع ہو چکا ہے۔ ادھورے چہرے اور چنار کے پنجے کے ہندی ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔

سلطانہ مہر اپنے تذکرے 'گفتنی دوم (نثر نگاروں کا تذکرہ) میں فرماتی ہیں:

> ''دیپک بدکی ایک افسانہ نگار ہیں۔ جو نہ ہندو ہے، نہ مسلمان اور نہ عیسائی۔ اس کا دل ایک مظلوم کے دکھ سے تڑپتا ہے۔ انسانیت پر ظلم و بربریت دیکھ کر آنکھیں خون بھرے آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہیں۔''

اس ضمن میں مجھے حبیب جالبؔ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

؎ ہم کشمکش دیر و حرم سے ہیں بہت دور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے

کچھ مدت کے بعد ف س اعجاز نے اپنی ایک کتاب 'صاحب فن' برائے تبصرہ بھیج دی۔ اس سے پہلے میں نے اپنی کتاب 'ادھورے چہرے' ہرچرن چاولہ کو ناروے کے ایڈریس پر روانہ کی تھی جس کا جواب انھوں نے تاخیر سے دیا تھا کیونکہ وہ اپنی بیٹیوں کے پاس آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ ان کا تبصرہ مجھے بہت پسند آیا۔ تجزیاتی اور بے لاگ تھا۔ ایک ایک افسانے کو انھوں نے پڑھا تھا اور اس پر اپنی رائے پیش کی تھی۔ میں نے اس تبصرے کو ماڈل بنا کر ف س اعجاز کی کتاب پر تبصرہ کیا اور انھیں روانہ کر دیا۔ نہیں معلوم

انھیں پسند آیا یا نہیں مگر میری تو گاڑی چل پڑی۔ اس کے بعد کتابیں آتی رہیں اور میں ان پر اپنے تاثرات قلم بند کرتا رہا۔ تبصرے لکھنے سے پہلے میں کتابوں کو اوّل تا آخر پڑھتا ہوں، نوٹس بناتا ہوں اور تب جاکر ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ ان تبصروں میں نہ تو عام تبصروں کی سطحیت اور اختصار ہوتا ہے اور نہ ہی انتقادی کلیشے اور طوالت۔ اس کے علاوہ ان میں کسی مکتب یا نظریے کی بازگشت نہیں ملتی۔ تبصرے قارئین اور دیگر نقادوں کو پسند آئے یہاں تک کہ ایک تبصرہ نگار نے اعتراف کیا کہ اس نے میرے تبصروں سے رہنمائی حاصل کر کے تبصرے رقم کرنا شروع کیا۔ اب تک میں نے قریباً ۲۷۵ ر تبصرے اور ۶۰ ر تنقیدی و تحقیقی مضامین رقم کیے ہیں۔

میری پہلی کتاب 'عصری تحریریں' کے بارے میں وارث علوی کے ایک خط مرقومہ ۵ ر فروری ۲۰۰۷ء کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

> ''آپ کی کتاب 'عصری تحریریں' پوری پڑھ ڈالی۔ اسی لیے خط لکھنے میں دیری ہوئی۔ بہر حال کتاب بہت پسند آئی۔ خصوصاً افسانہ نگاروں پر مضامین بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ ان میں سے بہت سوں سے میں واقف نہیں تھا۔ ایک تو یہی تجسس تھا کہ جانوں کہ وہ کیا لکھتے ہیں۔ پھر آپ نے ان کا تعارف ایسے جامع طریقہ پر کرایا کہ ان کی تحریروں سے پوری واقفیت ہوگئی..... بہت سے انجان کشمیری شعرا کا بھی تعارف حاصل ہوا۔ تنقید میں ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کی کتاب ساحر لدھیانوی پر آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ یہ واقعی قابل تعریف کتاب ہے۔ .... نظم افسانہ تنقید تینوں پر آپ کو دسترس حاصل ہے۔ آپ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ مغربی ادب کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ سے ایک ہی گزارش ہے کہ زیادہ طاقتور لوگوں سے نبرد آزمائی کریں وسیع تر جولانگاہ میں نقاد کے جوہر زیادہ عیاں ہوتے ہیں۔''

وارث علوی صاحب سے میری پہلی ملاقات ایم ایس یو، وڈودرا، گجرات میں ہوئی جہاں وہ اردو شعبے میں سعادت حسن منٹو پر لکچر دینے آئے تھے۔ ان کی شرافت، حلیمی اور تبحر علمی کو دیکھ کر میں ان کا قائل ہو گیا۔ کچھ سوالات بھی پوچھ لیے جن کا انھوں نے خاطر خواہ جواب دیا۔ انھوں نے نہ جانے میری تحریروں میں ایسا کیا دیکھ لیا کہ اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں میں نہ تو اردو اور نہ ہی کسی اور زبان کے لٹریچر کا فارمل طالب علم رہا ہوں اس لیے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بعید از قیاس ہے۔ ہاں ادبی سفر کے دوران جو کتابیں ہاتھ میں آئیں ان کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اردو میں میرے چہیتے شاعر غالبؔ، فیضؔ اور ساحرؔ ہیں جبکہ افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے بہت متاثر کیا ہے۔ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں جو سائنس، تاریخ، نفسیات، جنسیات اور فکشن سے متعلق ہیں یہاں تک کہ 'کتاب کا خود کیسے مطالعہ کریں' جیسے موضوع پر بھی چند کتابیں پڑھی ہیں۔ انگریزی کے کچھ رائٹرس جنھوں نے مجھے متاثر کیا ہے ان کے نام یوں ہیں: موپاساں، دوستوسکی، میکسم گورکی، چیکوف، ارونگ سٹون، خلیل جبران، آئین رینڈ، رچارڈ باک، ایچ جی ویلز، برٹرینڈ رسل، ابراہیم کووُر اور ڈیل کارنیگی۔ سماجیات کے حوالے سے ایلون ٹافلر کی کتاب Future Shock؛ مذاہب کے حوالے سے چیمپئن اور شارٹ کی مرتبہ کتاب Readings from World Religions؛ جنسیات کے حوالے سے ایرک برن کی کتاب Games People Play؛ تھامس اے ہیرس کی کتاب I am OK, You're OK اور شیخ النفضوی کی کتاب The Perfumed Garden (مترجم سر رچارڈ برٹن) بڑی کار آمد ثابت ہوئیں۔

وارث علوی کے لیکچر کے دوران ایم ایس یونیورسٹی کے ایک لکچرر، انور ظہیر انصاری سے ملاقات ہوئی جو بعد میں گہری دوستی میں بدل گئی۔ پروفیسر انور ظہیر کھلے ذہن اور صاف وشفاف شخصیت کے مالک ہیں۔ بہت ہی اچھے تحقیق اور تنقید نگار ہیں۔ ان کی ساحر لدھیانوی پر لکھی ہوئی کتاب بہت مقبول ہوئی۔ یہ کتاب دراصل ان کے پی ایچ ڈی مقالے پر مبنی ہے جو انھوں نے جے این یو میں پیش کیا تھا۔ وڈودرا میں ان کا ساتھ بہت ہی فائدہ مند رہا کہ مجھے مسلسل لکھنے کی تحریک ملتی رہی۔ ادب کے معاملے میں کئی بار ان سے صلاح مشورہ کرتا رہا کہ وہ یوپی کے باشندے ہیں اور اردو ان کی مادری زبان ہے۔

‘عصری تحریریں‘ میں ’باب مانک ٹالا‘ کے تحت پانچ مضامین اور دو کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ اس حوالے سے برمنگھم سے قیصر تمکین نے اپنے خط مرقومہ ۸ر فروری ۲۰۰۷ کو لکھا تھا:

> ’’ہاں مانک ٹالا بہت معمر تجربہ کار اور متین و شائستہ ادیب ہیں۔ آج کی بالکل ہی نئی نسل میں بھی شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو ان کے افکار و نگارشات سے ناواقف ہو۔ مانک ٹالا صاحب کی خدمات کا خاطر خواہ اعتراف تا حال نہیں کیا جا سکا ہے۔ آپ نے اپنے مجموعۂ مضامین میں بڑی حد تک یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب کے شروع میں جو چھ مضامین ان کے بارے میں ہیں وہ اگر تھوڑی اور محنت کر کے منضبط کیے جائیں تو ایک جامع اور بسیط مقالے کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک ایسا مقالہ جو ان تحریروں سے بہر حال بہتر ہوگا جن سے گھوٹ گھاٹ کر اردو خور حضرات پی ایچ ڈی کما لیتے ہیں۔‘‘

اب تک میرے چار تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تبصروں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ عصری تحریریں [۲۰۰۶ء]، عصری شعور [۲۰۰۹ء]، عصری تقاضے [۲۰۱۳ء] اور عصری تناظر [۲۰۱۸ء]۔ دو اور مجموعے ’عصری نقوش‘ اور ’جموں و کشمیر کا عصری ادب‘ زیر طباعت ہے۔ اس کے علاوہ وارث علوی صاحب کی خواہش کے مطابق ایک اور کتاب ’ادبی مباحثے‘ اردو کے جید قلمکاروں پر لکھی ہے جو اس وقت ناشر کے پاس اشاعت کی غرض سے پڑی ہے۔ دریں اثنا ایک تحقیقی کتاب۔ ’اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار‘ ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی جس کی امید سے زیادہ پذیرائی ہوئی کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔

میں نے اپنی تحریروں میں کئی اصطلاحات اور ترکیبوں کا اختراع اور توضیع کی ہے خاص کر جہاں انگریزی الفاظ کے متبادل اردو میں نہیں ملتے ہیں یا پھر جو استعمال ہوتے ہیں وہ ثقیل نظر آتے ہیں۔ چند ترکیبیں یوں ہیں: مخلصی موت (Euthanasia)، نرینہ عصبیت/جبریت (Male (chauvinism)، دہنی صحبت (Oral Sex)، درز بینی (Voyeurism)، چداسیت (Nymphomania)، تزویج محرمات (Incest)، ادلا بدلی (Partner swapping) نباتاتی ارژنگ (Herbarium) وغیرہ۔

جادۂ ادب پر میں اکیلا ہی گامزن رہا اور اب تک اکیلا ہی چلتا جا رہا ہوں۔ نہ لوگ ملتے رہے اور نہ ہی کارواں بنتا گیا۔ اردو میں کوئی فارمل تربیت حاصل نہیں کی، نہ کسی کو استاد بنایا اور نہ ہی کسی کا شاگردی قبول کی، نہ کسی مکتب فکر سے نزدیکی رہی اور نہ ہی کبھی نیٹ ورکنگ کی کوشش کی، نہ کسی نامور ادیب یا نقاد کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی ادارے سے انعام و اکرام پانے کی تگ و دو کی۔ ہاں اتفاق سے ملازمت کی وجہ سے شمس الرحمٰن فاروقی سے ملاقات ہوئی مگر ان سے بھی ادبی طور پر دوری ہی اختیار کی کیونکہ ہمارے نظریات میں اختلاف تھا۔ حیرت تو اس بات کی ہوئی کہ ایک روز میں ابھینو تھیئٹر، جموں میں بطور سامع نشست پر بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے سٹیج سے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے سامنے اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار دیپک بدکی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میری بغل میں ایک کشمیری شاعر دوسرے کو کہنے لگا، ''یار یہ کون ہے دیپک بدکی، میں نے تو نام بھی نہیں سنا ہے۔'' میں ان کو دیکھ کر مسکرایا۔ جی کرتا تھا کہ کہہ دوں کہ بھئی نام تو تب معلوم ہو جاتا جب آپ مطالعہ کرتے مگر آج کل کی نسل کو تو اپنے کلام کے سوا دوسروں کا کلام پڑھنا بھی ناگوار گزرتا ہے، مگر میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ جیسے میں نے پہلے بھی عرض کی ہے میں برصغیر ہند و پاک کے معروف رسالوں میں چھپتا رہا ہوں، ان کے مدیروں سے خط و کتابت رہی مگر ذاتی طور پر میں بہت عرصے تک کسی کو نہیں جانتا تھا۔ پہلی بار میں وڑودرا، گجرات میں ۲۰۰۳ء کے آس پاس مشاعرہ سننے کے لیے چلا گیا جہاں پر افتخار امام صدیقی، ندا فاضلی اور دیگر شاعروں سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد افتخار امام صدیقی سے شاعر کی وساطت سے بہت قربت رہی۔ بدقسمتی سے انھیں ایکسیڈینٹ سے دوچار ہونا پڑا اور اس کے بعد ان کی صحت پوری طرح بحال نہ ہو سکی۔ اس دوران میری گوا میں تقرری ہوئی اور ممبئی ہیڈکوارٹر تھا۔ اس طرح شاعر کا دفتر دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ دفتر کی خستہ حالت دیکھ کر میں مدیران شاعر کو دل سے سجدہ کرنے لگا کہ ایسے حالات میں بھی وہ اس وراثت کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ شاعر کے شمارہ بابت ستمبر ۲۰۰۴ء میں افتخار امام صدیقی نے میرا گوشہ

بڑے اہتمام سے چھاپ لیا جس کے لیے انھوں نے صرف -/۵۰۰۰ روپے بطور مالی اعانت قبول کیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کو بازار بنا رکھا ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ ان ہی کا کلیجہ ہے کہ وہ ایسا میگزین نکالتے ہیں، ایک طرف قارئین غائب اور دوسری طرف اشتہارات کی کمی۔ شاعر کے بعد ہی انتساب، سرونج کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی اور اسباق، پونے کے مدیر نذیر فتح پوری نے میرے مفصل گوشے شائع کیے جس کے لیے ان کو بھی پانچ پانچ ہزار کی رقم بھیج دی۔ حال ہی میں مجھے مدھیہ پردیش اکادمی نے دوبار پروگراموں میں شرکت کرنے کے لیے بلایا اور مجموعی طور پر مبلغ تیس ہزار روپے بطور اعزازیہ عنایت کیے جو میں نے ڈاکٹر سیفی سرونجی کو خصوصی نمبر چھپوانے کے لیے دے دئے۔ ۳۶۸ صفحات پر مشتمل یہ نمبر کافی ضخیم تھا اور اس میں میرے فن سے متعلق بہت سارے مضامین اور چند نئے افسانے، مضامین و تبصرے شامل کیے گئے تھے۔ اس میں میری کچھ نظمیں بھی شامل تھیں حالانکہ میں خود کو شاعر نہیں سمجھتا اور یہ نظمیں محض تفریح کے لیے میں نے کہی ہیں۔ اس کے علاوہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے جو بھی کتابیں چھپ جاتی ہیں ان کے لیے مجھے ذاتی طور اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ کتابیں تو مفت میں بانٹ دیتا ہوں۔ ہاں ایک دو اشخاص ایسے ہوتے ہیں جو کتابیں خرید لیتے ہیں مگر وہ آمدنی تو دوسری کتابوں پر ڈاک خرچ کے طور پر صرف ہوتی ہے خاص کر پاکستان بھیجنے میں تو اب بہت سارا محصول دینا پڑتا ہے۔

جموں میں میرے قیام کے دوران آل انڈیا مشاعرہ اور کئی سیمناروں کا انعقاد ہوا جس کے توسط سے کئی ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں انتساب سرونج کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی، اسباق پونے کے مدیر نذیر فتحپوری اور مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر محبوب راہی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنی سوانح خود نوشت 'زندگی اپنی....' میں اس ملاقات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بعد میں سرونج میں ڈاکٹر سیفی سرونجی اور پونے میں نذیر فتحپوری کی میزبانی کا بھی لطف اٹھایا کہ دونوں نے بڑے اہتمام سے میرا استقبال کیا۔ پونے میں قاضی مشتاق احمد سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

گوا میں پوسٹنگ کے دوران وہاں کی اکادمی نے مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں گوپی چند نارنگ، گلزار اور دیگر شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے بھی شرکت کی دعوت ملی۔ مانڈووی ندی میں کشتی پر

پروگرام منعقد ہوا تھا اور بہت ہی اچھا انتظام تھا۔ گلزار کی شخصیت سے کافی متاثر ہوا۔ زمین سے جڑے ہوئے شاعر ہیں، مخلص اور نفاست پرست، سب سے گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔

اِدھر ویریندر پٹواری سے خط وکتابت رہی۔ وہ بھی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے معذور ہو گئے ہیں تاہم ان کا حوصلہ دیکھیے کہ تب بھی لکھتے جا رہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جدید طرز انداز، علامتیں اور استعارے ملتے ہیں اور وہ تلمیحات کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بھائی، اشوک پٹواری بھی، جو پیشے سے ڈاکٹر ہیں، بہت اچھے نفسیاتی افسانے رقم کرتے ہیں۔ دونوں سے کافی رابطہ رہا ہے مگر آج تک ملاقات نہیں ہو پائی۔ جب میری پوسٹنگ بحیثیت پوسٹ ماسٹر جنرل دوبارہ سرینگر ہوئی تو ویریندر پٹواری نے مجھے نور شاہ سے ملنے کی تاکید کی تھی۔ نور شاہ کے چھوٹے بھائی بشیر شاہ (مرحوم) کو تو میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ بہت عرصہ پہلے ان سے ریڈیو کشمیر میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھی مگر نور شاہ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کشمیر کے بہت ہی برگزیدہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو کی خدمت کی ہے۔ سرینگر پہنچتے ہی میں نے نور شاہ سے ٹیلی فون پر بات کی۔ اسی دن وہ میرے پاس سرینگر جی پی او میں ملنے کے لیے آ گئے۔ ان کی شرافت، خلوص اور محبت کو دیکھ کر میں بہت ہی متاثر ہوا۔ بعد میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہر بار ان کی شخصیت کے نئے اور عمدہ پہلو سامنے آتے رہے۔ ان کی شخصیت اور کتابوں پر میں نے کئی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ نور شاہ کے علاوہ ایک اور ادیب سے اتفاقاً ملاقات ہوئی جو قریبی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ لمبے تڑنگے، منہ پر لالی اور خلوص سے بھرپور فرید پربتی جو کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ان کو دیکھ کر کون قیاس کر سکتا تھا کہ وہ جوانمرگ ہو جائیں گے۔ انھیں شاعری خصوصاً کلاسیکی شاعری، رباعیات اور دکنی شاعری سے انس تھا۔ اس کے علاوہ وہ تنقید میں بھی اپنا نام کما چکے تھے۔ حالانکہ مجھے سیکورٹی کی وجہ سے کہیں جانے کی مناہی تھی مگر وہ کہاں ماننے والے تھے، یونیورسٹی کے پروگراموں میں زبردستی لے جاتے اور ان کی توسط سے میں لائبریری کا ممبر بھی بن گیا۔ ایک منحوس دن تھا جب سرطان کی وجہ سے ان کی رحلت کی خبر ملی!

سرینگر میں دو خواتین شاعرات سے بھی ملاقات ہوئی۔ سیدہ نسرین نقاش۔ اتفاقاً جی پی او میں آمنا سامنا ہوا۔ نسرین نقاش نے پاکستانی میگزینوں میں میرا تعارف کرایا۔ ان کی کاوشوں کا ہی نتیجہ تھا کہ

تخلیق میں میری کتابوں پر انور سدید نے اپنے تبصرے مرحمت فرمائے۔ اس کے برعکس شبنم عشائی آزاد رو، اور انٹلکچول قسم کی شاعرہ ہے، علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کیا ہے اور اب ریڈیو کشمیر میں کام کرتی ہیں۔ جدیدیت سے متاثر ہے، آزاد نظمیں لکھتی ہیں اور ان کی نظموں میں تہہ در تہہ معنی چھپے ہوتے ہیں۔ سرینگر میں کئی اور ادیبوں سے جانکاری ہوئی مثلاً عبدالغنی شیخ، ترنم ریاض، سلیم سالک، پرویز مانوس، ڈاکٹر اشرف آثاری، زاہد مختار وغیرہ۔ سلیم سالک سے خاص طور پر متاثر ہوا کہ اس نوجوان میں بہت کچھ کرنے کی قابلیت ہے اور وہ اردو ادب میں اپنا نام روشن کرے گا۔ دوردرشن ’کشمیر چینل‘ پر پیش کیے جا رہے پروگرام ’گوڈ مارننگ جموں و کشمیر‘ کے میزبان محمد امین بٹ سے بھی رابطہ ہوا جو دوستی میں بدل گیا۔ بٹ صاحب کشمیر کے جانے مانے ڈرامہ نگار اور پریزنٹر ہیں۔

۱۹۹۹ء میں میرے پہلے افسانوں کے مجموعے ’ادھورے چہرے‘ کے اجرا کے بعد میں اس کی ایک جلد ماہر اقبالیات ’جناب جگن ناتھ آزاد‘ کو پیش کرنے کے لیے گاندھی نگر جموں میں ان کی رہائش پر حاضر ہوا۔ اس سے قبل بہت عرصہ پہلے ان سے سرینگر میں آفس میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بڑے ہی پر خلوص، انسان پرور اور ہمدرد انسان تھے۔ انھوں نے کافی حوصلہ افزائی فرمائی۔ جموں میں پریمی رومانی سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان سے تو پہلے ہی سے جانکاری تھی۔ ان کے پتاجی ڈاکٹر برج پریمی جموں ہی میں مائیگریشن کے کچھ سال بعد سورگ سدھار گئے۔ منٹویات کے حوالے سے ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ پریمی رومانی نے اپنے پتاجی کے ادھورے کام کو مکمل کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی اپنی شاعری اور تنقید کی طرف دھیان دیتے رہے۔ جموں میں کچھ اور ادیبوں سے رابطہ ہوا جیسے عرش صہبائی، خالد حسین، دیپک کنول، آنند لہر، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، امین بنجارا، عشاق کشتواڑی، لیاقت جعفری وغیرہ۔ ساج راجوری کی زنفر کھوکھر سے بھی موبائل پر رابطہ رہا حالانکہ ہم کبھی ایک دوسرے سے ملے نہیں۔ مجھے زنفر میں ایک بے باک اور نڈر افسانہ نگار کی رمق نظر آئی۔

میرے فکر وفن کے حوالے سے دو کتابیں؛ ’ورق ورق آئینہ - دیپک بدکی، شخصیت اور فن‘ (مرتب: پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری) اور ’دیپک بدکی کی افسانہ نگاری‘ (مصنف: جاوید اقبال شاہ) بالترتیب ۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کے

علاوہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے ماہنامہ انتساب عالمی سرونج نے میرے فکر وفن پر خصوصی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء شائع کیا جبکہ ماہنامہ شاعر ممبئی، ماہنامہ انتساب سرونج اور ماہنامہ اسباق پونے نے میرے کارناموں پر بالترتیب ۲۰۰۴ء، ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں خصوصی گوشے شائع کیے۔ کچھ ادارے اور اکادمیاں کہانی پڑھنے یا پھر سیمنار میں کوئی مقالہ پیش کرنے کے لیے بھی دعوت دیتے رہے۔ چند طلبہ نے میری شخصیت اور فکر وفن پر ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے لیے مقالے قلم بند کیے جن کی تفصیل یوں ہے: (۱) مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ایم ایس یونیورسٹی بروڈہ، گجرات، ۲۰۱۵ء۔ ’دیپک بدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ‘، مقالہ نگار: ڈاکٹر شیخ صفیہ بانو اختر حسین۔ (۲) مقالہ برائے ایم فِل، جموں یونیورسٹی۔ ’دیپک بدکی کی افسانہ نگاری‘، مقالہ نگار: جاوید اقبال شاہ۔ (۳) مقالہ برائے ایم فِل، سکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد-۴۶، ’دیپک بدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار‘، مقالہ نگار: محمد امین نجار۔ (۴) مقالہ برائے ایم فِل، سکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد-۴۶، ’دیپک بدکی کی افسانہ نگاری: ’روح کا کرب‘ اور ’ریزہ ریزہ حیات‘ کے حوالے سے‘، مقالہ نگار ریاض احمد نجار۔ علاوہ ازیں ایک طالب علم اندور میں میری حیات و کارناموں پر ڈاکٹریٹ کی تھیسز لکھ رہا ہے اور فیصل آباد، پاکستان میں ایک طالبہ ایم فِل کے لیے مقالہ تیار کر رہی ہے۔ بقول غالب:

؎ تھی وطن میں شان کیا غالب؟ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

☆☆☆

جب گجرات دہک اٹھا

میرا اگلا پڑاؤ وڈودرا (بروڈہ)، گجرات تھا۔ یہ پہلا مقام تھا جہاں میں نے چار سال کا پورا معیاد عہدہ مئی ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۴ء گزارا۔ ابتدا میں وہاں کا ماحول دیکھ کر کچھ اطمینان سا ہوا۔ عورتیں کسی خوف و خدشے کے بغیر رات بھر گھومتی پھرتی نظر آئیں خاص کر نوراترا کے دنوں میں۔ ہر جگہ پنڈال لگ جاتے، ڈانڈیا ہوتا، دوشیزائیں رنگ برنگے گجراتی پوشاکوں میں لڑکوں کے ساتھ ناچتیں اور ماحول میں ایک عجیب سی شادمانی و فرحت نظر آتی۔ دیر رات تک سارا گجرات جاگتا رہتا۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ پوسٹنگ اتفاق سے ہوئی۔ کشمیر سے میری پوسٹنگ سِکم کر دی گئی تھی۔ مجھے تو جانے کا من ہو رہا تھا کیونکہ مجھے نارتھ ایسٹ بہت اچھا لگتا ہے مگر اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انتظامیہ نے مجھے فُٹ بال سمجھ رکھا ہے۔ کشمیر سے نارتھ ایسٹ اور نارتھ ایسٹ سے کشمیر جبکہ ان کے چہیتے دہلی میں برسوں سے ٹکے ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے احتجاج کیا۔ اس ٹائم کے وزیر اعظم، واجپئی صاحب کو براہ راست درخواست بھیج دی جس میں پہلے تو ماضی میں اپنی تقرریوں کا بیورا دیا اور پھر ان سے سوال کیا کہ وہ خود ہی طے کر لیں کہ کیا مجھے سِکم بھیجنا جائز ہے۔ آخر میں یوں تحریر لکھی ”مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کی حکومت میں ‘رام راج’ تو ملنے سے رہا، یہاں غریب بے سہارا لوگوں کی شنوائی بھی نہیں ہوتی۔“ دوسرے روز ممبر پرسنل کا ٹیلی فون آیا، انھوں نے اس بارے میں کافی طویل بات کی اور آخر کار میرا ٹرانسفر آرڈر بدل کر مجھے وڈودرا بھیج دیا۔

گجرات کے بارے میں لوگوں نے کئی غلط فہمیاں پال رکھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ گجرات ہندوستان کی ایسی ریاست ہے جہاں لوگ بہت محنت کرتے ہیں اور مٹی میں سے سونا نکال سکتے ہیں۔ گجراتیوں میں قومیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بڑی مردم خیز جگہ ہے۔ گاندھی، ولبھ بھائی پٹیل، جناح اور

بھٹو یہیں کی پیداوار ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ گجرات ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے کچھ ہٹ کر ہے، بالکل نہیں۔ یہ نیویارک ہے نہ پیرس۔ البتہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں یہاں کا نظام بہتر ہے۔ ممبئی کی ترقی میں بھی گجراتیوں کا کافی یوگدان رہا ہے۔ آزادی کے بعد جس بھی پارٹی نے یہاں حکومت کی، کچھ نہ کچھ اچھا کام ضرور کیا ہے۔ جہاں دیکھو بڑے بڑے کارخانے نظر آتے ہیں۔ گجرات میں کیمیاوی صنعتوں کا ایک جال سا بچھا ہے۔ انفراسٹرکچر بھی غضب کا دستیاب ہے۔ کھلی کشادہ سڑکیں، بلور کی طرح ہموار جن پر آپ گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کر سکتے ہیں۔ بجلی اور پانی چوبیس گھنٹے دستیاب رہتے ہیں۔ جام نگر کا ریلائنس پٹروکیمکل کامپلکس دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح میں آنند کا امول دودھ کا کارخانہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ہندوستان میں امداد باہمی کی جو تحریک چلائی گئی تھی اس میں صرف امول ہی ایک ایسی واحد کواپریٹو سکیم ہے جو کامیابی سے سرفراز ہوئی جبکہ دیگر ریاستوں میں امداد باہمی کی تمام کوششیں ناکام رہ گئیں۔ البتہ ایک بات جو میری نوٹس میں آئی وہ یہ تھی کہ کچھ سالوں سے چھوٹی اور متوسط صنعتیں گجرات سے دوسری ریاستوں میں منتقل ہو رہی تھیں۔ اس کی کیا وجہ ہے مجھے کوئی بتا نہیں پایا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ یہاں کا ٹیکس سسٹم ان کو کچھ معقول رعایتیں نہیں دے رہا ہے، جس کے سبب ان کو بہت خسارہ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اکثر صنعتی مراکز میں اب کوئی بھی فیکٹری کام نہیں کر رہی تھی۔ ایسا بھی سننے میں آیا کہ گجرات کی بہ نسبت گوا، دمن اور دیو میں زیادہ سہولتیں فراہم کی گئی ہیں اور اس وجہ سے صنعت کار اپنی فیکٹریاں گجرات سے وہاں شفٹ کر رہے ہیں۔ اس بارے میں مجھے کیسے خبر ہوئی یہ بھی ایک عجیب سا واقعہ ہے۔ میں ہالول اور کالول کے ڈاک خانوں کا معائنہ کرنے گیا تھا کہ پتہ چلا کہ گجرات میں پانچ ڈسٹرکٹ صنعتی سنٹر ٹھپ پڑے ہوئے ہیں اور وہاں کے پوسٹ آفسوں میں کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ سٹاف سے بات کی تو انھوں نے اس کی تصدیق کر لی۔ مجھے ایسا شک ہوا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جہاں ایسے صنعتی سنٹر شہر سے متصل ہیں وہاں ان صنعتوں کو ایک سوچی سمجھی چال کے تحت خسارے میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ زمین کے پلاٹ، جو ماضی میں گورنمنٹ سے بہت سستے داموں خریدے گئے ہیں، کئی گنا داموں پر فروخت کیے جا سکیں۔ اس طرح ان صنعت کاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ میں واپس اپنے دفتر پہنچا اور ان پانچوں ڈاکخانوں کو بند کرنے

کے پروپوزل منگوائے۔ کچھ ہی دنوں میں پانچوں ڈاک خانے بند کرنے کے احکامات جاری کیے گئے۔ اس کے علاوہ میں نے ڈیپارٹمنٹ کو خسارے سے بچانے کے لیے ایک اور اہم قدم اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ برانچ آفسوں میں خواہ مخواہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے الگ الگ ملازموں کی تقرری کی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانے میں ان لوگوں کو 'ایکسٹرا ڈیپارٹمنٹل ایجنٹ' کہا جاتا تھا اور ان کی تنخواہ ۱۱۰/- روپے مقرر تھی۔ یہ نوکری مستقل نہیں تھی بلکہ ان کی کمائی کا بنیادی ذریعہ کھیتی باڑی یا تجارت ہوتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آ گئی، دیہاتوں میں پڑھے لکھے بے روزگاروں کی بھیڑ ہونے لگی اور انسپکٹروں نے ان نوجوانوں کو نوکر لگانا شروع کر دیا۔ پھر یونین کے لوگ میدان میں اتر آئے اور ان کی تنخواہ زمانے کے حساب سے مانگنے لگے یہاں تک کہ ان کو اب 'گرامین ڈاک سیوک' کہا جاتا ہے اور ماہوار تنخواہ دس سے پندرہ ہزار ہو گئی ہے جبکہ کہیں کہیں پر ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کا کام بھی نہیں ہوتا۔ لداخ میں ایک برانچ آفس میں میں نے صرف دو اینٹری دیکھ لیں، ایک اپنی تنخواہ لینے کی اور دوسری اپنے ہرکارے کی تنخواہ دینے کی۔ ہو سکتا ہے کچھ چٹھیاں پوسٹ ہوتی ہوں مگر اتنی نہیں کہ وہاں ڈاک خانہ ہونا چاہیے۔ لیکن کیا کریں ایمرجنسی کی فیملی پلاننگ کی طرح برانچ آفس کھولنے کے ٹارگیٹ دیے جاتے ہیں، بے تحاشہ پوسٹ آفس کھولے جاتے ہیں اور وہاں پر سٹاف لگایا جاتا ہے۔ اس کا تدارک کرنے کے لیے میں نے سبھی ڈاکخانوں کے ای ڈی سٹاف کا ریویو کروایا اور وڈودرا ریجن میں ایک ہزار سے زیادہ پوسٹ ختم کر دیے۔ مسئلہ کورٹ تک پہنچا مگر میں نے یہ دلیل پیش کی کہ آج تو محض ایک ہزار اسامیاں رد کی جا رہی ہیں، کل کو خسارے کی تاب نہ لا کر کہیں چھ لاکھ ملازموں کو تنخواہ کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اس پر یہ بھی جواز دیا کہ میں نے کسی موجودہ ملازم کو نوکری سے برطرف نہیں کیا۔ کورٹ نے میری دلیل مان لی۔ پھر یہ معاملہ پارلیمنٹ میں اٹھایا گیا مگر وہاں بھی میں نے اپنے دفاع میں نہ صرف معقول براہین رکھے بلکہ کورٹ کا آرڈر بھی ساتھ میں منسلک کر دیا۔ گجرات کے بعد میں جہاں بھی گیا یہ کارروائی کرتا رہا۔ جموں و کشمیر سرکل میں بھی تقریباً ایک ہزار مزید اسامیاں منسوخ کر لی گئیں۔ اس کا البتہ ایک اور نتیجہ نکلا جس کے باعث اتنا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ایک ایک پوسٹ کو بھرنے کے لیے امیدواروں سے رشوت لی جاتی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ گروپ بی کے افسر جب پوسٹل سٹاف کالج میں ابتدائی تربیت کے لیے آتے ہیں تو سب سے

پہلے ہر سرکل میں جی ڈی ایس لگانے کی ریٹ دریافت کرتے ہیں۔ یہ ریٹ ایک لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ غرض یہ کہ اگر اوسط ریٹ پچاس ہزار ہی مان لی جائے تو دو ہزار پوسٹوں میں دس کروڑ کی رشوت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کام میں کئی افسروں اور انسپکٹروں نے بھی میری کارروائی کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔

تعمیری کام بھی بہت ہوئے۔ کئی نئے ڈاکخانے بنوائے اور کئی ڈاکخانوں کی تجدید کاری کی۔ جن لوگوں نے ان ڈاکخانوں کو پہلے کبھی دیکھا تھا وہ یقین ہی نہیں کر پاتے تھے کہ یہ وہی ڈاکخانے ہیں۔ اس کام میں میری مدد پی اینڈ ٹی سِول وِنگ کے ایک ہریانوی اسسٹنٹ انجینئر مسٹر نارانے کی۔ بڑی تندہی سے کام کرتا تھا اور مردہ عمارت میں جان ڈالنے کی قابلیت رکھتا تھا۔ سب سے بڑی حصولیابی نانپورہ صدر ڈاک خانے کی تھی۔ اس ڈاک خانے کا سنگ بنیاد سورت سے چنے گئے بی جے پی کے منسٹر کاشی رام رانا نے قریباً بارہ سال پہلے رکھا تھا مگر تختی وہاں پر لٹکتی رہ گئی۔ اس میں ناروے کی ارثی عمارت کا ٹنٹا تھا کہ وہاں کسی زمانے میں بیکری ہوا کرتی تھی جس کو ناروے کی ایمبیسی اب ہیری ٹیج بلڈنگ بنانا چاہتے تھے۔ میں نے کیس کی بہت پیروی کی مگر وہ ماننے کو تیار نہ تھے۔ پھر ایک راستہ یہ نکالا کہ اس بلڈنگ کو چھوڑ کر باقی ماندہ زمین پر چھ منزلوں والی عمارت کا نقشہ بنوایا اور اس وقت کے ممبر سے پاس کروایا۔ ایک سال میں بلڈنگ تیار ہوگئی اور نانپورا ڈاکخانہ وہاں کام کرنے لگا۔ سورت میں جہاں زمین کا ٹکڑا ملنا بھی مشکل ہے اس ڈاکخانے کی تعمیر کروانا بہت بڑا کام تھا۔ اسی طرح سبحان پورہ، وڈودرا ڈاکخانے کی تعمیر کروانے کے لیے وہاں کا ایک سوشل ورکر جشو بھائی پٹیل سالہا سال سے ہمارے دفتر چلا آتا تھا۔ وہاں بھی ایک ہی سال میں پوسٹ آفس بنا کر دیا جس کے لیے وہ کئی بار شکریہ کرنے کے لیے چلا آیا۔ پٹیل میرے اچھے دوست بن گئے۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ وہ میرے کسی کام آسکتے ہیں۔ ہوا یوں کہ بڑے بیٹے کو ایم ایس یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم کی سیٹ مطلوب تھی۔ جشو بھائی سے یوں ہی تذکرہ ہوا، دوسرے روز بیٹے کو لے کر وائس چانسلر کے پاس چلے گئے اور ان کے لیے سیٹ مختص کروالی۔ حالانکہ میرے بیٹے کا میرٹ بہت اچھا تھا اور وہ سپورٹس اور دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا مگر داخلے کے بارے میں کیا معلوم، کیا ہوگا۔ اس لیے میں کوئی جوکھم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

جن دنوں میں وڈودرا میں تھا، نریندر مودی گجرات کے چیف منسٹر تھے۔ انھوں نے بیوہ عورتوں

کو پنشن بانٹنے کی سکیم ڈاک خانے کے حوالے کر دی۔ اس پھیر بدل سے دو بڑے کام ہو گئے۔ ایک یہ کہ جعلساز عورتوں اور ان کے دلالوں کی نشاندہی ہو گئی اور سارے جعلی اکاونٹ بند ہو گئے۔ سالہا سال سے ان ناموں پر منی آرڈر بھیجے جاتے تھے جو راستے ہی میں غائب ہو جاتے تھے کیونکہ ان ناموں سے کوئی عورت تھی ہی نہیں اور اگر ماضی میں تھی بھی تو کہیں مر کھپ گئی تھی۔ یہ سارا روپیہ سیاست دان اپنے چیلے چپاٹوں سے خرد برد کروا کے بٹور لیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سکیم پر اخراجات میں بہت کٹوتی ہوئی۔ گجرات گورنمنٹ اب ہر مہینے صرف ایک چیک ڈاک خانے کے نام ایشو کرتی تھی اور ساتھ میں ان لوگوں کی فہرست دیتی تھی جن کے کھاتے وفات کے باعث بند کرنے مطلوب تھے یا حال ہی میں بیوہ ہونے کے سبب جن کے نئے کھاتے کھولنے مطلوب تھے۔ ڈاک خانے بھی ایک ہی جگہ پر سارا کام نپٹانے لگے اور اپنے ریکارڈ کی تصحیح ماہوار کرتے رہے۔ اس طرح ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ بیواؤں کو پنشن بانٹے جانے لگے۔ یہ سکیم بہت ہی کامیاب رہی۔ مذکورہ سکیم کی کامیابی کی خبر سن کر گجرات بجلی بورڈ نے بھی ہم سے رجوع کیا اور ڈاک خانہ جات کی نیٹ ورک کا فائدہ اٹھا کر گجرات بجلی بورڈ کی بلوں کو ڈاک خانوں میں جمع کرانے کے احکامات جاری کیے۔ نتیجے میں گجرات بجلی بورڈ نے سستے داموں محکمہ ڈاک کی خدمات کا فائدہ اٹھایا اور اس کام میں تعینات لوگوں کو دوسرے کاموں میں لگا کر لاکھوں کی بچت کی۔ یہ کامیابی اس ماحول کا نتیجہ تھی جسے ریاستی حکومت نے گجرات میں پیدا کرنے میں پہل کی تھی۔

ایک چیز جس کے بارے میں مجھے دُکھ ہوا وہ یہ کہ گجرات میں تعلیم کی جانب زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مہاراجہ سایاجی راؤ یونیورسٹی، بروڈہ ملک بھر کی شان تھی۔ یہاں کا فیکلٹی آف آرٹ دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ مگر آج اس یونیورسٹی کی حالت خستہ ہے، عمارتوں کی دیکھ بھال نہیں ہو رہی ہے اور یونیورسٹی میں وائس چانسلر سے لے کر اساتذہ تک کا سٹینڈارڈ ابتر ہو چکا ہے۔ گجراتی تو زیادہ تر پیسہ کمانے میں لگے ہوئے ہیں، انھیں ان چیزوں کی طرف کوئی دھیان نہیں جاتا۔ ان کے لیے فیکٹری کھولنا تعلیمی ادارہ کھولنے سے کہیں زیادہ فائدہ مند ہے۔ اگر گجرات گورنمنٹ چاہتی تو وڈودرا کو تعلیمی شہر بنا سکتی تھی جہاں ہر طرح کے سکول ہوتے، پیشہ ورانہ کالج ہوتے اور اعلیٰ ترین یونیورسٹیاں ہوتیں۔

گجرات میں میرے قیام کے دوران دو سانحے پیش آئے۔ ایک تو گودھرا کانڈ اور اس کے بعد

کے فرقہ وارانہ فسادات جنھوں نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوا یا پھر جو کچھ سننے میں آیا اس کے سبب میں اپنا سارا دکھ درد بھول گیا۔ میں دہشت گردی کا شکار ہو کر کشمیر سے یہاں چلا آیا تھا اور یہاں اس کا الٹ دیکھنے کو ملا۔ وہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور یہاں ہندو۔ دونوں جگہ انسان کا بہیمی روپ دیکھنے کو ملا۔ ان دنوں ایودھیا کے رام مندر کا تنازعہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا اور بابری مسجد گرانے کی سازش رچائی جا رہی تھی۔ بابری مسجد گرا کر کارسیوک واپس آ رہے تھے کہ گودھرا، گجرات کے پاس اس ریل گاڑی کے ڈبّے میں آگ لگا دی گئی جس میں کارسیوک سفر کر رہے تھے۔ آگ کس نے لگائی اس بارے میں جتنے منہ اتنی باتیں۔ اسی کے ردِ عمل میں سارے گجرات میں فسادات رونما ہوئے۔ راتوں رات گجرات کے کونے کونے میں خصوصاً وڈودرا اور احمد آباد میں مظاہرے شروع ہوئے اور مسلمان بستیوں پر حملے کیے گئے۔ میں جس جگہ رہتا تھا وہاں پر ایک پروفیسر صاحب بھی رہتے تھے، بے چارے بال بال بچ گئے۔ کچھ مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہمارے دو دفتر تھے، ایک، آر ایم ایس کا اور دوسرا، پی اینڈ ٹی ڈسپینسری کا۔ یہ علاقہ بہت ہی نازک تھا، ماضی میں ایک دو ملازموں کا قتل ہوا تھا، اس لیے ملازمین وہاں جانے سے گھبرا رہے تھے۔ پرانے وڈودرا شہر میں، جہاں وڈودرا صدر ڈاکخانہ واقع تھا، مسلمانوں کی آبادی میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ قتل و غارت اور آگ زنی کی وارداتیں معمول بن گئیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بدنام ’وڈودرا بیکری کیس‘ پیش آیا۔ حالات سے نپٹنے کے لیے میں نے دونوں دفتروں کو وہاں سے شفٹ کر لیا۔ آر ایم ایس آفس کو ریلوے سٹیشن پر ایڈجسٹ کر لیا اور ڈسپنسری کو صدر ڈاک خانے میں۔ حیرانی کی بات یہ ہوئی کہ ایس ایس پی کا دفتر بھی، جو نزدیک ہی کرایہ کے مکان میں کام کر رہا تھا اور مکان مالک نے اس کو خالی کرنے کا نوٹس دیا تھا، وڈودرا ہیڈ آفس میں منتقل کر دیا گیا۔ کہاں تو ہیڈ آفس کے ملازمین میرے آنے سے پہلے وڈودرا ہیڈ آفس میں جگہ کی قلت کی دہائیاں دیتے تھے اور کہاں اس جگہ میں تھوڑی بہت ردوبدل کر کے اور سامان و ریکارڈ کے لیے چھت پر دو عارضی شیڈ بنوا کے وہاں دو اور دفتر ایڈجسٹ ہو گئے۔ اس کے علاوہ تینوں انتقال شدہ دفتروں کا لاکھوں کا کرایہ بچ گیا۔

گجرات کے فسادات انسانیت کے ماتھے پر کلنک ہیں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر سوال

یہ اٹھتا ہے کہ کشمیر کے ہندوؤں اور دہلی کے سکھوں پر کیے گئے مظالم کو کیا نام دیا جائے؟ کیا وہ انسانیت کُش فعل نہیں تھے؟ چند سیاسی پارٹیاں گجرات کے دنگوں کو اچھالتی رہیں جبکہ مخالف پارٹیاں دہلی اور کشمیر کے فرقہ وارانہ فسادات کا رونا روتی رہیں۔ کوئی پارٹی خود کو سیکولر کہہ رہی ہے اور کوئی قوم پرست۔ سچ تو یہ ہے اقتدار کی ہوس میں دونوں نے انسانیت کا خون کیا ہے۔ گجرات کے دل دہلانے والے مناظر دیکھ کر میں اپنا اور اپنی برادری کا غم بھول گیا۔

دوسرا سانحہ ۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء کو پیش آیا۔ صبح سویرے جب ساری قوم یوم جمہوریہ منانے کی تیاری کر رہی تھی گجرات کی عمارتیں جھولے کی مانند جھونٹے لینے لگیں۔ اِدھر زمین کانپ اٹھی، اُدھر لوگ گھروں سے باہر آ کر ہاہاکار مچانے لگے۔ میرا گھر چونکہ یک منزلہ تھا اس لیے جھٹکوں کی شدت کا زیادہ احساس نہ ہوا۔ دھیرے دھیرے تباہی کی خبریں ہر طرف سے آنے لگیں۔ سب سے زیادہ اثر بُجھ (ضلع کچھ)، راجکوٹ اور احمد آباد میں ہوا۔ کئی جانیں تلف ہوئیں اور بہت ساری کثیر منزلہ عمارتیں تاش کے پتوں کی طرح گر گئیں۔ راجکوٹ ریجن میں، جس کے تحت کچھ ڈویژن آتا تھا، زلزے نے قیامت برپا کی تھی۔ وہاں پوسٹ ماسٹر جنرل اور ڈائریکٹر دونوں خواتین تھیں۔ بُجھ کے ملازمین کے بارے میں کچھ خبر نہیں مل رہی تھی۔ میں نے وڈودرا کے ڈائریکٹر کرنل چوہان، جو آرمی پوسٹل سروس میں رہ چکا تھا، کے ساتھ دو ڈاک گاڑیوں میں کھانے پینے کا سامان اور دوائیاں لاد کر بھیج دیں۔ بُجھ میں سب سے پہلی ریلیف گاڑیاں ہماری پہنچ گئیں۔ شکر اس بات کا تھا کہ پوسٹ آفس کے لوگ سب صحیح سلامت تھے اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ البتہ ڈاک خانے کی عمارتوں میں دراڑیں پڑ گئیں تھیں حالانکہ دوسری عمارتوں کی نسبت ان کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں ڈاک کا نظام بحال کیا گیا اور بعد میں عمارتوں کی مرمت بھی تیزی سے کروائی گئی۔ سب سے اہم بات یہ دیکھنے کو ملی کہ گجرات کے سبھی چھوٹے بڑے صنعت کار متاثرہ لوگوں کی امداد کے لیے آگے آئے اور چند ہی روز میں عارضی شیلٹر کھڑے کر دیے گئے تاکہ لوگ کم سے کم ان میں حفاظت سے رہ سکیں۔ سرکار نے بھی متاثرہ لوگوں کو بحال کرنے کے لیے فوری کارروائی کی۔ اس ایریا کی باز آبادکاری میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ بہر حال گجرات کی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا سانحہ مانا جاتا ہے۔

وڈودرا میں تقرری کے دوران ایک کرشمہ ہوا۔ ڈاک محکمے کی ہدایات کے مطابق جو مالک یا پبلشر رعایتی محصول پر اپنے اخبارات یا میگزین ارسال کرنا چاہتے تھے انھیں پی ایم جی سے تحریری اجازت نامہ لینا پڑتا تھا۔ ایک روز میں فائل پر دستخط کر رہا تھا کہ میری نظر ایک گجراتی میگزین پر پڑی جس پر دل کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اندر بھی قلب سے متعلق کئی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مجھے گجراتی زبان کا علم نہ تھا اس لیے ایک انسپکٹر کو بلوایا جس نے بتایا کہ یہ ایک آیورویدک ویدجی کا میگزین ہے۔ اس سے رابطہ قائم کیا گیا اور اپوائنٹمنٹ لی گئی۔ اسی بیاسی سال کا تندرست وید تھا جس نے معائنہ کرلیا اور عارضے سے چھٹکارا پانے کے لیے تین مہینے کی مہلت مانگی۔ ان کی دی ہوئی دوائیاں جن میں کچھ ڈابر اور بیدناتھ کی بنائی ہوئی تھیں اور کچھ خود ویدجی کے کاریالیہ کی تیار شدہ تھیں، بہت ہی کارگر ثابت ہوئیں اور تین مہینے کے بعد کافی افاقہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد گوا تبادلہ ہوا اور وہاں کے ہارٹ سپیشلسٹ نے اس کی تصدیق کی۔ اس کے علاوہ ویدجی نے میرے بیٹے کی کلسٹر مائیگرین کو بھی آیورویدک دوائیوں سے ٹھیک کرلیا۔ جب ان سے اس بارے میں بات ہوئی تو انھوں نے تین پوڑیاں بنا کر دیں اور کہا کہ صبح سورج چڑھنے سے پہلے ایک پوڑی کھلا دیں اور اس کے بعد سورج ڈھلنے تک نیند نہیں کرنے دیں۔ میں سائنس کا آدمی، حیران کہ بھلا دوائی اور سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا کیا باہمی کنکشن، بیٹے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا اور دونوں ہنس دیے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا، تین روز لگاتار اس کو دوائی دیتا رہا اور دن بھر سونے نہ دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، اسے پھر کبھی سر درد کی شکایت نہ ہوئی۔ آیوروید کے ساتھ میرے کئی تجربے رہے اور بہت کامیاب رہے۔ مگر سرکاری انتظامیہ نے اس طریقۂ طب میں تباہی مچا کر رکھ دی ہے۔ یونیورسل سرٹیفکیشن کا کوئی سسٹم رائج نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ کون سا وید مستند ہے اور کون سا جعلی۔ کالج سے ڈگری پائے ہوئے وید اتنے کامیاب نہیں ہیں جتنے وہ جن کو موروثی طور پر یہ علم حاصل ہوا ہے۔ یہی حال یونانی اور دوسرے طریقۂ طب کا بھی ہے کہ کہیں کسی کے پاس ڈگری نہیں ہے اور یہ نہیں معلوم کہ کون جعلی ہے اور کون اصلی۔ اس حوالے سے جہاں تک مجھے یاد ہے ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے پراپرائٹر کا انٹرویو چھپا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ انگریزوں کی سازش تھی کہ اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی دوائیاں بیچنے کے لیے برصغیر سے یونانی طب کا خاتمہ کر دیا۔

میگزینوں کی پوسٹل رجسٹریشن کے سلسلے میں ایک اور واقع پیش آیا۔ ڈائریکٹوریٹ کی ہدایت کے مطابق میں صرف ان رسالوں یا اخباروں کو رجسٹریشن کی اجازت دے سکتا تھا جن میں زیادہ تر دیش ودیش کی خبریں ہوں۔ مذہبی رسالے تو اس زمرے میں نہیں آتے ہیں۔ میرے دفتر میں ڈائریکٹر منجو کمار تھیں، وہ مجھے کہنے لگی کہ جب آندھرا کے چیف پی ایم جی ان کی رجسٹریشن کی اجازت دے دیتے ہیں تو آپ کیوں نہیں دیتے۔ میں اس کو اپنے ساتھ آر ایم ایس دفتر لے گیا جہاں تین میگزین اس کے سامنے رکھ دیے۔ ایک ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانا چاہتا تھا، دوسرا محمود غزنوی کو غازی کہہ کر اسلام کی تبلیغ میں لگا ہوا تھا اور تیسرا پنجابی میں دشمیش ادارے کا ماؤتھ پیس تھا جس میں خالصتان بنانے کی باتیں لکھی ہوئیں تھیں۔

اس کے بعد میں نے کہا، ”منجو جی، ہمارا محکمہ اتنا بے وقوف محکمہ ہے کہ ان سرکش علیحدگی پسند رسالوں کو پندرہ پیسے میں سارے ملک میں ان لوگوں تک پہنچاتے ہیں جو ان رسالوں کے نشانے پر ہوتے ہیں۔ قوم کے ساتھ اس سے بڑا دھوکہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ چپ ہو گئیں۔ کچھ ہی دنوں بعد میرے کمرے میں ایک شخص چل آیا۔ سامنے منجو کمار بیٹھی تھیں۔ وہ کہنے لگا۔ ”سر ہمارے سوامی نرائن کے بڑے سوامی جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں، آجائیں، خوشی سے۔“ وہ کچھ رک سا گیا اور پھر منجو کمار کی جانب دیکھ کر بولا۔ ”سر سوامی جی کسی عورت کی بغل میں نہیں بیٹھتے ہیں۔ یہاں پر میڈم جو بیٹھی ہیں۔“ میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھ لیا اور گویا ہوا۔ ”جناب، یہ عورت نہیں، محکمے کی افسر ہیں۔ کل میری جگہ بیٹھی ہوں گی، اس وقت سوامی جی کن سے ملیں گے۔ اگر انھیں اعتراض ہے تو پی کے کمرے میں بیٹھ جائیں اور آپ مجھے اپنا کیس بتا دیں۔“ منجو کمار نے اٹھنا چاہا مگر میں نے اس کو روک لیا اور بعد میں بتایا کہ میں عورت کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا، وہ چاہے کوئی بھی ہو۔ سوامی جی کے نمائندے نے کہا کہ ان کے میگزین کو رعایتی دروں پر ڈاک میں پوسٹ کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔ اس پر نظر ثانی کی جائے۔ میں نے فائل منگوا کر ان کو اس بارے میں رولنگ پڑھوائی اور ساتھ ہی کہا کہ سوامی نرائن مندر میں ہر روز ہزاروں روپے کے لڈو بطور پرساد بانٹے جاتے ہیں مگر پوسٹ آفس کو ایک دو ہزار مہینے کا محصول دینے سے کترا رہے ہیں۔“ بات آئی گئی ہوئی۔ بی جے پی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اور سائیں بابا سنستھا والوں نے کئی بار ڈائریکٹوریٹ میں زور مارا اور ان رولز کو بدلوانے کی کوشش کی۔ کچھ حد تک کامیاب بھی

ہوئے۔ مجھے دُکھ اس بات کا ہو رہا ہے کہ اس دور میں جب ریڈیو، ٹی وی ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ گیا ہے، ان اخباروں اور میگزینوں کو سبسڈی دینے کا کیا جواز ہے۔ یہ سبسڈی تو انگریزوں نے تعلیم کو فروغ دینے کے لیے انیسویں صدی میں شروع کی تھی، اب تو ہم اکیسویں صدی میں پہنچ گئے ہیں، پھر یہ سب چونچلے کس کام کے۔ مگر کس کو سنائیں اور کون سنے گا، سب لکیر کے فقیر ہیں، سیاست دان بھی اور افسر شاہی بھی۔

۱۵؍فروری کو میرا جنم دن ہوتا ہے اور ۱۴؍فروری کو ویلنٹائن ڈے منایا جاتا ہے۔ میرے دفتر کی ایک پوسٹل کلرک ویلنٹائن ڈے کے روز میرے دفتر میں داخل ہوئی، ہاتھ میں ایک خوبصورت گلاب کی کلی تھی جو اس نے مجھے یہ کہہ کر پیش کر لی۔ ’’سر ہیپی برتھ ڈے!‘‘ میں حیران و پریشان کہ آج تو میری یوم ولادت نہیں ہے۔ اس لیے جواب دیا۔ ’’آج تو سینٹ ویلنٹین کا جنم دن ہے، میرا تو کل ہے۔‘‘ وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ’’سر میں نے تو اسی مناسبت سے آپ کا جنم دن یاد رکھا ہے۔ غلطی ہوگئی سر۔‘‘ پھر وہ مسکراتی اور خوشبوئیں بکھیرتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے ساتھ دوستی اب تک جاری ہے اور وہ میرا جنم دن اب بھی نہیں بھولتی۔

☆☆☆

پرتگالیوں کی آخری گڑھی

گوا کی سال بھر کی پوسٹنگ ایک نیا اور سہانا تجربہ رہا۔ بالکل ایک نئی تہذیب سے تعارف ہوا۔ وہاں کے لوگ بہت اچھے، مخلص اور دوست پرور ہیں۔ میرے تحت کونکن مہاراشٹر کے کئی علاقے بھی تھے جیسے سانگلی، رتنا گری، اِچھال کرنجی، کولہاپور وغیرہ۔ گوا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندو راجاؤں کے بعد یہ علاقہ بہمنی سلطانوں کے قبضے میں آیا تھا۔ پھر ۱۵۱۰ء میں اس کو ایک پرتگالی، الفانسو دی البوقرق نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی یہ علاقہ پرتگالیوں کے قبضے ہی میں رہا گو آزادی کی لڑائی یہاں بدستور جاری رہی۔ ۱۹؍دسمبر ۱۹۶۱ء کو ہندوستانی فوج کی مداخلت کے بعد گوا، دمن، دیو، دادرا اور ناگر حویلی آزاد ہو کر ہندوستان کا حصہ بن گئے۔ گوا میں ۱۰۳؍کلو میٹر لمبا ساحلِ سمندر ہے جس پر آتے جاتے سمندری جہاز بہت خوش نما لگتے ہیں۔ یہاں کے کئی ساحل جیسے منڈریم، باغا، کنڈولیم، کیولوسم وغیرہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ گوا کا مرکز پنجم ہے اور کلنگوٹ، واسکو ڈی گاما، مڑگاوں اور کانکونا نزدیک ہی خوبصورت مقامات ہیں۔ چہار سو ہریالی، کشادہ آئینہ سی سڑکیں اور صاف ستھری عمارتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پرتگالیوں کے بنائے ہوئے قلعے اور بڑے بڑے چرچ جیسے مے دی ڈیوز چرچ سالیگاؤں، سی کیتھیڈرل پرانا گوا، بیسیلکا آف بوم جیسز اور سینٹ فرانسس آف آسیسی کا چرچ گوا کے عالیشان ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ پرتگالی کلچر کا اثر اب بھی اتنا گہرا ہے کہ ہر سال کارنیوال میں لوگ خوشیوں سے جھومتے ہیں اور از خود اپنے مکانوں کو باہر سے رنگ روغن چڑھاتے ہیں۔ کرسمس اور نئے سال کی تو پوچھیے ہی مت۔ ان دنوں تو یہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ یوں بھی گوا سیاحت کے لیے بہت مشہور ہے۔ سیاح یہاں پر چھٹیاں منانے کے لیے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ یہاں کے بیشتر لوگوں کی زبان کونکنی ہے لیکن مراٹھی بولنے والے بھی بہت ملتے ہیں۔ زبان کے مسئلے کے سبب یہاں ڈاکخانے میں پوسٹل اسسٹنٹوں کی بھرتی میں

بہت پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔

گوا کے ساتھ ہی آزاد ہوئے علاقے دمن، دیو، دادرا اور ناگر حویلی گوا کے ساتھ نہیں جڑے ہیں بلکہ سوراشٹر گجرات کے ساتھ ملحق ہیں۔ وہاں کا کلچر بھی گوا سے ملتا جلتا ہے۔ میں جن دنوں وڑودرا میں پوسٹ ماسٹر جنرل تھا اور کبھی کبھی راجکوٹ کا بھی چارج لینا پڑتا تھا، ان سبھی جگہوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ساتھ میں دوارِکا اور سارناتھ کے تاریخی منادر بھی دیکھ لیے۔ سارناتھ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں محمود غزنوی نے سترہ بار چڑھائی کی تھی اور مندر کو مسمار کیا تھا۔ اس کے کھنڈرات زیرِ آب ہیں۔ آج وہاں جو مندر کھڑا ہے وہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی محنتوں کا ثمر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کرشن کی سلطنت، دوارِکا شہر گجرات کا پہلا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔ دوارکا دھیش مندر کی تعمیر ۲۵۰۰ر سال پہلے ہوئی تھی لیکن محمود بیگڑا و دیگر سلطانوں نے اس کو تباہ کر دیا البتہ سولہویں صدی میں اس کی از سرِ نو تعمیر کی گئی۔ اس کا بیشتر حصہ سطح سمندر کے نیچے ہے۔ دوارکا چار دھام میں سے ایک مانا جاتا ہے اور اس کا شمار سپت پوری یعنی سات قدیم ہندو شہروں میں کیا جاتا ہے۔ اس علاقے میں بہت سارے مندر ہیں جو کرشن اور اس کی چہیتی گوپیوں سے منسوب ہیں۔ آدی شنکر آچاریہ کی ایک پیٹھ بھی یہاں پر واقع ہے۔ اس جزیرہ تک پہنچنے کے لیے ناؤ سے جانا پڑتا ہے۔ آتے جاتے سمندری جہازوں کی رہنمائی کے لیے دوارکا میں مینارۂ نور بھی ہے۔

ذاتی طور پر مجھے گوا بہت اچھا لگا۔ انسپکشن کوارٹر میں اکیلے رہتا تھا، اپنی صحت کے مطابق ڈھنگ کا کھانا تناول کرتا تھا اور صبح سویرے پانچ کلومیٹر کی سیر کرتا تھا۔ امراض قلب کا قابل ترین ماہر ملا تھا جو میری صحت کی اچھی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے وڈودرا میں آیورویدک دوائیاں استعمال کی تھیں جن کے سبب مرض میں کافی افاقہ ہوا تھا۔ اس بات کی تصدیق ان ٹیسٹوں سے ہوئی جو یہاں پر کرائے گئے اور جن کی رپورٹیں مل چکی تھیں۔ ڈاکٹر بھی میرے قلب کی حالت سے مطمئن نظر آتا تھا۔ بال بچے بھی گاہے بگاہے چند روز کے لیے چلے آتے اور موج مستی کر کے اپنے اپنے ٹھکانوں کو روانہ ہو جاتے۔ جی چاہتا تھا کہ کاش یہاں پر اپنا گھر ہو اور باقی عمر یہیں کٹے مگر یہ ممکن نہ تھا۔ کرسمس و نئے سال کے دورانیے میں مجھے اپنے بڑے بیٹے کے پاس وڈودرا جانا پڑا جہاں وہ یونیورسٹی میں طالب علم تھا۔ میرے دفتر کے ملازمین یہ سن کر حیران ہو گئے۔ کہنے لگے لوگ ان دنوں دوسری جگہوں سے گوا چلے آتے ہیں اور

آپ ہیں کہ گوا چھوڑ کر وڈودرا جا رہے ہیں۔ انسان کی مجبوریاں!

گوا میں چونکہ میں بہت کم وقت رہا اس لیے صرف موپاسا ڈاکخانے کی تجدید کاری کرا سکا یہاں تک کہ اس کی شکل و صورت ہی بدل گئی۔ جی تو کرتا تھا کہ گوا ہیڈ پوسٹ آفس کی تجدید کاری بھی کروں اور اس کو ماحول کے مطابق ایسا خوبصورت بنالوں کہ گوا کی جنتا یاد رکھے، مگر میرے پاس وقت نہیں تھا۔ صرف ایک ہی سال کا ٹینیوٗر تھا۔ یہاں ریاستی سرکار کی طرف سے ایک بڑا پلاٹ دیا گیا تھا مگر اس پر عمارت بنانے میں مقامی افسروں نے ذاتی مفاد کے لیے لیت و لعل سے کام لیا۔ اس عمارت میں گوا کے کئی دفتر سما جاتے اور سب سے بڑی بات کہ گوا میں محکمے کے افسروں اور ملازمین کے لیے بہت اچھا گیسٹ ہاؤس اور ہولی ڈے ہوم بن جاتا۔ ریاست کے جس محکمے نے یہ پلاٹ دیا تھا اس نے پلاٹ کو واپس لے لیا اس لیے مجھے اس کارروائی کو روکنے کے لیے کافی لڑائی لڑنا پڑی۔ اس وقت وہاں کے چیف منسٹر منوہر پارِکر تھے ان کو بھی درخواست کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس پلاٹ کا کیا حشر ہوا مجھے نہیں معلوم۔

ایک واقعہ، جو ان دنوں پیش آیا اور جس نے میرے دل کو رنجور کر دیا، ذات پات سے متعلق تھا۔ مہاراشٹر کے ایک ہیڈ پوسٹ آفس میں درجہ فہرست ذات کا پوسٹ ماسٹر تھا جو ریزرویشن کے باعث اس پوسٹ پر دوسروں کے مقابلے میں جلدی پہنچ گیا تھا۔ ڈویژن ایک جنرل درجے کے گروپ بی افسر کے تحت تھا جو اس سے خار کھاتا تھا۔ نتیجے میں اس کو سپرانٹینڈنٹ نے کسی کیس میں پھنسا کر معطل کر دیا اور بہت دنوں سے لٹکا کر رکھ دیا۔ پوسٹ ماسٹر کچھ حد تک ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ مجھے جموں ڈویژن کے سائیں داس کی یاد آ گئی۔ پوسٹ ماسٹر شیڈیول کاسٹ کمشنر کو چٹھیوں پر چٹھیاں لکھتا رہتا تھا۔ جب میں نے اس ڈویژن کا دورہ کیا تو اس کو بلا کر اس کی پرابلم سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک دو مہینے کی مہلت مانگی تاکہ اس کو انصاف دلا سکوں۔ جاتے ہی میں نے اس کے معطلی آرڈر کو رد کروا دیا اور اس کے کیس کو جلد از جلد ختم کرنے کا حکم دیا۔ مگر وہ اتنا دل شکستہ ہو چکا تھا کہ اتنی بھی مہلت نہ دی۔ کچھ عرصے بعد مجھے خبر ملی کہ اس نے خودکشی کر لی ہے اور پولیس صدر ڈاکخانے میں واقع اس کے گھر پر تفتیش کرنے آئی ہے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا جہاں ایک درجہ فہرست ذات کے ملازم نے اپنے ذہنی انتشار کا مظاہرہ کر کے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے ہوئے واقعے کا ذکر تو کر چکا ہوں۔

☆☆☆

مُراجعت ارض چمن سے

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اِک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

اپریل ۲۰۰۵ء میں میری ترقی بحیثیت چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے ہوئی اور ساتھ ہی جموں و کشمیر سرکل میں پھر سے پوسٹنگ ہوگئی۔ اس بار یہاں مارچ ۲۰۰۹ء تک چار سال گزارنے کا موقع ملا۔ وہ جگہ جہاں میری پیدائش ہوئی تھی، پلا بڑھا تھا، سکول، کالج اور یونیورسٹی گیا تھا اب میرے لیے شہر ممنوعہ بن چکا تھا۔ فی الحقیقت سیکورٹی کے سائے تلے قیدیوں کی طرح جینا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ ایک پیارے دوست، پروفیسر فرید پربتی (مرحوم) کے اصرار پر نہ صرف کئی بار یونیورسٹی چلا گیا بلکہ مغل باغات کی سیر بھی کی۔ کچھ مدت سے ظاہراً کشمیر کے حالات سدھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور سیاحوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ سیاح بے روک ٹوک سرینگر اور دوسرے صحت افزا مقامات دیکھنے چلے آتے تھے اور مزے کر کے لوٹ جاتے۔ لیکن ۲۰۰۸ء میں جب ریاستی سرکار نے زائرین کی سہولت کی خاطر شری امرناتھ شرائن بورڈ کو ۹۹ر ایکڑ زمین ٹرانسفر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو شورش برپا ہوگئی۔ احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا اور سرکار کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ حالات اتنے بگڑ گئے کہ پھر کبھی سدھر نہیں پائے۔

امرناتھ ایجی ٹیشن کے شور وغل کے درمیان اپنی رہائش میں مجھے ایک رات چھاتی میں شدید درد کا احساس ہوا، میرے پاس دوائی ختم ہو چکی تھی، اس لیے میں نے کیئر ٹیکر کو بلوا کر دوسرے کسی ملازم سے دوائی لینے کے لیے بھیجا۔ اس دوران میں ہال میں چہل قدمی کرتا رہا۔ دوائی کھا کر مجھے قدرے آرام ہو گیا۔ کئی برسوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مجھے ماضی میں کبھی ہارٹ اٹیک آ چکا ہے۔ قریب القیاس ہے کہ

شاید اسی دن آیا ہو۔ اس بار تو ذیابیطس کا مرض بھی لاحق ہوا، دونوں امراض اب میری چتا کے ساتھ ہی خاک ہو جائیں گے۔

ایک بار ایک کشمیری پنڈت عورت، جو سرینگر ہی میں رہتی تھی، اپنی بیٹی کی نوکری کی خاطر میرے انسپکشن کوارٹر میں چلی آئی۔ شاید کسی ملازم نے بہکایا تھا۔ میں نے صاف گوئی سے کام لے کر بتایا کہ بارہویں جماعت میں اس کے نمبرات کو دیکھ کر یہ ممکن نہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ کئی بار چلی آئی اور ایک روز باتوں باتوں میں میرے ساتھ لپٹ گئی۔ آج جب 'می ٹو' کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ خیر ہوئی ورنہ ان عورتوں میں ایک اور نام جڑ جاتا۔ کون یقین کرتا کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی پہل نہیں کی تھی۔

پی ایم جی اور چیف پی ایم جی کے دورانیے میں میں نے کئی ڈاک خانوں کے لیے نئی عمارتیں بنوائیں۔ چند نام جو یاد آ رہے ہیں یوں ہیں: ترکوٹا نگر مع سٹاف کوارٹرس جموں، ڈائریکٹر کی رہائش، بانڈی پورہ، لیہہ مارکیٹ، کرگل وغیرہ۔ غیر مساعد حالات کے باوجود عمارتوں کی تجدید کاری بھی زور و شور سے کی گئی۔ جموں میں سرکل آفس کامپلکس کی بنیاد بھی ڈالی جو کچھ ابتدائی مشکلوں سے گزر کر اب مکمل ہو چکی ہے۔ میری دلی تمنا تھی کہ سرینگر جی پی او کامپلکس کو دوبارہ پرانی شان و شوکت کے ساتھ بحال کر لوں اور وہاں کے ادھورے ڈھانچوں کی توسیع اور تجدید کر کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کر لوں تا کہ یہ کامپلکس کشمیر کی فضا کے ساتھ یک جان ہو جائے مگر ڈائریکٹوریٹ کی سرد مہری کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ بعد میں بحیثیت ممبر پلاننگ میں نے پھر سے اس بارے میں بہت کوشش کی مگر اس وقت جموں و کشمیر کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل نے ذاتی مفاد کے لیے تعاون نہیں کیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس طرح اس کو ایچ آر اے سے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔

کئی بار میں نے کوشش کی کہ ریاست کے چیف منسٹر سے مل لوں کیونکہ ضابطہ یہی کہتا ہے مگر چیف منسٹر صاحب کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ مجھے اس بات کی تمنا تھی کہ جیسے گجرات میں نریندر مودی نے بیواؤں کے پنشن کی تقسیم میں سدھار لایا تھا ویسے ہی جموں و کشمیر میں بھی لاگو ہو اور اگر ہو سکے تو بجلی کا فیس جمع کرنے میں بھی ریاستی بجلی محکمہ ڈاک خانے سے مدد لے۔ مگر نہ چیف منسٹر کو فرصت ملی اور نہ ہی ریاستی

سرکار کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہاں ایک بار یوں ہوا کہ ریاستی سرکار کے ایک نئے صلاح کار نے مجھے محکمے کا سربراہ ہونے کے ناتے اپنے پاس بلایا تاکہ وہ ڈاک خانے کی کارکردگی کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکے اور مجھے اس میں مزید بہتری لانے کے لیے سجھاؤ دے۔ صلاح کار نے ریاست میں بطور آئی اے ایس افسر اپنی پوری زندگی صرف کی تھی۔ جاتے ہی شروع ہو گئے، ڈاک خانے میں سدھار لانے اور ایمانداری سے کام کرنے کے لیے لمبی چوڑی تقریر کی۔ البتہ مجھے اس کی کھوکھلی تقریر ہضم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ انہی سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی ملی بھگت سے جموں و کشمیر کے انتظامیہ میں گھن لگ گئی تھی، صنعت کاری رُک گئی تھی، رشوت خوری، کنبہ پروری، غاصبانہ جاگیرداری، غنڈہ گردی اور بے روزگاری کا غلغلہ تھا، جنگل گنجے ہو چکے تھے اور ماحولیاتی انحطاط وقوع پذیر ہوا تھا۔ جی میں آئی کہ کھری کھری سناؤں مگر پیشہ ورانہ آداب نے روک لیا۔ ہوں ہاں کر کے اس سے رخصت لی۔

اسی بات پر مجھے ایک اور قصہ یاد آ گیا۔ ہمارے سیکریٹری صاحب، یو ایس پرساد، ٹیلی کمیونکیشنز منسٹر کے ہمراہ جموں آئے۔ لنچ کھانے کے لیے وہ اپنے بیچ میٹ، جو ریاست میں اس وقت ایڈیشنل چیف سیکریٹری تھے، کے گھر گئے۔ سِدرا میں ان کی کوٹھی کے خوبصورت باغ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، بہت تعریف کر لی اور پوچھ لیا۔ ”کتنی زمین ہو گی یہ؟“ جواب ملا۔ ”دراصل، جب یہ پلاٹ گورنمنٹ کی طرف سے الاٹ ہوا تھا تو آدھے کنال کا تھا لیکن بعد میں اس کے ساتھ شاملات (خالصہ زمین جو گورنمنٹ کی ہوتی ہے) ملائے گئے اور اب یہ دو کنال کا پلاٹ بن چکا ہے۔“ میں اس لیے حیران نہیں ہوا کہ ایک ایڈیشنل چیف سیکریٹری۔ نے سرکاری زمین، جس کا وہ رکھوالا ہونا چاہیے تھا، پر غیر قانونی قبضہ کر لیا تھا بلکہ اس بات پر تعجب ہوا کہ وہ بڑے فخر سے اپنی اس بے ایمانی کا ڈھول پیٹ رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سورگ جیسی ریاست کی بہت ساری زمین سیاست دانوں اور افسروں نے ہڑپ لی ہے اور باقی ماندہ کسر مذہبی ٹرسٹوں اور اب انتہا پسند رہنماؤں نے پوری کر لی ہے۔ روایت یہ بھی رہی ہے کہ جرنلسٹوں کو ایک ایک پلاٹ خیرات میں بانٹ کر ان کے منہ بند کر دیے جاتے ہیں تاکہ وہ حکومتوں کے قصیدے پڑھتے رہیں۔ حیاتیات میں ایسے طفیلی جراثیم (Parastoids) کے بارے میں پڑھا تھا جو اکثر اپنے

میزبان کے لیے مہلک ثابت نہیں ہوتے تا کہ خود ان کو جینے کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اب معاشرے میں بھی ایسے طفیلیوں کی بھرمار ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا رشوت خور افسر بھی کوشش کرتا ہے کہ یہ سسٹم یوں ہی چلتا رہے اور کہیں غبارے کی طرح پھٹ نہ جائے کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ اگر یہ نظام مکمل طور پر ناکام اور ناکارہ ہو گیا تو خود ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اچھا اور سمجھدار طفیلی کرم وہ ہوتا ہے جو اپنے میزبان کو جینے دیتا ہے، اس کا چوب رس اعتدال سے پیتا رہتا ہے اور ’جیو اور جینے دو والا‘ اصول اختیار کرتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ کشمیر میں اتنی دفعہ پوسٹنگ ہونے کے باوجود میں ریاست کے سبھی اہم مقامات کو نہیں دیکھ پایا۔ پہلی مرتبہ سوچتا رہا کہ جلدی بھی کیا ہے، کافی وقت پڑا ہے مگر ایک ڈیڑھ سال ہی میں وہاں سے مجبوراً رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد غیر مساعد حالات اور ملی ٹینسی کے سبب میری نقل و حرکت پر پابندی لگ گئی۔ گھومنے پھرنے کی بجائے میرا سارا وقت اور قوت جموں و کشمیر میں ڈاک کے نظام کو بحال کرنے اور ملازمین کی باز آبادکاری میں صرف ہوتے رہے۔ اتنا ہی نہیں اپنی پوری نوکری کے دوران میں بہت کم چھٹیاں لے سکا۔ میرا ماننا ہے کہ وہ کشمیر جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا واپس ملنا مشکل ہے۔ اب تو وہاں کی زمین میں بارودی سرنگوں کی کاشت ہوتی ہے، فضا میں بارود کی بدبو سرایت کر چکی ہے اور پانی میں تیزاب گھل گیا ہے۔ ریش واری کی شاعری میں اب وہ روحانیت نہیں ہے جو انسان کو اپنے وجود سے ہمکلام کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بقول عمیق حنفی:

؎ میں ہوا ہوں کہاں وطن میرا
دشت میرا نہ یہ چمن میرا

☆☆☆

اوجِ سفرِ حیات

؎ نہ ہوا کے رخ پہ چلے کبھی نہ کسی کی ہم سفری رہی
مگر ابتدا سے نصیب میں جو لکھی تھی در بدری رہی

(والی آسی)

مجھے گماں بھی نہ تھا کہ میں کبھی پوسٹل سروسز بورڈ کا ممبر بن جاؤں گا۔ ڈاک خانے میں ملازمت کے ابتدائی دور میں مجھے کبھی سینیارٹی لسٹ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ نوکری اچھی ملی تھی، کہاں تو ماہانہ ایک سو چالیس کی تنخواہ داری اور کہاں گورنمنٹ کا اتنا بڑا منصب! میں اپنی حصولیابی سے مطمئن تھا۔ دھیرے دھیرے اپنے رفقائے کار سے تعامل کے دوران معلوم ہوا کہ فہرستِ تقدم (Gradation List) کا مطالعہ کرنا ہر اچھے بیوروکریٹ کا فرض ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ آدمی کتنی دور تک جا سکتا ہے۔ اگر بہت آگے جانے کی گنجائش نہ ہو تو کیوں نہ اچھی پوسٹنگ لے کر روپیہ ہی کمایا جائے، پکڑے بھی گئے تو کیا ہوگا، یہی کچھ چارج شیٹ دائر ہوں گے، جرم زیادہ سنگین ہوگا تو پولیس کیس یا پھر سی بی آئی کیس۔ انکوائری کرنے والے بھی کون سے دودھ کے دُھلے ہوتے ہیں۔ کمائی کا تھوڑا سا حصہ ان کے ساتھ بھی بانٹ لیں گے۔ اور پھر اس کے بعد اپیلیٹ اتھارٹی، صدر جمہوریہ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ بھی تو ہے۔ کہیں نہ کہیں چھوٹ ہی جائیں گے لیکن جائیداد تو بال بچوں کے لیے خوب کام آئے گی۔ پھر کسی سیاسی پارٹی کی شرن میں جا کر قوم کی سیوا بھی تو کر سکتے ہیں۔ خیر میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ میری تربیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ایمپوریم میں بہت کوشش کرنے کے باوجود میں رشوت خوری اور بے ایمانی کے ساتھ سمجھوتا نہ کر پایا۔ ڈاک محکمے کی نوکری ملنے کے بعد تو قسم ہی کھائی تھی کہ ان کارستانیوں سے بچ کر رہوں گا اور جس دیش نے اتنا کچھ دیا ہے اس کو کچھ تو لوٹاؤں۔ معلوم ہوا کہ میری

اڑان زیادہ سے زیادہ مجھ کو پوسٹ ماسٹر جنرل کے پوسٹ تک لے جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اے پی ایس میں رہنے کی حتی المقدور کوشش کی کیونکہ وہاں میجر جنرل کا رینک پانے کے امکانات بہت تھے مگر قسمت کو شاید منظور نہ تھا۔ والد کی بے وقت رحلت کے سبب مجھے فوج کو فوراً خیر باد کہنا پڑا اور واپس سِوِل میں جوائن کرنا پڑا۔ اس کے بعد میں پی ایم جی بن کر از خود سبکدوشی کی سوچ رہا تھا کیونکہ میرے سینئر مجھے ترقی سے روکنے کی سبیلیں کر رہے تھے اور آگے گہرا اندھیرا نظر آرہا تھا۔ پی ایم جی کے عہدے پر فائز ہو کر نصیب نے کچھ یاوری کی، ڈیپارٹمنٹ نے اکثر سرکلوں کے سربراہوں کے عہدوں کی ترقی کا اعلان کر دیا اور ان کی جگہ چیف پی ایم جی مقرر کیے۔ اسی وجہ سے کچھ مدت کے بعد میری تقرری بھی چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے پر ہوئی۔ ابھی چار سال کا وقت باقی تھا۔ دو سال بچ گئے تھے کہ بورڈ کے ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی اور میری تقرری بحیثیت ممبر پوسٹل سروسز بورڈ برائے پلاننگ ہوئی۔ کہاں تو سینیارٹی لسٹ پر پی ایم جی (جوائنٹ سیکریٹری، بھارت سرکار) سے آگے بڑھنے کی امید نہ تھی اور کہاں تو میں ممبر پوسٹل بورڈ (ایڈیشنل سیکریٹری، بھارت سرکار) بن گیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔

۹ مارچ ۲۰۰۹ء کو میں نے ممبر پوسٹل سروسز بورڈ (پلاننگ) کا چارج سنبھالا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مجھے پوسٹل لائف انشورنس کا ممبر بنایا جاتا کیونکہ اس ایریا میں نہ صرف میں نے تربیت اور تجربہ حاصل کیا تھا بلکہ دیہی پوسٹل انشورنس سکیم بنا کر محکمے کے لیے پچاس ہزار کروڑ کا مارکیٹ کھول دیا تھا مگر سرکار میں اہلیت کون دیکھتا ہے صرف قربت داری اور اثر ورسوخ کام کرتا ہے۔ بہرحال یہاں میرے پاس ڈاک خانے کے بلڈنگ پروجیکٹ پاس کرنے کا ادھیکار تھا اور میری کوشش یہ رہی کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر بلڈنگ پروجیکٹس پاس کیے جائیں۔ کشمیر کے جی پی او کامپلیکس کے لیے میں نے محکمے کی آرکیٹک سے فوری طور ماسٹر پلان کی نظر ثانی کر کے نیا پلان بنوایا مگر وہاں کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر کامپلیکس میں افسروں کے لیے نئے مکانات بن گئے تو پھر افسر چار ہاؤس رینٹ الاونس کیسے لے پائیں گے۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس نے اس کارروائی کو آگے بڑھنے نہ دیا اور یہ کام آج تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ دراصل یہ پہلی بار نہیں تھی کہ میں نے افسروں کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے ایسے کاموں کو روکتے ہوئے دیکھا تھا، اس سے پہلے بھی ایسا ہی تجربہ گوا کی بلڈنگ

کے بارے میں ہوا تھا جہاں میرے پیش رو نے ریجنل دفتر کی بلڈنگ بننے نہیں دی اور اس زمین پر ریاستی سرکار نے پھر سے قبضہ کرنے کی کوشش کی۔

چونکہ میرا بیٹا اپنی فیملی کے ساتھ دہلی ہی میں رہتا تھا اور نوئیڈا میں نوکری کر رہا تھا اس لیے ممبر ہونے کے باوجود میں اسی کے ساتھ شالیمار گارڈن میں دو کمرے کے خستہ حال فلیٹ میں رہنے لگا۔ یہ مکان اس کی ماں نے ان دنوں خریدا تھا جب میں کشمیر میں تعینات تھا اور وہ مجھ سے الگ رہتی تھی۔ پھر باہمی مفاہمت کے باعث ہم دونوں ایک ساتھ رہنے لگے تھے کیونکہ طلاق کے باوجود وڈودرا میں میرے بڑے بیٹے نے ہمیں پھر سے ملانے کی کوشش کی تھی تاہم رشتوں میں اب وہ گرمی نہیں رہی تھی۔

بہرحال میرا ریٹائرمنٹ فروری ۲۰۱۰ء میں ہوا۔ جاتے جاتے ایک خوش خبری مل گئی۔ انڈیا انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی نے مجھے راشٹریہ گورو ایوارڈ فار میریٹوریس سروس، اوٹ سٹینڈنگ پرفارمنس اینڈ رمارکیبل ورک کا حق دار قرار دیا اور یہ ایوارڈ مجھے ۵؍مارچ ۲۰۱۰ء کو ڈاکٹر بھیشم نارائن سنگھ، سابقہ گورنر تامل ناڈو اور آسام کے مبارک ہاتھوں سے ملا۔ بقول کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ:

؎ ہم خطاوار ہی ہیں یہ تو بجا ہے لیکن
کام دنیا میں کچھ اچھے بھی کیے ہیں یارب

☆☆☆

سفر ابھی جاری ہے

ملک کو دیکھتا ہوں اور زمین کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن، خانہ بدوشِ رہ گزر ہو کر

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

ابھی زندگی کا سفر جاری ہے۔ آٹھ سال ہو گئے ریٹائر ہوئے۔ سوچتا ہوں کچھ کام کروں۔ چھوٹی موٹی نوکری تو کرنے سے رہا۔ سیاست دانوں اور افسر شاہی سے تو ہمیشہ دور بھاگتا رہا پھر وہ کیوں کر مجھے کسی پوسٹ ریٹائرمنٹ جاب سے نوازیں گے۔ پنشن کی رقم اپنے لیے کافی ہے۔ ہاں دواؤں کے سہارے اب تک سانسیں چل رہی ہیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں متوسط درجے کا آدمی ہوتا اور اس قدر حساس نہ ہوتا تو ان کی طرح ہی ہنستا کھیلتا، اٹھتا بیٹھتا، ٹی وی سیریل دیکھتا، دوست احباب کے ساتھ گھنٹوں بتیاتا اور ہر نئے موضوع جیسے لڑکیوں کو جینز پہن کر نکلنا چاہیے یا نہیں، یوگا کی تشہیر ہندوتوا کو بڑھاوا دینا ہے یا نہیں، کشمیری پنڈتوں کو گھر واپس بھیجا جائے گا یا نہیں وغیرہ پر بحث کرتا۔ افسوس میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ میں بچپن ہی سے ناستک رہا ہوں، نہ مندر جاتا ہوں، نہ پوجا پاٹ کرتا ہوں اور نہ ہی آشرم کا سہارا لیتا ہوں۔ میں مذہبی ٹی وی چینلوں پر گھنٹوں ان پڑھ مذہبی رہنماؤں کے خطبات بھی نہیں سن سکتا کہ زندگی بھر چوری چکاری کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا بھی نہیں ہے۔ مندر جانے اور وہاں بتیانے میں ایک دو گھنٹے تو نکل ہی جاتے ہیں یا پھر گھر ہی میں پوجا پاٹ اور بھجن کیرتن میں دن کے کئی پہر کافور کی مانند اڑ جاتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔

لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ بڑھاپے میں آدمی کو فعال اور مستعد رہنا چاہیے۔ صبح سویرے لمبے لمبے سیر کرنے چاہئیں۔ ڈاکٹر تو مارننگ واک کے بارے میں کہتے کہتے تھک گئے۔ مگر میں ہوں کہ اپنے

روزمرہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ رات کو دو ڈھائی بجے تک مطالعہ کرنے کی عادت نہیں چھوٹتی۔ تب تک نیند بھی نہیں آتی۔ کئی بار بہت کوشش کی لیکن آنکھوں کے پپوٹے بند ہی نہیں ہوتے۔ جبراً لیٹ بھی جاؤں تو ماضی کے کواڑوں پر دستک دیتا رہتا ہوں۔ زندگی ایسی ہوتی تو کیا ہوتا؟ زندگی ویسی ہوتی تو کیا ہوتا؟ گھر میں سب لوگ سوئے پڑے ہوتے ہیں۔ اکیلا میں اپنے ماضی سے جوجھتا رہتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں، پہلے سال ہی طلاق دی ہوتی تو شاید ساری زندگی اجیرن نہ ہو جاتی، پھر دوسرے پل سوچتا ہوں کیا معلوم دوسری کیسی مل جاتی؟ کبھی سوچتا ہوں کہ بیوی کو ان پڑھ رہنے دیا ہوتا تو شاید یہ حالت نہ ہو جاتی، پھر سوچتا ہوں کیا ان پڑھ بیویاں جھگڑالو نہیں ہوتیں اور ان کے شوہر خستہ حال، ناامید اور شکست خوردہ نہیں ہوتے؟ کبھی من میں سوال اٹھتا ہے کہ میں بھی تو اپنی بیوی کے ساتھ بے وفائی کر کے دوسری عورتوں کے ساتھ فلرٹ کرتا رہا، پھر درون سے آواز آتی ہے کہ بیوی نے ساتھ دیا ہوتا تو شاید میں ان بھول بھلیوں میں داخل ہی نہ ہوتا۔ کون جانے پھر کیا ہوتا.........؟ یہ سب خیالی پلاؤ پکانے والی باتیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اکیلا ہی دنیا میں آیا ہوں اور اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا لڑکا میری لاش کو بغیر کسی پوجا پاٹ کے برقی بھٹی میں ڈال کر آگ کی نذر کر دے یا پھر لاش کو ریسرچ کی خاطر کسی میڈیکل کالج کے سپرد کر دے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس روز میری ایذا رساں مطلقہ بیوی روتی چلاتی اور سینہ کوٹتی چلی آئے گی اور کوئی اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرے گا کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ رہی ہی کتنے سال کہ اب یہ ناٹک کر رہی ہو؟ کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ تم نے زندگی میں اپنے شوہر کی قمیص کے بٹن کتنی بار ٹانکے ہیں؟ کیا تمھیں اس بات کا علم ہے کہ اس کو کون کون سی بیماری لگی ہے، کب اور کہاں پر؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس کا پہلا ہارٹ اٹیک کب اور کہاں ہوا؟ مگر وہ ان سب چیزوں سے بے تعلق مگر مچھ کے آنسو بہاتی رہے گی اور مجھے دل ہی دل میں بددعائیں دے گی کہ ”تم ابھی مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے، میں تو چاہتی تھی کہ تم ابھی اور جیو اور پستے رہو اس دنیا کی چکی میں تا کہ مجھے تشفی مل جاتی۔“ یہی حال شاید میرے چھوٹے بیٹے اور بہو کا بھی ہوگا جنھوں نے ایک سال پہلے مجھ سے سارے رشتے ناتے توڑ دیے۔ وہ بھی شاید لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے آئیں گے، چند گھڑیالی آنسو بہائیں گے اور پھر واپس اپنی بلوریں ایوانوں میں کھو جائیں گے جہاں وہ صبح و شام ٹاٹا برلا بننے کے خواب دیکھنے میں محو رہتے ہیں۔

ہوسکتا ہے ونیت نے میرے املاک پر بھی نظر جمائی ہو مگر اس جائیداد کا کیا ہوگا جو اس نے ماں سے وراثت میں اکیلے ہی ہڑپ لی اور اپنے بڑے بھائی کو خبر تک نہ کی۔ خیر یہ مسئلے وہ خود ہی آپس میں نبٹائیں گے۔

زندگی بھر مجھے اپنی رہائش کے بارے میں بہت مغزماری کرنا پڑی۔ سرینگر کا آبائی مکان بہن کو تحفتاً دیا۔ اس نے سرینگر ہی میں شادی کر لی۔ باغ مہتاب میں خود بنوایا ہوا مکان آتنک واد کے سبب مولیوں کے بھاؤ فروخت کرنا پڑا کیونکہ وادی میں دہشت گردوں نے فرمان جاری کیا تھا کہ کسی پنڈت کا مکان نہ خریدا جائے۔ اُس مکان میں پاس پڑوسیوں نے سکول کھولا تھا اس لیے مجھے پہلے تو وہ خالی کروانا پڑا اور پھر چھ لاکھ میں بیچنا پڑا جب کہ اس میں دس سال پہلے چھ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی خرچ ہوئے تھے۔ وہی روپیہ میں نے پھر جموں میں مکان بنانے کی خاطر خرچ کر لیا۔ وہاں پر یک منزلہ مکان اس وقت تعمیر کیا جب میں جموں و کشمیر میں پی ایم جی تھا۔ ڈیزائن میں نے خود ہی بنایا تھا۔ بہت ہی خوبصورت مکان تھا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ سبکدوشی کے بعد اس مکان کو کس لیے رکھوں؟ لڑکے دونوں باہر اقامت پذیر تھے، بیوی میرے بجائے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، اس لیے مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑا، جموں کا مکان بھی فروخت کرنا پڑا اور بڑے لڑکے کے ساتھ غازی آباد میں رہنا پڑا جہاں ریٹائرمنٹ کے ترت بعد میں نے وسندھرا میں ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا جموں و کشمیر کے ساتھ آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ بقول جلیل مانک پوری:

ہوئی مدت کہ چمن چھوٹ گیا
اب ہمیں کیا جو بہار آئی ہے

وسندھرا میں ادب کی طرف کافی دھیان دیا۔ بچوں نے ریٹائرمنٹ پر ٹی وی اور لیپ ٹاپ تحفے میں دیے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر کمپیوٹر کمپوزنگ سیکھ لی اور اس کے بعد خود ہی اپنی کتابیں کمپوز کرتا رہا۔ چند اکادمیوں نے سیمناروں کے لیے مدعو کیا۔ دو چار نئے دوست بھی مل گئے۔ اس نیٹ ورک کا روح رواں ڈاکٹر ذکی طارق تھا۔ باغپت، اتر پردیش سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ذکی طارق کا تیسرا شعری مجموعہ 'صبح کی دہلیز' ۲۰۱۰ء میں منصۂ شہود پر رونما ہوا۔ اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے 'احساس کی دھوپ' اور 'پلکوں پہ خواب' بالترتیب ۱۹۸۳ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی

ایک نثری کتاب بھی 'قومی ایکتا' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکی ہے۔ اپنے مادرِ وطن میں قومی یکجہتی کو فروغ دینا ان کی زندگی کا نصب العین رہا ہے۔ اب وہ غازی آباد ہی میں رہائش پذیر ہیں۔ ادب ان کو ورثے میں ملا ہے۔ ڈاکٹر طارق کا طبعی میلان شاعری کی طرف رہا اور غزل و نظم ہر دو اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی۔ ان کی وساطت سے گوالیار کے ایک اچھے شاعر محمد قاسم رسا سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی رقم کیے ہیں۔ ان کے علاوہ دہلی کے ایک برگزیدہ صحافی، افسانہ نگار، مضمون نگار اور ناول نگار نند کشور وکرم سے بھی جان پہچان ہوئی۔ ان سے پہلے ہی جموں میں مل چکا تھا مگر یہاں دہلی میں کافی قربت حاصل ہوئی۔ وکرم صاحب نے مجھے تحقیقی کتاب 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' لکھنے میں کافی مدد فرمائی اور ساتھ ہی کتاب کا دیباچہ بھی رقم کیا۔ اردو کا ایسا محب و مخلص خدمت گار میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر ذکی طارق کی بدولت ہی غازی آباد میں آلوک یاتری سے تعارف ہوا جو مقامی طور پر ہر مہینے ادبی محفلوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ میں بھی گاہے گاہے شریک ہو جاتا ہوں۔

ادھر دوسرے بیٹے نے امارات ائیر لائنز کی نوکری چھوڑ کر سپین اور امریکا سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ واپس آ کر وہ ہمارے ساتھ رہنے لگا اور ہندوستان میں نوکری تلاش کرنے لگا۔ ابتدا میں آئی سی آئی پروڈنشل میں چند مہینے کام کیا، پھر ٹاٹا کنسلٹنسی میں نوکری کر لی۔ اس کے بعد گھر ہی میں ہی اپنی ایک کمپنی 'آج کی ڈیلز' شروع کی اور دہلی این سی آر میں آن لائن ڈی ٹی ایچ سپلائی کرنے لگا۔ اس دوران اس کی شادی کی بات چل نکلی۔ وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف امارات ائیر لائنز میں کام کرنے والی اپنی رفیق کار اور گرل فرینڈ، ندھی ورما، سے شادی کرنے پر مصر تھا۔ شادی ہو گئی۔ ہم برات لے کر ممبئی چلے گئے اور وہاں سے بہو لا کر واپس آ گئے۔ مگر اس کے والدین سے پہلے ہی دن سے کچھ معاملہ نہیں جما۔ اس کے علاوہ چونکہ بہو اور ساس کے بیچ دبئی میں کئی بار جھگڑے ہوئے تھے اس لیے ان کی بھی آپس میں نہیں بنی۔ میں نے سوچا کہ بیٹے کو ہی ممبئی بھیج دوں اور وہ وہاں پر اپنی بزنس شروع کر کے اپنی بیوی کے ساتھ آرام سے رہ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ممبئی ہندوستان کا تجارتی دارالخلافہ ہے اس لیے وہاں

دہلی کے مقابلے میں بزنس کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ اس طرح بیٹے نے اپنا ہیڈ کوارٹر ممبئی شفٹ کر لیا جہاں ویڈیوکون ڈی ٹی ایچ کا وہ چینل پارٹنر بن گیا اور اس نے ویڈیوکون کے لیے ملاڈ میں ایک بڑا کال سنٹر کھول دیا جہاں سے آن لائن ڈی ٹی ایچ کا سارا کام ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے سرمایہ ماں سپلائی کرتی رہی اور پھر وہ بذاتِ خود اس کام کے ساتھ جڑ گئی اور ممبئی میں رہنے لگی۔ ہم پھر سے جدا ہو گئے اور ہمارے دوبارہ مل جل کر رہنے کے خواب پھر منتشر ہو گئے۔ ماں نے سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنا سرمایہ لگا کر ملاڈ ممبئی میں ایک فلیٹ بھی خرید لیا۔ وہاں پر اس کی بہو کے ساتھ پھر سے ان بن ہونے لگی اور اس طرح بہو اس گھر میں جانے سے کترانے لگی۔ وہ اپنا نوزائیدہ بیٹا لے کر واپس دبئی نوکری کرنے چلی گئی اور اس کے پیچھے پیچھے اس کا شوہر بھی سب کچھ ماں کے حوالے کر کے دبئی چلا گیا اور وہاں ٹراول اور ٹورِزم سے متعلق کچھ آن لائن تجارت شروع کی۔ تاہم ممبئی میں اپنی ماں کے ساتھ اس کا رابطہ بدستور قائم ہے اور اس کی نظریں ملاڈ کے فلیٹ پر جمی ہیں۔ بقول مرزا غالب:

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

چار سال پہلے شوراتری کے موقع پر بینا دہلی چلی آئیں اور حسب روایت شوراتری کی پوجا کا انتظام کرنے لگی۔ گھر میں کسی نے کچھ نہیں کہا، وہ اکیلی ہی سب کام کرنے لگی کہ مایوس ہو کر اپنی بڑی بہو پر برس پڑی۔ ممکن تھا کہ بڑی بہو، جیوتی، وہیں پر ڈھیر ہو جاتی۔ بینا کے لہجے کی گھن گرج کو دیکھ کر مجھے مداخلت کرنا پڑی اور اس کو اعلانیہ کہنا پڑا کہ ابھی تک یہ تماشے میں بچوں کی خاطر برداشت کرتا رہا ہوں مگر اب اور برداشت کرنا مشکل ہے۔ یوں بھی عدالت نے ہمارے طلاق کی منظوری کئی سال پہلے دی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنا سامان اٹھا کر ممبئی چلی جاؤ۔ خیر اس نے چپ چاپ اس روز پوجا پاٹ مکمل کیا اور تین دن انتظار کرنے کے بغیر اسی روز سارا بچھایا ہوا سامان یکجا کر لیا اور دوسرے روز واپس ممبئی چلی گئی۔ مگر مکان پر اپنا قبضہ بدستور رکھنے کے لیے اپنا ذاتی سامان سٹور روم ہی میں رکھا ہے۔ اس طرح میری ازدواجی زندگی کا 'دی اینڈ' ہو گیا۔

اب صرف زندگی کے دی اینڈ کا انتظار ہے۔

☆☆☆

اسی کتاب سے

☆ اسی دوران ۱۹۹۹ء میں کرگل کی جنگ ہوئی۔ ...جب میں کرگل رفیوجی کیمپ دیکھنے گیا تو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہمارے ڈاکخانے جو اوپر پہاڑیوں پر تھے وہ اپنے اپنے رفیوجی کیمپوں میں عارضی طور پر کام کر رہے تھے اور سبھی ڈاک سیوائیں لوگوں کو مہیا کر رہے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوا اور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ایسا ہی منظر بارہمولہ میں بھی زلزلہ آنے کے بعد کسی اخباری رپورٹر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کی باتصویر رپورٹ انڈین ایکسپریس میں شائع کی تھی۔ (ص ۲۸۴)

☆ گو اس سے پہلے بھی اوٹا کمنڈ کی سیر کی تھی اور جنوبی ہند کی دوشیزاؤں سے واسطہ پڑا تھا مگر اب تو پہلی بار جنوبی ہند کی ہوا میں کھلے طور سانس لینے کا موقع ملا۔ کھوپرے کی خوشبوؤں میں ملفوف وہاں کی حسیناؤں کے متناسب اور لچک دار جسم، گیہواں رنگ، موتیوں کی طرح چمکتے دانت، بالوں سے لٹکتی بیلا اور جوہی کی مالائیں اور بدن کے ہر مسام سے پھوٹتی شہوت انگیز خوشبو کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں حورانِ جنوب کا ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ (ص ۲۰۸)

☆ یہ شاید عشق کی پہلی داستان ہوگی جس میں پہلے بدن ہم کنار ہوئے اور پھر روحیں ہمکلام ہوئیں۔ (ص ۲۶۰)

☆ اس 'یس سر' پر یاد آیا کہ انھوں نے ایک بار گفتگو کے دوران اپنے پیش رو کو نکما اور بے کار کہا جو مجھ سے برداشت نہ ہوا کیونکہ میں نے وید کمار سے کام کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اس لیے ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں نے 'یس سر، یس سر' کیا مگر ان کو احساس ہوا کہ میں ان کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ کہنے لگے "ہر بات پر یس سر کیے جا رہے ہو۔" اب مجھ سے رہا نہ گیا، بولا۔ "سر، ہم بیوروکریٹ بھی رنڈیوں کی طرح ہوتے ہیں، باس کیسا بھی ہو، ہمیں تعریف کرنا ہی پڑتی ہے۔ رنڈیوں کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے اور ہم بیوروکریٹس کی نظر باس کے قلم پر۔" (ص ۲۲۸-۲۲۹)

☆ مجھے ڈائریکٹوریٹ سے حکم ملا کہ میں بغیر کسی ایکسٹرا الاونس کے پوسٹ ماسٹر جنرل کا کام سنبھالوں کیونکہ کشمیر میں کام کرنے کے لیے انھیں کوئی افسر نہیں مل رہا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ جب تک میرے الاونسز میں بڑھوتری نہیں کی جائے گی میں پی ایم جی کا کام نہیں کر سکتا۔ ایسی چٹھی ہندوستانی افسر شاہی کی تاریخ میں شاید ہی کسی نے اس سے قبل لکھی ہو۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خوش ہوتا کہ ایڈیشنل چارج مل رہا ہے، دیکھنے والا کوئی نہیں اور کمائی کے سبھی راستے کھل گئے ہیں۔ ایسے ہنگامی حالات میں بہت طریقوں سے بالائی آمدنی ممکن تھی مگر مجھے نہ کمانا تھا اور نہ کمایا۔ صاف صاف لکھ دیا کہ کسی افسر کو بھیج دو (ص ۲۲۴)

LAUHE HAYAT

(Autobiography)

Author : Deepak Budki

’لوحِ حیات‘ سے چند اقتباسات

☆ جگ موہن اپنی کتاب ’مائی فروزن ٹربیولنس ان کشمیر‘(My Frozen Turbulence in Kashmir) میں رقم طراز ہیں کہ اس ناجائز عسکری پھیلاو کے بارے میں میں نے وقتاً فوقتاً وزیر اعظم ہندوستان، راجیو گاندھی کو ’انتباہی اشارے‘ (The Warning Signals) بھیج دیے۔ میں جگ موہن کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیا ایک ذمہ دار گورنر کا فرض صرف وارننگ سگنل بھیجنے کے ساتھ ختم ہوتا ہے؟ اگر اس کی آنکھوں کے سامنے ملک کی سالمیت کے خلاف کوئی مشکوک کام ہو رہا تھا اور ملک کا وزیر اعظم اس پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا تھا تو اسے فوراً استعفیٰ دینا چاہیے تھا تا کہ سارے پارلیمنٹ میں اس بات پر بحث چھڑ جاتی کہ ریاستِ جموں و کشمیر کے گورنر نے استعفیٰ کیوں دیا؟ اس طرح مرکزی حکومت جلد از جلد اس مسئلے پر کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی اور شاید گربہ کشتن روز اول کے مصداق ملی ٹینسی کو ختم کرنے میں کامیاب ہوتی۔ جگ موہن کوئی بیوروکریٹ تو تھے نہیں کہ ان کو اپنے پنشن اور ترقی کی فکر لاحق تھی۔ (ص ۳۰)

☆ ایک بار یوں ہوا کہ ریاستی سرکار کے ایک نئے صلاح کار نے مجھے محکمے کا سربراہ ہونے کے ناتے اپنے پاس بلایا تا کہ وہ ڈاک خانے کی کارکردگی کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکے اور مجھے اس میں مزید بہتری لانے کے لیے سجھاؤ دے۔ صلاح کار نے ریاست میں بطور آئی اے ایس افسر اپنی پوری زندگی صرف کی تھی۔ جاتے ہی شروع ہو گئے، ڈاک خانے میں سدھار لانے اور ایمانداری سے کام کرنے کے لیے لمبی چوڑی تقریر کی۔ البتہ مجھے اس کی کھوکھلی تقریر ہضم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ انہی سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی ملی بھگت سے جموں و کشمیر کے انتظامیہ میں گھن لگ گئی تھی، صنعت کاری رُک گئی تھی، رشوت خوری، کنبہ پروری، غاصبانہ جاگیرداری، غنڈہ گردی اور بے روزگاری کا غلغلہ تھا، جنگل گنجے ہو چکے تھے اور ماحولیاتی انحطاط وقوع پذیر ہوا تھا۔ جی میں آئی کہ کھری کھری سناؤں مگر پیشہ ورانہ آداب نے روک لیا۔ ہوں ہاں کر کے اس سے رخصت لی۔ (ص ۳۱۵)

☆ حیاتیات میں ایسے طفیلی جراثیم (Parastoids) کے بارے میں پڑھا تھا جو اکثر اپنے میزبان کے لیے مہلک ثابت نہیں ہوتے تا کہ خود ان کو جینے کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اب معاشرے میں بھی ایسے طفیلیوں کی بھرمار ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا رشوت خور افسر بھی کوشش کرتا ہے کہ یہ سسٹم یوں ہی چلتا رہے اور کہیں غبارے کی طرح پھٹ نہ جائے کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ اگر یہ نظام مکمل طور پر ناکام اور ناکارہ ہو گیا تو خود ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اچھا اور سمجھدار طفیلی کرم وہ ہوتا ہے جو اپنے میزبان کو جینے دیتا ہے، اس کا چوب رس اعتدال سے پیتا رہتا ہے اور ’جیو اور جینے دو والا‘ اصول اختیار کرتا ہے۔ (ص ۳۱۵-۶)

ISBN 978-93-88356-99-2

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

978-93-88356-99-2
www.ephbooks.com

LAUHE HAYAT

(Autobiography)

Author : Deepak Budki

’لوحِ حیات‘ سے چند اقتباسات

☆ جگ موہن اپنی کتاب ’مائی فروزن ٹربیولنس ان کشمیر‘ (My Frozen Turbulence in Kashmir) میں رقم طراز ہیں کہ اس ناجائز عسکری پھیلاو کے بارے میں میں نے وقتاً فوقتاً وزیر اعظم ہندوستان، راجیو گاندھی کو ’انتباہی اشارے‘ (The Warning Signals) بھیج دیے۔ میں جگ موہن کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیا ایک ذمہ دار گورنر کا فرض صرف وارننگ سگنل بھیجنے کے ساتھ ختم ہوتا ہے؟ اگر اس کی آنکھوں کے سامنے ملک کی سالمیت کے خلاف کوئی مشکوک کام ہو رہا تھا اور ملک کا وزیر اعظم اس پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا تھا تو اسے فوراً استعفیٰ دینا چاہیے تھا تا کہ سارے پارلیمنٹ میں اس بات پر بحث چھڑ جاتی کہ ریاستِ جموں و کشمیر کے گورنر نے استعفیٰ کیوں دیا؟ اس طرح مرکزی حکومت جلد از جلد اس مسئلے پر کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی اور شاید گربہ کشتن روزِ اول کے مصداق ملی ٹینسی کو ختم کرنے میں کامیاب ہوتی۔ جگ موہن کوئی بیوروکریٹ تو تھے نہیں کہ ان کو اپنے پنشن اور ترقی کی فکر لاحق تھی۔ (ص ۳۰)

☆ ایک بار یوں ہوا کہ ریاستی سرکار کے ایک نئے صلاح کار نے مجھے محکمے کا سربراہ ہونے کے ناتے اپنے پاس بلایا تا کہ وہ ڈاک خانے کی کارکردگی کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکے اور مجھے اس میں مزید بہتری لانے کے لیے سجھاؤ دے۔ صلاح کار نے ریاست میں بطور آئی اے ایس افسر اپنی پوری زندگی صرف کی تھی۔ جاتے ہی شروع ہو گئے، ڈاک خانے میں سدھار لانے اور ایمانداری سے کام کرنے کے لیے لمبی چوڑی تقریر کی۔ البتہ مجھے اس کی کھوکھلی تقریر ہضم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ انہی سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی ملی بھگت سے جموں و کشمیر کے انتظامیہ میں گھن لگ گئی تھی، صنعت کاری رُک گئی تھی، رشوت خوری، کنبہ پروری، غاصبانہ جاگیرداری، غنڈہ گردی اور بے روزگاری کا غلغلہ تھا، جنگل گنجے ہو چکے تھے اور ماحولیاتی انحطاط وقوع پذیر ہوا تھا۔ جی میں آئی کہ کھری کھری سناؤں مگر پیشہ ورانہ آداب نے روک لیا۔ ہوں ہاں کر کے اس سے رخصت لی۔ (ص ۳۱۵)

☆ حیاتیات میں ایسے طفیلی جراثیم (Parastoids) کے بارے میں پڑھا تھا جو اکثر اپنے میزبان کے لیے مہلک ثابت نہیں ہوتے تا کہ خود ان کو جینے کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اب معاشرے میں بھی ایسے طفیلیوں کی بھرمار ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا رشوت خور افسر بھی کوشش کرتا ہے کہ یہ سسٹم یوں ہی چلتا رہے اور کہیں غبارے کی طرح پھٹ نہ جائے کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ اگر یہ نظام مکمل طور پر ناکام اور ناکارہ ہو گیا تو خود ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اچھا اور سمجھدار طفیلی کرم وہ ہوتا ہے جو اپنے میزبان کو جینے دیتا ہے، اس کا چوب رس اعتدال سے پیتا رہتا ہے اور ’جیو اور جینے دو والا‘ اصول اختیار کرتا ہے۔ (ص ۳۱۵-۶)

ISBN 978-93-88356-99-2

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

978-93-88356-99-2
www.ephbooks.com